

پیغمبر اسلام ﷺ اور فصاحت و بلاغت

فصاحت و بلاغتِ نبوی کے حوالے سے ایک جامع اور وقیع کتاب

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات

Maktaba Tul Ishaat

تمام فنون کے کتب ہمارے ویب سائٹ اور پلے سٹور سے فری ڈاون لوڈ کریں۔ ہم روزانہ کی بنیاد پر اس میں مزید نئے کتب شامل کر رہے ہیں نئے شامل شدہ کتب لیے روزانہ ہمارے پلے سٹور اور ویب سائٹ کو باقاعدگی سے چیک کیا کریں۔

اپنی کتاب کو ہمارے ویب سائٹ پر شائع کرنے کے لیے رابطہ کریں

تفاسیر	خطبات	منطق
احادیث	سیرت	معانی
فقہ	تاریخ	تصوف
سوانح حیات	صرف	تقابل ادیان
درس نظامی	نحو	تجوید
لغت	فلسفہ	نعت
فتاوی	حکمت	تراجم
اصلاحی	بلاغت	تبلیغ ودعوت
آڈیو دروس	مناظرے	تمام فنون

maktaba.tul.ishaatofficial@gmail.com

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
اور
فصاحت و بلاغت

فصاحت و بلاغت نبوی ﷺ کے حوالے سے ایک جامع اور وقیع کتاب

حکیم محمود احمد ظفر

نشریات
۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۴۵۸۹۴۱۹۔۰۳۲۱

۲۰۱۱ء

نام کتاب : پیغمبر اسلام ﷺ اور فصاحت و بلاغت
مصنف : حکیم محمود احمد ظفر
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884

فضلی بک
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

انتساب

اپنی پیاری نواسی

ڈاکٹر عائشہ ادریس (ایم بی بی ایس)

کے نام

جو اپنے انمٹ نقوش چھوڑ کے

۱۷/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ہم سے ہمیشہ

کے لیے جدا ہو گئی

اللھم اغفرلھا، وارحمھا، وعافھا واعف عنھا
وادخلھا الجنة الفردوس بحرمة النبی الکریم علیه
الصلوٰة والتسلیم یا رب العالمین یا اکرم الاکرمین

ترتیب

تقدیم

سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرۃ طیبہ پر بہت کچھ لکھا گیا، ہر زمانے میں لکھا گیا اور ہر زبان میں لکھا گیا اور ہر اعتبار سے لکھا گیا۔ قرآن حکیم نے رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے جس کی اتباع واطاعت اُمت کی دنیا کی فوز وفلاح اور آخرت میں نجات کے لیے ضروری ہے۔ رسول جو کچھ بھی کرے وہ اس کی اُمت کے لیے سنت قرار دے دیا جاتا ہے۔۔ آپؐ کی زندگی کے ہر گوشہ پر لوگوں نے اپنی تحقیق کی پوری طاقت صرف کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ایک بحرِ بے کراں ہے جس کی مختلف جدولیں اور نہریں ہیں جن سے ہر گوشۂ زندگی کے لوگ اپنی راہیں متعین کرتے ہیں۔ چودہ سو سال سے لوگ کمالاتِ نبویؐ کو موضوعِ سخن بنا کر ان کی زندگی کے مختلف کمالات پر اپنے قلم کی جولانیاں دکھا رہے ہیں لیکن کمالات نبویؐ کی کوئی انتہا نہیں اور قلم کو ان کمالات کا احاطہ کرنے کی تاب نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا یہ گوشہ کہ آپؐ فصاحت وبلاغت کا منبع تھے، اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔ عربی میں بھی اور اردو میں بھی اور دوسری کئی زبانوں میں بھی لیکن نبوت کے اس کمال کا بھی احاطہ نہیں ہو سکا، جن لوگوں نے سرکار دو عالم ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ خود فصیح وبلیغ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کی فصاحت وبلاغت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ فصاحت وبلاغت کو آپ ﷺ کی لونڈی سمجھتے تھے۔ جس کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''جوامع الکلم'' عطا فرمائے اس کے سامنے فصحائے عرب کیا حیثیت رکھتے تھے؟ چنانچہ آپ ﷺ کے ایک صحابی سیدنا ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں:

نبی کان یجلو الشك عنا
لما یوحی الیہ وما یقول

فلم تر مثله في الناس حيا
وليس له من الموتى عديل

یعنی آپ ایک ایسے نبیؐ تھے جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی اور اپنے جوامع الکلم سے ہمارے دلوں کے شکوک وارتیاب کو زائل کر دیتے تھے۔ نہ زندہ انسانوں میں ہمیں ان کی کوئی نظیر اور مثل نظر آئی اور نہ گزرے ہوئے لوگوں میں ان کا ہمسر تھا۔

اسی چیز کو اردو کے ایک شاعر نے یوں کہا ہے ؏

تیرے آگے سب ہیں دبے لچے فصحاء عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

نطق و بیان ایک عطیہ خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ کی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o﴾
(الرحمٰن ۵۵:۱۔۴)

”رحمٰن نے (اپنے رسول ﷺ کو) قرآن کی تعلیم دی اور انسان (کامل) کو پیدا کیا اور اس کو (ہر چیز کے) بیان کی تعلیم دی۔“

بیان سے مراد یہاں نطق و گویائی ہے۔ (ابن کثیر: ۴/۲۷۰) اگر انسان سے تمام انسان مراد لیے جائیں تب بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی نعمت بیان کے باعث اس نے تمام مخلوق پر فوقیت حاصل کی اور اشرف المخلوقات شمار ہوا۔ اس نطق و بیان کی عظیم نعمت کی تکمیل کے لیے قرطاس وقلم کی ضرورت تھی۔ اس لیے سرکار دو عالم، افصح العرب ﷺ پر نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی میں قلم کا ذکر فرمایا جس سے نطق و بیان کے ساتھ قلم وقرطاس کی عظمت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہوا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ o الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o﴾ (العلق ۹۶:۱۔۵)

”پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، اس نے انسانوں کو ایک لوتھڑے

سے پیدا کیا، پڑھ کہ تیرا رب سب سے زیادہ بزرگی والا ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

معلوم ہوا کہ علم کے حصول میں دو چیزوں کو زیادہ دخل ہے ایک زبان کو دوسرا قلم کو، زبان ایک ایسا آلہ ہے جس سے بیان کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے، وہ ایک ایسا ناطق ہے جس کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے، ایک ایسا سفارش کنندہ ہے جس کے باعث حاجت روائی کی جاتی ہے اور اسی سے مختلف اشیاء کا تعارف کرایا جاتا ہے؟ ایک ایسا واعظ ہے جو منکرات کو روکتا اور معروف کا حکم دیتا ہے، انسان کے غموں کو دور کر کے اسے تسلی دیتا ہے، محبت کا بیج بوتا اور نفرت کی بیخ کنی کرتا ہے۔ اس آلہ نطق سے انسان اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کر کے اس کی نعمتوں میں اضافہ کا باعث بن جاتا ہے۔

ویسے تو نطق و بیان میں کمال ہر زبان میں حاصل ہوتا ہے لیکن اس بارے میں عربی زبان کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے کیونکہ عربی زبان کی وسعت ایک بحر بے کراں کی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی لیے امام سیوطی رحمہ اللہ نے "الاتقان" میں لکھا ہے کہ پوری عربی زبان سے آشنائی صرف ایک نبی اور رسول کو ہے، دوسرا انسان اس کی اتھاہ گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا، اسی وجہ سے عربی زبان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((احبوا العرب لثلاث ، لانی عربی ، والقرآن عربی ولسان اهل الجنة عربی .)) (مستدرک حاکم رقم: ۶۹۹۹)

"تین وجوہ کی بنا پر اہل عرب سے محبت کرو، یہ کہ میں عربی ہوں، قرآن عربی میں ہے اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔"

عربی زبان قرآن حکیم کی زبان ہے اور قرآن حکیم نے اس کی صفت "مبین" بیان کی ہے اور "عربی مبین" سے مراد ہے کھول کر بیان کرنے والی زبان۔ عرب کے لوگ اتنے زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انھیں فصاحت و بلاغت من جانب اللہ ملی ہوئی تھی۔ وہ بدیہی اور ارتجالاً بڑے قصائد کہہ لیتے تھے۔ ان کو نہ تو کسی سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ غور و فکر کرنے کی اور نہ مشقت اور استعانت کی۔ انھیں صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی توجہ کلام کی

جانب مبذول کریں۔ جب ان کی توجہ کلام کی طرف مبذول ہوتی ہے تو معانی از خود لشکروں کی صورت میں ان کے قلب پر وارد ہوتے ہیں اور الفاظ خود بخود پھوٹ پڑتے ہیں۔

اس عربی معاشرہ میں سرکار دو عالم ﷺ مبعوث ہوئے۔ اہل عرب کی تمام خصوصیات سرکار دو عالم ﷺ میں از خود موجود تھیں لیکن وحی ربانی کے نزول نے آپ ﷺ کی شخصیت میں وہ عروج پیدا کیا کہ عربی زبان ''عربی مبین'' ہوگئی اور اسے دوسری تمام زبانوں پر ابدی اور دائمی فضیلت اور عظمت حاصل ہوگئی۔ اس وحی ربانی کے باعث ''آپ ؐ میں پختہ انداز، شان فصاحت، حلاوت کلام اور اسلوب کی سلاست کے خصائل پیدا ہوئے غرض کہ کلام کی کوئی ایسی صفت نہ تھی جو آپ ؐ کے کلام میں طبعی طور پر موجود نہ ہو۔ آپ ﷺ نے نہ تو اس کے حصول کے لیے کوئی محنت و مشقت کی تھی اور نہ ہی کوئی ریاضت وغیرہ کی تھی بلکہ آپ ﷺ فطری اور طبعی طور پر ان اوصاف میں کامل پیدا ہوئے تھے۔

(اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ، مصطفیٰ صادق الرافعی: ص ۲۹۷)

یہی مصطفےٰ صادق الرافعی ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں کہ:

''سرکار دو عالم ﷺ قدرتی اور فطری بلکہ طبعی طور پر فصاحت و بلاغت کے ایک بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ عام ادیبوں اور فصیح و بلیغ لوگوں کی طرح آپ ؐ تکلف سے کام نہیں لیتے تھے اور نہ ہی مصنوعی طور پر اسے الفاظ سے مزین کرنے کا قصد فرماتے۔ بلکہ جو کچھ آپ ؐ بیان کرنا چاہتے تھے اُسے بے تکلف بیان کرتے۔'' (ص ۲۸۲)

مختصر یہ کہ آپ ؐ کے کلام میں فصاحت و بلاغت اور بداعت کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ آپ ؐ کے جملے خواہ طویل ہوں یا مختصر ان کی نظیر دوسرے انسانوں کے ہاں موجود نہیں اور نہ ہی کسی اور شخص کا کلام، نبوی ؐ کلام کا حریف اور مثیل ہو سکتا ہے، آپ ﷺ کے کلام کی گوناگوں خوبیوں اور اس کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ نے بڑا نفیس اور عمدہ تجزیہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

''سرکار دو عالم ﷺ فصاحت و زبان اور بلاغت کلام میں ایسے بلند اور ارفع مقام پر فائز تھے جہاں سلاست طبع، فصاحت کاملہ، ایجاز، موزوں الفاظ کا

انتخاب، جزالت کلام، قلت تکلف اور صحت معانی کی ہر خوبی موجود ہوتی تھی۔ پھر سرکار دو عالم ﷺ کو ''جوامع الکلم'' بھی عطا کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو سرزمین عرب کی تمام زبانیں سکھا دی تھیں اور آپ ؐ ہر قوم کے محاورے اور روزمرہ کا استعمال فرماتے تھے حتیٰ کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ سے اس کلام کی شرح دریافت کرنا پڑتی اور آپ ؐ کے ارشاد گرامی کی توضیح وتشریح کے خواستگار ہوتے۔ چنانچہ سیرت اور احادیث نبویہ کی کتابوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کا کلام اس وقت بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا تھا جب آپ ﷺ ذی المشعار ہمدانی، طہفۃ النہدی، قطن بن حارثہ، اشعث بن قیس اور وائل بن حجر الکندی کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے جو حضرموت اور یمن کے رؤساء میں سے تھے۔''

(الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ ۱/۴۴)

ان ساری باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فصاحت و بلاغت نبوت کے مقاصد کا ایک حصہ ہے جیسا کہ کتاب میں بتایا گیا ہے۔ پھر آپ جس قوم میں مبعوث ہوئے اس کے ہاں تو بقول جاحظ ''معیار کمال ہی قوت بیان اور وہی حق لسان تھی۔ (البیان والتبیین ۲/۱۸)

اس فصیح و بلیغ ماحول اور معاشرہ میں آپ ؐ نے اپنی رسالت اور نبوت بلکہ ختم نبوت کا اعلان فرمایا اور ایک علمی کلام قرآن حکیم کی شکل میں ان کے سامنے پیش کیا جس کی ایک سورت کی مثل چودہ صدیوں میں کوئی نہیں لا سکا، نہ کوئی عربی اور نہ کوئی عجمی اور نہ ہی قیامت تک کوئی لا سکے گا کیونکہ معجزہ کہتے ہی اس کو ہیں جس کی مثال کوئی قیامت تک نہ لا سکے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''پیغمبر اسلام اور معجزات'')

قرآن حکیم تو سراسر ایک علمی معجزہ تھا جس کی مثال لانا محال اور ناممکن ہے لیکن خود آپ ؐ کا اپنا کلام بھی آپ ؐ کی نبوت کی بیّن دلیل اور رسالت کی ایک سند ہے۔

کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○﴾ (النجم ۵۳:۳-۴)

یعنی آپ ؐ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے یہ تو سراسر وحی ہے جو آپ ؐ پر کی جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ آپؐ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلتے وہ آپ ﷺ کے نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے القاء کردہ ہوتے تھے۔ جس کو مولانا رومؒ نے یوں ارشاد فرمایا ؏

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یہی وجہ تھی کہ اس فصیح و بلیغ معاشرہ میں آپؐ کے دشمن بھی آپؐ کے کلام کی فصاحت و بلاغت میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں نکال سکے حالانکہ انھوں نے آپؐ کی شخصیت میں عیوب ونقائص نکالنے کے لیے خوردبین لگائی ہوئی تھی اور آپ ﷺ کا ہر چھوٹے سے چھوٹا عیب بھی ان کو بڑا معلوم ہوتا تھا، اگر آپؐ کی ذات گرامی کی ایسی کوئی بات سننے میں یا دیکھنے میں آئی ہوتی تو وہ لوگ اس کو اپنی مجالس میں اچھالتے اور اس کی تشہیر کرتے اور اپنی خلوت گاہوں میں اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتے اور ان کے خطیب اور شعراء جو اس زمانہ میں میڈیا کا کام دیتے تھے اس کا تذکرہ اپنے اشعار اور خطابات میں ضرور کرتے، کیونکہ دنیا جانتی تھی کہ آپؐ کے دشمنوں میں خطیب بھی تھے اور شعراء بھی جو ایسی باتوں کی تشہیر میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں۔

آپؐ کی فصیح اللسانی اور بلاغت کلامی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ ﷺ نے ایک روز بھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا، اس کے باوجود فصاحت و بلاغت کے جملہ اوصاف ومحاسن آپؐ کی فطرت میں نہایت جامعیت اور کمال کے ساتھ نظر آتے ہیں، آپ ﷺ کی عام گفتگو، آپؐ کی خطابت، آپؐ کے خطوط اور آپؐ کی دعاؤں میں وہ بدرجہ کمال پائے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اوصاف کی طرح آپؐ کا یہ وصف بھی عطیۂ الٰہی ہے چنانچہ اس بات کی طرف اشارہ خود سرکار دو عالم ﷺ کے کلام میں ملتا ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ بارگاہ رسالت ﷺ میں عرض کیا:

((لقد طفت فی العرب وسمعت فصحاء هم فما سمعت افصح منك، فمن ادبك؟))

"میں عرب میں بہت گھوما پھرا ہوں اور ان کے بڑے بڑے فصحاء کو سنا اور ملا

ہوں لیکن میں نے آپ ﷺ سے زیادہ اور کسی دوسرے کو فصیح نہیں سنا، پس آپ ﷺ کو کس نے اس کی تعلیم دی؟''

یہ ایک سوال تھا جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا جو اپنے دور جاہلیت سے آپؐ کے دوست چلے آرہے تھے۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((ادبنی ربی ، ونشاء ت فی بنی سعد .))

(تاریخ جرجان ص ۱۸۷، حمزہ بن یوسف جرجانی)

''میرے رب نے مجھے تعلیم دی اور میں نے بنی سعد میں پرورش پائی۔''

ایک اور روایت میں ہے:

((ادبنی ربی فاحسن تادیبی)) (فیض القدیر: ۱/۲۲۵، کشف الخفا: ۱/۷۲)

''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت اچھا ادب سکھایا۔''

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپؐ کی فصیح و بلیغ گفتگو سے متاثر ہو کر حیرانگی کے عالم میں آپ ﷺ سے دریافت کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ!

((مالك افصحنا ولم تخرج من بين اظهرنا .))

آپ ﷺ ہم سے کس طرح زیادہ فصاحت رکھتے ہیں جبکہ آپ ﷺ ہمارے سامنے ہی رہے اور کبھی باہر نہیں گئے۔ (کہ وہاں سے پڑھ کر آئے ہوں)۔

آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

''سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی زبان مٹ چکی تھی سوائے جبریل علیہ السلام میرے پاس لائے تو میں نے اسے یاد کر لیا۔'' (الوفا باحوال المصطفیٰ فیض القدیر: ۵/۸۱)

اس فصاحت و بلاغت کے اثرات قرآن حکیم کی وجہ سے بھی آپؐ کی ذات میں موجود تھے، کیونکہ آپؐ کی فصاحت و بلاغت کا ایک سب سے بڑا سبب قرآن حکیم ہے جو فصاحت و بلاغت کا منبع ہے۔ پھر اس میں تشبیہات و تمثیلات کی باریکیاں اور اجمال و تفصیل کا حیرت انگیز تناسب و توازن ہے، یہ اور دوسری کئی ایک خوبیاں اپنوں کو مسحور اور مقابل کو لاجواب کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسائے قریش راتوں کو اٹھ اٹھ قرآن حکیم کی

تلاوت سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے سنتے۔ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اسی قرآن کو سن کر دامن قرآن میں پناہ لیتا ہے اور اس نے کہا کہ میں نے آپ ﷺ کا کلام سن لیا اگرچہ میں اس کو سننا نہیں چاہتا تھا۔ آپ ﷺ کے کلام میں بڑی دل آویزی اور جاذبیت تھی لہٰذا میں ایک شاعر، دانشور اور مبصر ہونے کے باوجود آپ ﷺ کے کلام سے بہت متاثر ہوا۔ قرآن حکیم خود آپ ﷺ کی اپنی زبان میں آپ ﷺ پر نازل ہوا اور آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((وما یمنعنی وانما انزل القرآن بلسانی ، لسان عربی مبین))

''میری فصاحت و بلاغت میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے جب کہ قرآن حکیم میری زبان یعنی کھلی اور واضح عربی میں نازل ہوا۔'' (الشفاء، قاضی عیاض ۱/۴۷)

چنانچہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے اثرات آپ ﷺ نے قبول کیے اور اس سے مستفید ہو کر آپ ﷺ فصاحت و بلاغت کے اس ارفع مقام پر پہنچے کہ علمائے عرب اور علمائے فصاحت و بلاغت یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ قرآن حکیم ہے جو اللہ کی کتاب ہے اور اس کے بعد سرکار دو عالم ﷺ کا طریقہ اور مقام ہے جس کے آگے سارے فصحائے عرب نہ صرف دبے ہوئے ہیں بلکہ منہ میں زبان تک نہیں کہ کچھ بول سکیں۔

تیسری چیز جس کا تعلق آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت سے ہے، وہ آپ ﷺ کا قبیلۂ قریش سے تعلق ہے۔ قریش عرب کا ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ اس کی فصاحت لسانی اہل عرب کے ہاں مسلم تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا اپنا فرمان ہے:

((انا افصح العرب ، بیدا انی من قریش ونشأت فی بنی سعد .)) (الشفاء:۱/۴۴)

''میں عرب کا سب سے زیادہ فصیح شخص ہوں کیونکہ میں قریش میں پیدا ہوا اور بنو سعد میں میری نشو ونما ہوئی۔''

اسی سلسلہ میں طبرانی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک روز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت پر اظہار حیرت و تعجب کرتے ہوئے اس کی وجہ جاننا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((انا اعرب العرب، ولدتني في قريش، ونشأت في بني سعد، فاني ياتيني اللحق.)) (معجم کبیر:۶/۳۵)

''میں تمام اہل عرب سے واضح گفتگو کرنے والا ہوں، اور میری ولادت قریش میں ہوئی اور میری نشوونما بنوسعد میں ہوئی اس لیے میرے کلام میں نقص کہاں سے آئے؟''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ عطیۂ خداوندی کے علاوہ آپؐ کی فصاحت و بلاغت میں ان دو چیزوں کا بھی دخل ہے: آپ ﷺ کا قبیلہ قریش میں سے ہونا اور دوسرے آپؐ کا قبیلہ بنوسعد میں نشوونما پانا۔ گویا سرکار دو عالم ﷺ کی فصاحت و بلاغت کے عناصر ترکیبی میں سے ایک اہم عنصر آپ ﷺ کا قبیلہ بنوسعد میں نشوونما پانا بھی ہے۔ قبیلہ بنوسعد بن بکر کی زبان دانی اپنی فصاحت و بلاغت کے حوالے سے بہت مشہور تھی۔ روسائے قریش اپنے بچوں کی نشوونما اور تربیت کے لیے انھیں بنوسعد ہی میں بھیجتے تھے تاکہ بچے صاف ستھرے اور فصاحت و بلاغت والے ماحول میں رہ کر خالص اور ثقہ زبان سیکھ لیں کیونکہ بنوسعد بنوہوازن کی ایک اہم شاخ تھی اور ان کی جائے سکونت بڑی پرفضا، صاف ستھری اور ان کی زبان بغیر کسی آمیزش کے خالص عربی تھی، اسی وجہ سے آپؐ نہایت فخر سے اپنی زبان کے خالص اور ستھرا ہونے کی وجہ سے، فرمایا کرتے تھے:

((ونشأت في بني سعد)) (معجم کبیر:۶/۳۵)

''اور میں نے بنوسعد میں نشوونما پائی۔''

چنانچہ سیدنا بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بارے میں بڑے واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

((كان رسول الله ﷺ من افصح الناس، كان يتكلم بالكلام لا يدرون ما هو حتى يخبرهم.)) (الوفاء باحوال المصطفی:۲/۴۵۶)

''سرکار دو عالم ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح تھے۔ آپ ﷺ بعض دفعہ ایسی زبان میں کلام فرماتے تھے کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ ﷺ نے کیا فرمایا جب تک کہ آپ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کا مفہوم و مقتضا بتا نہیں دیتے تھے۔''

علماء نے لکھا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کا کلام حکمت و فصاحت سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کے کلام میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوتے تھے گویا آپؐ اپنی گفتگو اور خطابت

میں اختصار سے کام لیتے اور بقول جاحظ دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی قلیل الکلام ہوتے تھے۔ (البیان والتبیین: ۱۱۲/۱) اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ تصنع کو بھی ناپسند فرماتے تھے، غلط قسم کی گفتگو سے بھی آپؐ کو نفرت تھی اور الفاظ کو چبا چبا کر منہ سے نکالنا نہ صرف آپؐ کو ناپسند تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی یہ ناپسند ہے۔ (ترمذی رقم: ۲۸۶۲، ابوداؤد رقم: ۵۰۰۵)

احمقانہ گفتگو سے بھی آپ ﷺ کو نفرت تھی اور ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہ فرمایا بھی کہ "بندے کو زبان کی تیزی سے بڑھ کر اور کوئی بری چیز نہیں دی گئی۔ (تفسیر قرطبی: ۲۸۱/۱۲)

ایک ان پڑھ شخص کے سامنے فلسفیانہ اور نہایت علمی گفتگو کرنا بھی ایک احمقانہ بات ہوتی ہے بلکہ بہترین طریقۂ گفتگو یہ ہے کہ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق اس سے گفتگو کی جائے تاکہ متکلم کی بات مخاطب کے ذہن میں آسکے اور وہ اچھی طرح اس کی بات کو سمجھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جو مثالیں دی ہیں وہ ایسی ہیں جو ہر پڑھے ہوئے اور ان پڑھ کے ذہن میں آتی ہیں۔ اسی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے سرکار دو عالم ﷺ نے لوگوں کے سامنے ایک ایک اصول پیش کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((امرت ان اخاطب الناس علی قدر عقولهم)) (فیض القدیر: ۳۷۸/۳)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے ان عقلوں کے مطابق خطاب کروں۔"

اور آپؐ نے لوگوں کو اس بات سے بھی روکا کہ وہ لوگوں سے الفاظ کو گھما پھرا کر اور متکبرانہ اسلوب اور لہجہ میں گفتگو کریں یا تکلف سے لوگوں سے بات کریں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ افصح الناس تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بیان کا سلیقہ، فطری استعداد، ملکۂ تفہیم اور لطافت سخن عطا فرمائی تھی۔ آپؐ کا کلام تمام محاسن کا مع اور ہر کمزوری سے پاک اور مبرا تھا، آپؐ کی فصاحت وبلاغت کے خصائص غیر متناہی بے حساب تھے کہ علماء کو آپؐ کی بابت کہنا پڑا:

((كلما زدته فكرا زادك معنى وحي القلم.)) (مصطفیٰ الرافعی ۸/۳)

"جس قدر تم سرکار دو عالم ﷺ کے کلام میں غور وفکر کرو گے اسی قدر تم ان میں سے نئے نئے معنی نکلتے پاؤ گے۔"

آپ ﷺ کی گفتگو واضح اور علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی کہ پاس بیٹھنے والا اسے یاد کر لیتا تھا اور کبھی اپنی بات آپ ؐ تین دفعہ دہراتے تھے تا کہ سننے والے کی سمجھ میں بات اچھی طرح آ جائے۔ (ترمذی: رقم ۳۶۵۹، ابوداؤد رقم: ۴۸۳۹) آپ ﷺ کے کلام میں کوئی ابہام اور الجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ گفتگو اور خطاب میں مخاطب کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض اوقات مخاطب کی رعایت سے عرب کے ان لہجوں اور ایسے اسلوب بیان میں بھی گفتگو فرماتے تھے بلکہ بسا اوقات ایسے مخصوص الفاظ بھی استعمال فرماتے تھے جو عام طور پر عربوں میں مروج نہیں تھے، جیسا کہ ابوسلیمان الخطابی نے غریب الحدیث ۱/ ۶۶ میں بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ کی گفتگو میں منطقی ربط اور فکری تسلسل بھی پایا جاتا تھا اور اپنی گفتگو میں مقصد کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بھی فرماتے تھے تا کہ مخاطب کے ذہن میں کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ غرض کہ آپ ؐ کے کلام میں فصاحت و بلاغت کی تمام اقسام موجود ہوتی تھیں، یعنی مجاز بھی تھا، کنایہ بھی تھا اور تشبیہ اور استعارہ بھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود کلام میں اختصار اور ایجاز تھا اور اسی کو حدیث میں ''جوامع الکلم'' کہا گیا ہے یعنی ایسا کلام جس کے الفاظ قلیل لیکن معانی کثیر ہوں۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے ''جوامع الکلم'' کو عطیۂ خداوندی اور فیض ربانی قرار دیا ہے اور آپ ؐ کے خصائص میں سے اس کو شمار کیا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے خود بھی اس کو اپنے چھ خصائص میں سے ایک خصوصیت قرار دیا ہے۔ (مسلم رقم: ۵۲۳) اور ایک روایت یہ فرمایا کہ بعثت بجوامع الکلم ''یعنی میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ ایک اور روایت میں فرمایا:

((اعطیت جوامع الکلم، اختصر لی الحدیث اختصارا.))

(دار قطنی ۴/ ۱۴۴)

''مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے اور میرے لیے گفتگو کو بہت مختصر کر دیا گیا۔''

عام گفتگو اور خطابت کے علاوہ آپ ؐ کی دعائیں بھی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایک بلند مقام کی حامل ہیں جیسا کہ ہم نے کتاب میں اس کو بیان کیا۔

خلاصہ یہ کہ ایک امی اور یتیم جو وادی بے آب وگیاہ میں پیدا ہوا، اور ایک ایسی قوم میں اس کی نشو ونما ہوئی جو نہ صرف جاہل تھی بلکہ اکھڑ بھی تھی اس قوم میں پرورش پا کر اس نے علم

ومعرفت کی وہ شمعیں روشن کیں اور فصاحت و بلاغت کے وہ دریا بہا دیئے جس کی مثال دنیا میں نہ پہلے تھی اور نہ قیامت تک ہوگی۔ جس کی نگاہ اعجاز نے ریگستان عرب کے ذرات کو روشنی کے چراغ بنا دیا اور نہ صرف انسان کے مقدر کو بدل دیا بلکہ تاریخ کا رخ بھی تبدیل کر دیا۔

اس کتاب میں اسی افصح العرب پیغمبر ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی خطابت کے موضوع پر ہر پہلو سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس سے قبل آپ ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مختلف انداز اور مختلف عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے جس کو قارئین کرام نے بہت سراہا ہے۔ آج دنیا کو ضرورت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے بتایا جائے کہ آپ ﷺ کی سیرت زندگی کے ہر پہلو سے کامل اور مکمل تھی۔

اس سے قبل مختلف حضرات نے رسول اللہ ﷺ کی خطابت اور آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت پر ضخیم اور مختصر کتابیں لکھی ہیں حتیٰ کہ ایک ہندو مالک رام نے بھی ''افصح العرب'' کے نام سے آپ ﷺ کی فصاحت پر ایک کتاب لکھی۔ میری یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور میں نے اس کی تالیف میں اکثر و بیشتر انھی کتابوں سے فائدہ اٹھایا جو عربی اور اردو میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ قارئین کرام سے امید ہے کہ اگر ان کو یہ کتاب پسند آئے تو احقر کے لیے دعا فرما دیں کہ قیامت کے روز سرکار دو عالم ﷺ کی شفاعت نصیب ہو جائے۔

(حکیم) محمود احمد ظفر
یکم صفر المظفر ۱۴۳۱ ہجری / ۱۷ جنوری ۲۰۱۰ء
فون نمبر: 0300-6106968

خطابت کی اہمیت

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی انقلاب آیا اس میں خطابت کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قیادت اور خطابت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کیونکہ انقلاب انفرادی ہو یا قوموں کا پہلے بیرونی سطح پر نہیں بلکہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض انقلاب صرف مٹی کے ذروں، اینٹ پتھر کے مکانوں اور انسانوں کے جسموں اور صورتوں کو بدل دیتے ہیں، پھر یہ انقلاب روحوں اور دلوں کی کائنات کو منقلب کر ڈالتے ہیں۔ اس سے کائنات انسانیت کا نقشۂ حیات و ممات بنتا ہے جو اپنے ارتقائی سفر میں اپنی صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ ان سب انقلابات کے پیچھے خطابت کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے گویا ایک خطیب انقلاب کے لیے ایک روح کی حیثیت رکھتا ہے جس سے قوموں کے قلب وذہن میں انقلاب کی لہریں کروٹیں لیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں عقل وشعور کے ساتھ نطق و بیان کی قوت بھی رکھی ہے۔ انھی دونوں قوتوں کے باعث وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ انھی دو قوتوں کو آب وتاب عطا کر کے احسن تقویم کے سزاوار انسان کو رب علم وخبیر نے اپنے علم کی روشنی عطا فرمائی۔ پھر ان صلاحیتوں کے امتزاج سے انسان کو خلافت الٰہی کا تاج فضیلت نصیب ہوا۔ اور آب وآتش اور خاک وخون کا بنا ہوا انسان نورانی اور ناری مخلوق کا مسجود ٹھہرا اور خلافت الٰہی کا مستحق ٹھہرا۔ عقل وشعور کے ذریعے وہ اخذ وتحصیل کے بعد استنباط اور استنتاج کے مراحل سے گزرا لیکن عقل وشعور کے طفیل استنتاج واستنباط کی یہ رفتار نطق وگویائی کے بغیر تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ نطق و بیان قدرت خداوندی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلرَّحْمٰنُo عَلَّمَ الْقُرْاٰنَo خَلَقَ الْاِنْسَانَo عَلَّمَهُ الْبَیَانَo﴾ (الرحمٰن:۱-۴)

”رحمٰن نے (اپنے رسول ﷺ کو) قرآن کی تعلیم دی اور انسان (کامل) کو

پیدا کیا اور اس کو (ہر چیز کے) بیان کی تعلیم دی۔‘‘

نطق و بیان کی اس نعمت عظمیٰ کی تکمیل قلم وقرطاس کی محتاج تھی اور علم وحکمت کی یہ سعادت دراصل عقل وشعور کی تربیت اور نطق و بیان کو رعنائی عطا کرنے کے لیے تھے۔نطق و بیان کی اس صفت نے تاریخ انسانی میں محیرّ العقول اور معجزنما کارنامے انجام دینا تھے اور تاریخ کے رخ بدلنے تھے اور نطق و بیان کی اس اس خطیبانہ فصاحت و بلاغت سے وہ کام انجام پانے تھے جو شمشیر وسنان اور توپ وتفنگ سے بھی انجام نہیں دیئے جا سکتے تھے۔نطق وبیان کی اس عظیم نعمت میں یہ حکمت بھی پنہاں تھی کہ زبان وقلم کے جہاد سے دنیا میں بھوک اور غلامی کا خاتمہ ہونا تھا۔نطق وزبان کے زیور سے مزین ہونے اور سلاح بلاغت سے آراستہ ہونے کے بعد انسان کو تشکر و امتنان کے طور پر مشکل ترین کام انجام دینا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ سے روٹھا ہوا بندہ جو پوجا کے لیے ہر روز ایک نیا خدا بنا لیتا ہے، اپنے جھوٹے خداؤں کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہو اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے بندے صرف اُسی کے بندے بن کر سکھ چین اور اطمینان و سکون کی زندگی بسر کریں۔ یہ کام نطق لسانی اور خطیبانہ شعلہ بیانی کا محتاج تھا۔

انسانیت کی تاریخ پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں انسان کی صرف دو مجبوریاں رہی ہیں۔ ایک عزت وسکون کی آزاد زندگی اور دوسری زندگی اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے حسب ضرورت سامان خورد ونوش۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانوں کو ان دونوں مجبوریوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے جب بھی کوئی تحریک اٹھی تو اس کا آغاز ہمیشہ زبان کی شعلہ بیانیوں اور خطاب کی ولولہ انگیزیوں سے ہوا۔ آج بھی ہر ملک میں انسانوں کو غلامی کی قید وبند سے رہائی اور بھوکوں اور غریبوں کو عزت کے ساتھ ان کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے زبان اور قلم کا جہاد ہی کام آ رہا ہے۔ چنانچہ خطابت نے انسانی تاریخ کا رخ موڑنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے بھی تاریخ انسانی کے صفحات پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

نطق و بیان قرآن حکیم کی نظر میں:

قرآن حکیم سرکار دو عالم ﷺ کو ایک علمی معجزہ کے طور پر عطا کیا گیا جو سیدنا

آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ اس کتاب الٰہی کا اسلوب بیان اور معیار فصاحت و بلاغت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری انسانیت کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس کے اسلوب بیان کے لفظی اور معنوی محاسن جہاں ذوق سلیم کی تسکین وراحت کا سامان اور قلب وجگر کے لیے پیغام حیات ہیں وہاں انسانیت کا قافلۂ علم وتہذیب بھی نطق و بیان کا مرہون منت ہے۔ قرآن حکیم میں ''ذکر و بیان'' کے الفاظ اس کثرت سے دہرائے گئے ہیں کہ فصاحت و بلاغت کی اہمیت کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ جس قوم میں سرکار دو عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا اس کا سرمایۂ زیست اور طرۂ امتیاز ہی خطیبانہ فصاحت و بلاغت اور شعلہ بیانی تھی۔ اس قوم کا ایک ایک فرد اپنی فصاحت و بلاغت اور شعلہ بیانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے قرآن حکیم میں بھی وحی مقدس کے ذریعے انسانوں کے لیے احکام شریعت کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے بلکہ قرآن حکیم کو کتاب مبین کہا گیا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (البقرۃ ۲:۲۶۶)

''اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیات کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۝﴾ (ال عمران ۳:۱۳۸)

''یعنی اللہ کی یہ کتاب انسانیت کے لیے ایک بیان ہے اور جو متقی اور اہل تقویٰ ہیں ان کے لیے وعظ وہدایت ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے تمام رسول یہی فرماتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے:

﴿وَ مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾ (یٰس ۳۶:۱۷)

''اور ہمارا فرض منصبی پیغام کو واضح کر کے پہنچا دینا ہے۔''

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک اولوالعزم رسول ایسا بھی گزرا ہے جس کو بیان اور بلاغت پر مکمل قدرت نہ تھی۔ انھیں اللہ کے حضور دعا کرنا پڑی کہ عطائے نبوت کے ساتھ ساتھ انھیں زبان کی فصاحت و بلاغت کی نعمت بھی عطا فرما دے اور شرح

صدر بھی فرما دے تاکہ لوگ ان کی بات سمجھ سکیں اور میرے بھائی کو بھی میرے ساتھ نبوت سے نواز دے کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ان کی اس بات کو یوں نقل فرمایا ہے:

﴿وَيَضِيقُ صَدْرِىْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هَارُوْنَ٥﴾

(الشعراء ۲۶:۱۳)

یعنی سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کیا: ''میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان میں روانی اور سلاست نہیں، اس لیے ہارون (علیہ السلام) کو بھی منصب نبوت عطا فرما دے۔

ایک اور مقام پر حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کی اس عرض داشت کو ان الفاظ میں نقل فرمایا:

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ٥ وَيَسِّرْ لِىْٓ اَمْرِىْ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ٥ يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ٥﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۲۵ تا ۲۸)

''اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے، میرا کام (جو میرے ذمے لگایا گیا ہے اس کو) آسان فرما دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب خلعت نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تو انھوں نے بارگاہ ربوبیت میں جو فوری درخواست کی اس کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَاَخِىْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدًا يُّصَدِّقُنِىْٓ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ٥﴾ (القصص ۲۸:۳۴)

''میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، پس اسے میرا مددگار بنا کر بھیجیں تاکہ میری تصدیق کرے، مجھے ڈر ہے کہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔''

خطابت کی اس اہمیت کا اقرار انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کو بھی تھا۔ چنانچہ فرعون موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتا ہے:

﴿اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ٥﴾

(الزخرف ۴۳:۵۲)

"کیا میں اس شخص سے بہتر نہیں ہوں جس کی کوئی عزت نہیں اور وہ صاف بات بھی نہیں کرسکتا۔"

سیدنا داؤد علیہ السلام کے بارے میں حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں:

﴿وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص ۳۸:۲۰)

"اور ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن خطاب سے نوازا۔"

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((كان شعيب خطيب الانبياء)) (البیان: ۱/ ۱۷)

"شعیب علیہ السلام خطیب الانبیاء تھے۔"

قرآن حکیم نے ایک مقام پر ہر رسولؑ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیان اور خطابت کی قدرت سے نوازا تاکہ وہ اپنی امت میں نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کا پیغام بیان کرتے رہیں کیونکہ یہ ضروری ہے کہ لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں جس کو وہ روزمرہ اپنے ہاں استعمال کرتے ہیں اور اس کے زیروبم اور نشیب و فراز کو بخوبی سمجھتے ہیں، پیغام الٰہی کو بیان کریں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾

"یعنی ہم نے کوئی بھی نبی ایسا نہیں بھیجا جو اپنی قوم کی زبان میں بات نہ کرتا ہو تاکہ وہ ہمارا پیغام اسے کھول کر بیان کردے۔" (ابراہیم ۱۴:۴)

اس آیت کے ضمن میں جاحظ نے لکھا ہے کہ:

"اس میں حکمت یہ تھی کہ کسی بات کا انحصار اور دارومدار بیان، توضیح اور افہام و تفہیم پر ہوتا ہے۔ جس قدر بھی زبان طلاقت اور بلاغت پر قادر ہوگی اسی قدر زیادہ قابل تعریف ہوگی جس طرح کہ کسی انسان کا دل جس قدر زیادہ روشن اور منور ہوگا اسی قدر وہ زیادہ قابل ستائش ہوگا۔ جو شخص تجھے کوئی بات سمجھاتا ہے یا جس کو تو سمجھائے دونوں قلب و لسان کی روشنی کی فضیلت میں برابر کے شریک ہیں، البتہ سمجھانے والا سمجھنے والے سے افضل ہوتا ہے۔ معلم اور متعلم کے بارے

میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔'' (البیان والتبیین: ۱۱/۱)

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور رسول کو استدلال اور مجادلہ حکیمانہ کی صلاحیت سے بھی نوازا تھا کیونکہ بعض دفعہ منکرین نبوت کی تفہیم کے لیے حجت و دلیل پیش کرنے کے علاوہ مناظرہ بھی کرنا پڑتا تھا جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنی قوم اور نمرود سے احتجاج واستدلال کا موقع پیش آیا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کو بیان و بلاغت اور نطق وفصاحت کی بلندیاں عطا ہوئی تھیں جن کے بعد بلندی کی کوئی اور حد باقی نہیں رہتی۔ آپ ؐ کو تبلیغ کا حکم ہوا: "بلغ ما انزل الیك" اور اپنے مخاطبین کے سامنے "قول بلیغ" ارشاد فرمانے کی ہدایت ہوئی بلکہ ایک مقام پر تو یوں فرمایا گیا:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل ۱۶:۴۴)

''اور ہم نے آپ ؐ کی طرف ذکر (قرآن حکیم) اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ ان کی طرف یہ نازل کیا گیا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کی حکمت اور ضرورت بیان فرمائی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ صرف کتاب نازل فرما دیتا لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری نہ ہوتی۔ کوئی انسان یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کتاب کے مضامین ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ؐ کو مبعوث فرمایا کہ وہ اس کتاب کے مضامین کی وضاحت کے ساتھ تعلیم دے اور ان کو اس کتاب کے مضامین سمجھائے۔ جس جگہ ان کو کوئی شک اور اشکال ہو تو وہ ان کے اس شک اور اشکال کو دور کرے اور جس آیت پر کوئی اعتراض وارد ہو وہ اس اعتراض کا جواب دے۔ فصاحت وطلاقت کے کمال سے محرومی ایک بہت بڑا عیب ہے، چنانچہ اس محرومی کا احساس دلاتے ہوئے جاحظ نے لکھا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے لسانی نقص اور خراب انداز بیان کی مثال پیش کرنا چاہی تو ایسے لوگوں کو عورتوں اور بچوں سے تشبیہ دی، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (الزخرف ۴۳:۱۸) ''یعنی کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور جو بحث وجدال میں بات کو واضح کر سکنے

والے بیان سے بھی قاصر ہو۔''

قرآن حکیم کی مختلف آیات پر گہری نظر ڈالنے کا یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فصاحت اور طلاقت لسانی اور منطق وگویائی کی قوت ایک ایسا ربانی عطیہ اور احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو ارزانی فرمایا ہے۔ اسی سے انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ عطیہ ارزانی فرمایا ہے وہ خطیب اور مقرر ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے ابنائے جنس میں عزت واحترام اور قدر ومنزلت کے علاوہ معجز بیانی اور شعلہ نوائی اور طلاقت لسانی سے کام لے کر تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے اور تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جہاں شمشیر وسنان، تیغ وتفنگ اور دیگر مادی وسائل کام نہ آسکیں وہاں ایک خطیبِ شعلہ نوا اور مقرر فصیح اللسان کی شعلہ بیانی کام کر جاتی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہتھیاروں سے بیزار اور زخموں سے نڈھال انسانیت سپہ سالاروں اور فوجی جرنیلوں کے بجائے آتش بیان اور شعلہ نوا زعماء وقائدین کے پیچھے لگ جاتی ہے کیونکہ قیادت کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زبان اور خطابت سے انسانوں کے جذبات اور دھڑکتے دلوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ خطیب ہی ہیں جو انسانیت کے گم کردہ راہ قافلے کے میر کارواں بن جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل کارواں ان قائدین کی سحر انگیز آواز پر لبیک کہتے ہوئے پرخطر اور پر پیچ راہوں پر بھی بے خطر چل پڑتے ہیں۔ ان کے دلوں میں سود وزیاں کا بھی کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ سود وزیاں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ قیادت اور خطابت کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے بلکہ قیادت کا نمایاں جوہر ہی خطابت ہے کیوں کہ خطابت کے بغیر کوئی قیادت نہیں پنپ سکتی۔ خطابت نے ہمیشہ قیادت کا تاج پہنا ہے۔

دنیا میں جب بھی کوئی انسان انقلاب لانے کے ارادے سے اپنی تحریک شروع کرتا ہے اور عوام تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش اور تمنا کرتا ہے تو اسے سب سے پہلے خطابت اور طلاقت لسانی کی ضرورت ہوتی ہے بغیر اس کے وہ عوام کی توجہ اپنی طرف منعطف نہیں کرا سکتا اور نہ ہی ان تک رسائی حاصل کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے۔ عوامی رابطہ مہم کے

لیے خطابت اور طلاقت لسانی ہی ایک مؤثر ذریعہ ہے اور اسی سے وہ لوگوں کو اپنے ایک خاص مشن، مخصوص نقطۂ نظر اور ایک نصب العین کا قائل کر سکتا ہے۔ خطابت کے بغیر ناممکن ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا سکے۔ خطابت انسانیت کا ایک حسین ترین زیور اور قوی ترین ہتھیار ہے۔ دنیا کا کوئی معاشرہ خطابت سے خالی نہیں رہا۔ قبائلی معاشروں سے لے کر متمدن ترین سوسائٹیوں تک خطابت کا جوہرِ لامع لوگوں کو متاثر کرتا رہا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ خطابت اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ انسانی معاشرہ۔ کہتے ہیں کہ ایک صحیح فن کی حیثیت سے پانچویں چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے اسے پروان چڑھایا۔ اس کے بعد رومیوں میں اس کا شہرہ ہوا۔ (تاریخ التربیۃ: ۱/۱۰۷، ۱/۱۴۱) لیکن اس دعویٰ سے ہمیں اختلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرق میں علم و عرفان کی جو راہیں کھولی ہیں اہل مغرب ان سے محروم رہے ہیں۔ اسی وجہ سے مشرق وحی والہام کا مرکز رہا اور یہاں انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ نہ صرف علم وہدایت کے اولین علم بردار رہے بلکہ خطابت اور بیان و بلاغت کے بانی بھی یہی تھے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ گہوارۂ طفولیت سے لے کر شباب بلوغت تک انسانیت کی ذہنی اور فکری تربیت یونان کے صنم پرستوں نے نہیں کی بلکہ خانوادۂ ابراہیمی کے فرزندان توحید نے کی ہے۔ شرک و وثنیت کے بتان وہم و گمان کو نیست و نابود کر کے اور انسان کو اپنے مقام اور اپنے خالق حقیقی سے رشتہ اور رابطہ سے بھی آگاہ اور آشنا کرنے والے یہی بندگان حق تھے جو اپنے اپنے وقت کے آذروں کو صنم سازی کے بجائے بت شکنی کی تلقین کرتے رہے اور صنم کدوں کو منہدم و برباد کرتے رہے۔ یونانی اور مصری تو صنم پرست اور بت ساز تھے۔ وہ شرک و بت پرستی میں جکڑی ہوئی عبودیت کی خوگر انسانیت کو کس طرح خود شناسی اور خدا آشنائی سکھا سکتے تھے۔ یہ کام صرف اور صرف وہی کر سکتے ہیں جو انسان کو قدرت کا شاہکار اور تخلیق کائنات کا حاصل اور خلیفہ اللہ فی الارض قرار دیتے تھے۔ جن کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ ہی یہ تھا کہ اس کائنات میں سب کچھ انسان کے لیے ہے اور انسان صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم سے بھی واضح ہوتا ہے۔

اب اگر تاریخی طور پر بھی دیکھا جائے تو فن خطابت کا موسس و بانی سمجھا جانے والا

یونانی مفکر ارسطو تو فن خطابت کے چند نظریاتی قواعد واصول کے علاوہ فن خطابت سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ اور غالباً یہ خطابت کے اصول اور قواعد اس نے اپنے شاگرد اسکندر اعظم مقدونی کے لیے لکھے تھے۔ چنانچہ جاحظ نے ارسطو کی عظمت کا اعتراف تو کیا ہے اور اسے ''صاحب المنطق'' کے لقب سے بھی یاد کیا ہے لیکن ارسطو کی اپنی خطیبانہ صلاحیت کا اعتراف نہیں کیا کیونکہ وہ خطیب تھا ہی نہیں۔ چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے:

''یونانیوں کے پاس فلسفہ اور منطق تھی، صاحب منطق یعنی ارسطو کم گو انسان تھا جسے خطابت اور بیان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ تاہم وہ کلام کے امتیازی اوصاف، تفصیل، معانی اور خصائص کا علم رکھتا تھا اور ان سے بخوبی آشنا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ حکیم جالینوس منطق میں بہت فائق تھا، کوئی اس کی ٹکر کا نہ تھا لیکن خطابت یا فصاحت و بلاغت کے ضمن میں اس کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔''

بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ خطابت ایک سحر اور جادو ہے اور انسانی تاریخ ایسے سرداروں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اپنی شاندار خطابت، زبان کے جادو، استدلال کے زور اور بیان کی قوت سے وقت اور حالات کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ دولت عباسی کا قیام، صلیبی جنگوں کی شدت، امریکہ کی جنگ آزادی اور برصغیر پاک وہند کی جدوجہد آزادی میں خطابت ہی کا سحر کام کرتا رہا۔ دنیا کی تمام تحریکیں خواہ وہ اصلاحی تھیں یا انقلابی، وہ خطابت کے زور ہی سے وجود میں آئیں اور پروان چڑھیں۔ اس بارے میں سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((ان من البیان لسحرا)) (بخاری: ۷/۳۰، ابوداود: ۵/۲۷۶، ترمذی: ۵/۲۷۶)

''بعض بیان جادو کا اثر رکھتے ہیں۔''

سرکار دو عالم ﷺ نے جس معاشرے میں جنم لیا وہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس کے افراد اپنی زبان، اپنے زور بیان اور اپنی خطابت پر فخر کرتے تھے چنانچہ آئندہ سطور میں عربوں کی خطابت کا بھی مختصر تذکرہ کیا جائے گا تاکہ سرکار دو عالم ﷺ کی خطابت کا پس منظر بھی معلوم ہو جائے اور ان اصلاحات سے بھی آشنائی ہو جو آپ ﷺ نے عرب

خطابت میں نافذ فرمائیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ خطابت اور طلاقت لسانی ان تمام اقوام کی عظمت کا نشان رہی ہے جو خطابت میں کوئی مقام رکھتی تھیں۔ چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے:

''خطابت ایک ایسا فن ہے جو تمام اقوام عالم میں موجود رہا ہے اور تمام انسانی نسلوں، قوموں اور قبائل کو اس کی ہر آن اور ہر موقع پر ضرورت رہی ہے یہاں تک کہ زنگی اور حبشی لوگ اپنی کم عقلی، غباوت، درشت کلامی اور درشت حسی اور ناموزوں مزاج کے حامل ہونے کے باوجود طویل تقریریں کر سکتے ہیں اگرچہ ایسے لوگوں کے خطبات کے معانی سخت اور مفاہیم درشت ہوتے ہیں اور ان کا لفظی اسلوب کم عقلی اور کم علمی کا غماز ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایرانی تمام اقوام عالم میں سب سے بڑے اور بہترین خطیب ہوتے ہیں اور ان ایرانیوں میں بھی فارس کے صوبہ کے لوگ زیادہ بڑے خطیب ہوتے ہیں لیکن شیریں گفتاری اور آسان اسلوب ادائیگی، دل نشین اور خوب صورت انداز بیان اور قدرت کلام میں مرو شہر کے باشندے سب پر فائق اور افضلیت کے حامل ہیں، دری، فارسی اور پہلوی زبان میں سب سے زیادہ فصیح اللسان اور فصیح الکلام اہواز کے لوگ ہیں۔ جہاں تک آتش کدوں کی نغمگی اور موبدوں کی لسانی فصاحت کا تعلق ہے تو وہ مجوسیوں کے مذہبی پیشواؤں کا حصہ ہے جو نغمہ وسر کی زبان کی تفسیر کرنا جانتے ہیں۔'' (البیان والتبیین: ۱۲/۳)

جاحظ کا قول ہے کہ:

((والذين بعث فيهم اكثر ما يعتمدون عليه البيان واللسان .)) (البیان والتبیین: ۱۸/۲)

''رسول اللہ ﷺ ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جن کے ہاں معیار کمال ہی قوت بیان اور فصاحت لسان تھی۔''

جاحظ کی اس رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک میدان خطابت کے

شہسواروں میں عربوں کے بعد صرف اہل فارس تھے لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خطابت اور قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خطابت اگر چہ عربوں کا خاصہ تھا اور اہل عرب میں بڑے بڑے نامور خطیب پیدا ہوئے لیکن دوسری اقوام میں جہاں بھی قیادت ابھری اس کو ہمیشہ خطابت کا ہی سہارا لینا پڑا، چنانچہ انگلستان کا وزیر اعظم جوزف چیمبرلین ایک نہایت کامیاب لیڈر تھا، اس کا مقولہ ہے کہ کل (یعنی مستقبل) اسی کا ہے جو بول سکتا ہے۔ انگریز جس نے دنیا کو پارلیمانی نظام کا تحفہ دیا ہے اور پوری دنیا آج اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے، اور جس نے کسی زمانے میں دنیا کی قیادت وسیادت کا علم اٹھا رکھا تھا اور اس کی حکومت میں کبھی سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا اگر چہ آج کل اس کے ملک میں کئی کئی مہینوں تک اسے خود سورج نظر نہیں آتا، اس کی حکومت کے نظام کی کامیابی و کامرانی خطابت کی مرہون منت ہے کیونکہ پارلیمانی نظام میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی جنگ دراصل خطابت ہی کی جنگ ہوتی ہے۔ لہٰذا بقول جوزف چیمبرلین جو بات کر سکتا ہے وہی پارلیمنٹ کے مستقبل کا قائد ہوتا ہے، چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ نے بڑے بڑے خطباء اور معززین کو جنم دیا جو اپنی خطابت کے بل بوتے پر انتخاب بھی جیتے اور پارلیمنٹ پر بھی چھائے رہے اور برطانوی قوم کی قیادت بھی کرتے رہے، ان میں چارلس جیمز فاکس، گلیڈسٹون اور ونسٹن چرچل زیادہ مشہور ہیں۔ ونسٹن چرچل نے تو دنیا میں اب تک کی خوفناک جنگ جس میں دو کروڑ سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بنے یعنی دوسری عالم گیر جنگ میں بڑی ہمت، جرأت اور کامیابی سے نہ صرف انگریز قوم کی قیادت کی بلکہ تمام اتحادی اقوام بھی اس کی قیادت پر فخر کرتی تھیں۔ وہ اپنی تقریروں میں پر اعتماد لہجے اور پختہ یقین کے ساتھ اہل یورپ کو زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کی تلقین کرتا۔ اس دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر اور مسولینی نے بھی اپنی شعلہ بیانی اور آتش نوائی سے جرمن قوم کو تکبر آمیز احساس برتری دے کر ایک شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ اطالوی ڈکٹیٹر مسولینی جو ایک فسطائی ذہنیت کا حامل تھا اور پورے ۲۲ سال آمر مطلق بن کر اٹلی پر حکومت کرتا رہا، ایک عظیم مقرر اور خطیب تھا۔ وہ فن خطابت کے ہر نشیب و فراز سے واقف و آشنا تھا۔ وہ جب تقریر کرتا تو اطالوی قوم کی نفسیاتی رگوں کو چھیڑتا اور سوئے ہوئے

جذبات میں اشتعال پیدا کرتا تھا۔ وہ جب بھی خطاب کرتا تو اٹلی کے باشندوں کو ان کی عظمت رفتہ کا احساس دلاتا اور آل سیزر کے لقب سے یاد کرتا اور انھیں مستقبل کی سربلندیوں کی نہ صرف امید دلاتا بلکہ یقین دلاتا تھا۔ انقلاب فرانس نے یورپ کی تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہ عظیم انقلاب بھی خطابت ہی کا مرہون منت ہے۔ اس ملک کے خطباء نے بھی اپنے خطبات سے لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا جس کی وجہ سے فرانس میں یہ اتنا بڑا انقلاب رونما ہوا۔

خطابت اور جاہلیت

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اس لیے بیشتر ادبی ذخیرہ ضائع ہوگیا۔ شعری ذخیرہ تو وزن اور موسیقیت اور عربوں کی طبعی مناسبت کی وجہ سے محفوظ رہ گیا لیکن نثری ذخیرہ اکثر و بیشتر ضائع ہوگیا کیونکہ اس کی حفاظت کا کوئی محرک نہیں تھا، اس لیے بعض نقادوں نے جاہلی نثر کے وجود کا انکار کر دیا ہے۔ (الادب الجاہلی، ص ۳۷۱) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ شعر کو عرب ماحول میں ایک تقدم حاصل تھا جو خطابت کو نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:

((فلم تكن الخطابة تدوى فى القبائل كما يسير الشعر .))

(تاریخ الشعر السیاسی ص:۲۹)

"خطابت قبائل میں اس طرح رائج نہ تھی جیسے کہ اشعار رائج تھے۔"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود عربی خطابت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عرب اپنی زبان اور اپنے بیان کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ تھے، اس کا ثبوت جاہلیت کے بعض خطبات، سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے والے وفود کی بات چیت اور قرآن حکیم کے انداز بیان سے ملتا ہے۔ خطابت کے فروغ اور ارتقاء میں جو امور ناگزیر طور پر معاون ہوتے ہیں ان میں صلح و جنگ، قبائلی معاملات اور امور کی باہمی درستی، سیاسی مسائل اور دینی ضروریات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قبل از اسلام عربوں میں یہ تمام اسباب موجود تھے۔ پھر عربوں میں ذاتی تفاخر اور قومی اور قبائلی عصبیت کے لیے شعر کے علاوہ خطابت کی

بھی اشد ضرورت تھی۔ اس لیے اس صنف نے مناسب ترقی کی ہوگی۔ جاہلیت میں خطابت دینی اور سیاسی مقاصد کے لیے شاید استعمال نہ ہوتی ہو لیکن اجتماعی اور انفرادی مقاصد کے لیے اس کا وجود مسلّم ہے۔ صاحب صبح الاعشیٰ نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

''عرب خطابت اور نثر کی طرف اپنی انتہائی توجہ مبذول کرتے تھے یہاں تک کہ "الریحان والریعانی" کا مصنف لکھتا ہے کہ عربوں کے شہریوں اور دیہاتیوں (بدوؤں) کی عمدہ نثر اور بلند پایہ گفتگو کی مقدار ان کی شاعری سے زیادہ ہے لیکن ان کی نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ جب کہ ان کی شاعری کا دسواں حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خطیب عام طور پر بادشاہوں کے سامنے یا حملوں کے وقت یا قبائل میں صلح کرانے کے لیے یا نکاح کے موقع پر خطبہ دیتا ہے اور جب وہ موقع گزر جاتا ہے تو کچھ لوگ اسے یاد رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اشعار میں سے ایک شعر بھی ضائع نہیں ہوتا۔ صاحب ''الریحان الریعان'' نے جس امر کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ عربوں نے نثر کو یک قلم ترک کر دیا تھا یا نثر سے اپنی توجہ منعطف کر لی تھی یا نثر کو یک قلم فراموش کر دیا تھا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اشعار کو یاد رکھنا آسان تھا اور شہریوں، دیہاتیوں اور خواص وعوام میں شعر کا چلن عام تھا بخلاف خطابت کے کہ اس میں صرف بلند آواز اور فصیح و بلیغ لوگ ہی مہارت حاصل کرتے تھے۔ اسی لیے اس کا یاد رکھنا مشکل ہو گیا اور وہ بہت کم نقل کی گئی۔ دور جاہلیت میں خطابت سادات عرب اور رؤساء کے ذریعے قائم رہی جو فضیلت حاصل کرنے میں بڑھ گئے اور بزرگی کی بلندیوں پر چڑھ گئے۔ وہ عمدہ مقامات، باعظمت محفلوں، پروقار مجلسوں اور بڑے بڑے اجتماعات میں اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے۔'' (صبح الاعشیٰ: ۱/۲۱۰)

مورخ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عربوں کے فن نثر سے انکار کیا ہے اور خطابت کے عروج کو عہد اسلامی سے منسوب کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''خطابت منظم شہری زندگی میں سکون و قرار اور اطمینان و راحت کی محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونان میں ملوکیت کے عہد، بدوی دور اور سرکشی اور شورش کے دور میں خطابت نظر نہیں آتی۔ یونانی خطابت عام سیاسی زندگی اور جمہوریت کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اسی طرح رومی بھی اپنے بدوی دور میں بادشاہوں کے عہد اور ایام جمہوریت میں فن خطابت سے یک قلم نابلد اور ناآشنا تھے لیکن جب ان کی سیاسی زندگی وجود میں آئی اور ان میں گروہی اختلافات ظہور پذیر ہوئے تو اس دور میں وہ فن خطابت سے متعارف ہوئے۔ اگر کلیسائی خطبوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو مسیحی یورپ میں خطابت جمہوریت کے دور میں ظاہر ہوئی جبکہ سیاسی زندگی وجود میں آئی اور مختلف قبائل نے سیاست میں حصہ لیا۔ اس بات کی تصدیق نہیں کی جا سکتی کہ عرب جاہلیت میں ممتاز خطابت موجود تھی کیونکہ خطابت اسلام میں پیدا ہوئی اور نبی کریم ﷺ اور خلفا کے ہاتھوں پروان چڑھی اور مسلمانوں میں جب سیاسی اختلافات رونما ہوئے تو خطابت عروج کمال کو پہنچ گئی۔'' (الادب الجاہلی: ۳۵۴)

حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں خطابت موجود تھی، البتہ ان کی بداوت نے خطابت عربیہ میں سادگی، زور، روانی اور شکوہ پیدا کیا۔ متمدن اقوام کی خطابت تکلف کی نذر ہو جاتی ہے جبکہ عربوں کی خطابت فطری خطابت تھی۔ عربوں کو فنی خطابت کے قواعد وضوابط کا اتنا شعور نہ ہو یہ ایک الگ بحث ہے لیکن عربوں کے ہاں سرداری کے لیے لازمی وصف خطابت تھا، چنانچہ فن خطابت عرب کے قبائلی سرداروں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس وجہ سے عرب میں خطابت کو ایک بلند مقام حاصل تھا۔ شاعر کی طرح خطیب بھی ہر قبیلہ کے لیے لازمی تھا۔ فصاحت و بلاغت کا ملکہ عربوں کے ہاں ایک زیور کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے:

''عرب اپنے بیان اور بلاغت پر سب سے زیادہ فخر کرتے تھے۔ زبان دانی اور کلام پر پوری قدرت رکھنے پر وہ فخر محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے

ہاں جو شخص اس وصف سے عاری ہوتا یا اس خوبی اور کمال میں ناقص اور قاصر ہوتا وہ اسے نظر حقارت سے دیکھتے۔" (البیان والتبیین: ۲۷/۴)

چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

کفی بالمرء عیبا ان تریٰ له
وجه ولیس له لسان
وما حسن الرجال لهم بزین
اذا لم یسعد الحسن البیان

"ایک آدمی میں یہی عیب کیا کم ہے کہ اگر تمھاری اس پر نظر پڑے تو اس کا چہرہ تو نظر آئے مگر اس کی زبان مفقود ہو۔ مردانہ حسن اس وقت تک باعث زینت نہیں ہوسکتا جب تک اس حسن کی تائید حسن بیان سے نہ ہوتی ہو۔"

(عیون الاخبار، لابن قتیبہ: ۱۶۹/۲)

ایک بے عمل خطیب کو عرب پسند نہیں کرتے تھے۔ قلب وجگر اور دل ودماغ اگر فصاحت لسان اور قوت بیان کا ساتھ نہ دیں تو ان کے نزدیک یہ بات سخت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک اموی شاعر اخطل کہتا ہے ؎

ان الکلام من الفواد وانما
جعل اللسان علی الفواد دلیلا
ویعجبنك من خطیب قوله
حتی یکون مع البیان اصیلا

"کلام کا تعلق قلب وجگر سے ہے، قوت بیان تو بس دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ کسی خطیب کی بلاغت لسانی تجھے اس وقت تک متاثر نہ کرنے پائے جب تک کہ وہ اپنے بیان میں سچا اور صادق نہ ہو۔"

تاریخ عرب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دور جاہلیت میں عربی خطابت مندرجہ ذیل موضوعات تک محدود تھی۔

ا۔ مفاخرت ومنافرت پر مبنی خطبات:

اپنے حسب ونسب پر فخر عربوں کی زندگی کا خاصہ تھا اور یہ خاصہ عرب خطباء کا ایک اہم ترین موضوع تھا۔ وہ دشمن کے قبیلے کی پریشان حالی اور اپنے قبیلے کے محاسن بیان کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ علقمہ بن علاثہ نے اپنی برتری اور فضیلت بیان کرتے ہوئے کہا:

((انـا خيـر مـنك اثـرا، واحـد منك بصرا، واعز منك نفرا، واشرف منك اثرا.)) (الخطب والمواعظ: ص ۵۸)

''میں اثر ورسوخ میں تجھ سے بہتر ہوں، میری نگاہ تجھ سے زیادہ تیز ہے، میرے خاندان کے افراد تجھ سے زیادہ معزز ہیں اور میرا ذکر تجھ سے زیادہ اشرف ہے۔''

عامر نے اس کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

((انـی اسمی منك سمة واطول منك قمة، واحسن منك لمة، واجعد منك جمة، واسرع منك رحمة، وابعد منك همة.))

''میں مرتبہ میں تجھ سے بلند ہوں، قد میں تجھ سے لمبا ہوں، میرے بال تجھ سے زیادہ خوب صورت ہیں، میرے بال گھنگریالے ہیں، میں تجھ سے زیادہ رحم کھانے والا ہوں اور میں تجھ سے زیادہ باہمت اور بہادر ہوں۔''

اس سلسلہ میں ایک مثال علقمہ بن علاثہ اور عامر بن طفیل کے مابین ہونے والا مناظرہ بھی ہے۔ اس مناظرہ کے حکم ہرم بن قطبہ الفزاری تھے۔ یہ دونوں امیدوار سرداری کے استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے۔ عامر نے کہا:

((والـلـه! انی الاكرم منك حسبا، واثبت منك نسبا، واطول مـنك قصبا، انی والله لاركب منك فی الحماة، واقتل منك لكماة، وخير منك للمولى والموالات.))

''اللہ کی قسم! میں تم سب سے حسب کے اعتبار سے زیادہ شریف اور نسب کے لحاظ سے زیادہ پاک اور مرتبہ اور جاہ کے اعتبار سے زیادہ آگے ہوں، لڑائی میں تم سے بڑا شہسوار اور بہادروں کو قتل کرنے میں تم سب سے بڑھ کر اور غلام اور

باندیوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔"

اس کے جواب میں علقمہ نے کہا:

((انا انحر منك للقاح، وخير منك فی الصباح، واطعم منك فی السنة الشباع، والله انی لبر وانك لفاجر، وانی لولود، وانك لعاقر، وانی لعف و انك لعاهر، وانی لوفی وانك لغادر، فيم تفاخرتی یا عامر.))

"یعنی میں مصائب وشدائد میں تم سے زیادہ قربانی دینے والا ہوں اور صبح کے وقت میری زندگی تمھاری نسبت بہترین ہوتی ہے اور قحط کے ایام میں تم سے زیادہ لوگوں کو کھانا کھلانے والا ہوں، اللہ کی قسم میں نیک ہوں اور تم فاجر ہو، میں وفا شعار ہوں اور تم وفاشکن اور غدار ہو، سوائے عامر! تم کس بات میں مجھ پر فخر کر رہے ہو۔" (احسان نصر ص ۹/ ابن درید: الاشتقاق ص ۱۴۵)

اس مناظرے کا فیصلہ برابری پر ہوا۔

اسی طرح کے اور بھی کئی خطبات عربی کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

(ملاحظہ ہو الاشتقاق، لابن الدرید ص ۱۴۵، البیان والتبیین: ۲/ ۲۷۲، الاغانی ۱۵/ ۱۵، العمدۃ: ۱/ ۲۸)

۲۔ تحریض علی الحرب کے لیے خطبات:

جنگ وجدال عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ وہ ایسے مواقع پر تیر وسنان کے ساتھ اپنی زبان و بیان کے جوہر بھی دکھاتے تھے، چنانچہ اس بارے میں کتابوں میں کئی خطبات ملتے ہیں اسی سلسلہ میں ہانی بن قبیصہ کا وہ خطبہ بہت مشہور ہے جو اس نے یوم ذی قار کے موقع پر عربوں کو اہل فارس کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے دیا تھا۔

۳۔ خطبات مصالحت:

قبائل کی باہمی عداوت ورقابت کو دور کرنے کے لیے جو کوششیں ہوتی تھیں اس میں مصالحانہ خطبات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ عرب قبائل کی باہمی عداوت نسلاً بعد نسلٍ چلتی تھی لیکن ان کی بغض وعداوت اور جنگ وجدل کی بھڑکی ہوئی آگ کو فصیح وبلیغ خطابت کی طاقت

سرد کرتی تھی اور بلاغت وفصاحت سے بھرپور خطبات ان کی آتش انتقام کو بجھانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں قیس بن خارجہ کا وہ خطبہ جو اس نے جنگ داحس وغبراء کے بعد دیا تھا اس کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔ سبیع بن حارث اور میثم بن مثوب کے درمیان نزاع پیدا ہوا اور اس امر کا قوی امکان تھا کہ دونوں قبائل برسر پیکار ہو جائیں لیکن اس خطبہ نے ان کے درمیان ہونے والی جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ قیس بن خارجہ کا یہ خطبہ اتنا طویل تھا کہ صبح سے شام ہوگئی لیکن خطیب کا بیان جاری رہا۔ اس خطبہ میں نہ تو اس نے کوئی بات دہرائی اور نہ ہی کسی لفظ کا اعادہ کیا۔ اس نے فریقین کے نمائندوں سے کہا تھا:

((عندی قری کل نازل، ورضا کل ساخط، وخطبة من لدن تطلع الشمس الی ان تغرب، آمر فیها بالتواصل، انهی فیها من التقاطع.))

"یعنی میرے پاس ہر آنے والے کے لیے مہمان نوازی کا سامان اور ہر ناراض کے لیے رضا مندی ہے اور ایک ایسا خطبہ ہے جو سورج کے طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک جاری رہے گا۔ میں اس میں دلوں کے جوڑنے کا حکم دوں گا اور قطع رحمی سے منع کروں گا۔

۴۔ وعظ وارشاد:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل اخلاقی انحطاط کے علاوہ شرک و بت پرستی کا بھی دور دورہ تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر اہل عقل ودانش کا ایک گروہ وجود میں آیا، وہ موعظت ونصیحت کے فرائض انجام دیتا تھا اور اصلاحِ معاشرہ اور لوگوں کو شرک و بت پرستی کو ترک کرنے کی اور توحید کی دعوت دیتا تھا۔ قیس بن ساعدہ الایادی اس گروہ کا سرخیل تھا۔ اس نے ایک مرتبہ عکاظ کے میلے میں خطبہ دیتے ہوئے کہا:

((ایها الناس! اسمعوا ودعوا، من عاش مات، ومن مات فات، وکل ما هو آتٍ آتٍ، لیل داج ونهار ساج، وسماء

ذات ابـراج، ونـجـوم زمرد، وبحار تزخر، وجبال مرساة، وارض مـدعـاة، وانهار حجراة، وان فی السماء لخبزًا، وان فی الارض لـعبـرا، مـا بـال الـنـاس يذهبون ولا يرجعون، ارضـوا فـاقـاموا، ام تركوا فناموا، يقسم بالله قسما، لا اثم فيه، ان لله دينا هو ارضىٰ له، وافضل من دينكم، الذی انتم عليه انكم تاتون من الامر منكرا.)) (العقد الفرید:۲/۱۵۶)

''لوگو! سنو اور یاد رکھو، جو زندہ ہے وہ مرے گا، جو مرے گا وہ دنیا سے چلا جائے گا، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، یہ شب سیاہ اور یہ روشن دن، یہ برجوں والا آسمان، یہ جھلملاتے ستارے، یہ بحر زخار، یہ سر بفلک پہاڑ، یہ بچھی ہوئی زمین اور یہ بہتی نہریں اس بات کی گواہ ہیں کہ آسمان میں کوئی خبیر ذات ہے اور زمین عبرت کا مرقع ہے۔ آخر یہ لوگ کہاں جاتے ہیں کہ پھر وہاں سے لوٹ کر نہیں آتے، کیا وہ وہاں اپنے اپنے مقام پر رضا مند ہو گئے؟ یا دنیا چھوڑ کر سو گئے؟ قیس ایک ایسی قسم کھا کر کہتا ہے جس میں کوئی گناہ نہیں کہ اللہ کا ایک دین ہے جو تمھارے دین سے بہت بہتر ہے اور اللہ کو وہی پسند ہے، یقیناً تمھیں ایک ناگوار معاملہ سے سابقہ پڑے گا۔''

۵۔ درباری اور استقبالیہ خطبات:

کتابوں میں کچھ ایسے خطبات بھی ملتے ہیں جو مختلف میلوں، درباروں اور قبائلی وفود کی آمد پر دیئے گئے تھے۔ ان خطبات میں فخر و مباہات اور تہنیت و تعزیت کے مضامین پائے جاتے ہیں یا پھر کسی شخص کے استقبال پر وہ خطبات پڑھے گئے۔ حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے عرب خطباء کی ایک جماعت کسریٰ کے دربار میں بھیجی تھی۔ اس کے خطبات اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ (العقد الفرید:۲/۳۰۷) اس قسم کے خطبات میں اکثم بن عیسیٰ کا خطبہ سب سے عمدہ شمار ہوتا ہے۔ ابن عبدربہ نے ایسے تمام خطبات اکٹھے کر دیے ہیں چنانچہ ''کتاب الاغانی'' میں لکھا ہے:

"ان کے وفود امراء عرب کے پاس جاتے جیسے قیس بن رفاعہ کا وفد نعمان بن منذر کے پاس عراق گیا اور حارث بن ابی شمر غسانی کے پاس گیا اور علقمہ بن عبدہ، مسلمہ بن مخلد ساعدی وغیرہ کا وفد غسان کے آل جفنہ کے پاس..........

یہ لوگ ایسے تھے کہ باتوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے، اشعار پڑھتے اور خطبے دیتے تھے اور جس طرح کہ شرفائے قریش کے وفود سیف بن ذی یزن کے پاس یمن گئے اور حبشہ کے مقابلہ میں ان کی مدد کرنے پر اسے مبارک باد دی اور اس وفد کے خطیب نبی کریم ﷺ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم تھے اور اکثم بن صیفی کا وفد عمرو بن ہند کے پاس اس کے بھائی کے مرنے پر تعزیت کے لیے گیا اور بنو اسد کے بہت سے آدمیوں کا وفد جن میں عبید بن الابرص، المہاجر بن خراش اور قبیصہ بن نعیم بھی تھے، امراء القیس کے پاس اس کے باپ کے قتل ہونے پر گیا۔" (کتاب الاغانی: ۷۲/۸)

۶۔ وصیتی خطبات:

ان سے مراد وہ خطبات ہیں جو ایک شخص اپنی موت کا وقت قریب دیکھ کر اپنے اہل وعیال، اعزاء واقرباء اور اپنے قبیلہ اور قوم کو نصیحت کے طور پر دیا کرتا تھا۔ جاہلیت کے مشہور ترین وصایا قوم کے لیے عامر بن الطرب العدوانی کی وصیت، اکثم بن صیفی کی وصیت اور امامہ بنت حارث کی اپنی بیٹی ام ایاس کے لیے وصیت شمار ہوتی ہے۔

۷۔ نکاح کے خطبات:

عربوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مرد کسی عورت کو شادی کا پیغام دیتا تو اس کے قبیلے کا ایک سرکردہ خطیب لڑکی والوں کے ہاں خطبہ دیتا جس میں شادی کے خواہش مند نوجوان کے محاسن اور اس کی خاندانی وجاہت کا تذکرہ ہوتا۔ پھر عورت کے قبیلے کا خطیب اس کا جواب دیتا۔ دولہا کے خطیب کا خطبہ طویل ہوتا جب کہ عورت کی جانب سے مختصر۔ اس سلسلہ میں ابو طالب کا خطبہ مشہور ہے جو انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر دیا تھا۔ (صبح الاعشیٰ: ۲۱۳/۱، اعجاز القرآن ص ۱۲۶، السیرۃ الحلبیۃ: ۱۴۴/۱)

جاہلی خطابت کی خصوصیات

دور جاہلیت کے خطبات کا اصلی اسلوب تصنع، سجع وقافیہ ہوتا تھا۔ خطباء نہایت محنت اور جانفشانی سے خطبات تیار کرتے اور پھر انھیں نہایت نپتلے انداز میں پیش کرتے۔ اجزائے خطبہ کی ترتیب وترکیب کا کوئی اصول نہ تھا۔ معنوی اور فکری انداز سے ان کا غالب رنگ سادگی اور سطحیت ہوتی تھی۔ ذات البین کے خطبات قدرے طویل ہوتے تھے۔ اشعار سے استشہاد ان کے ہاں عام ہوتا تھا۔ یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں کی خطابت کی فنی صورت عربوں کے ہاں نہیں ہوتی تھی۔ عربوں کی خطابت میں بداہت اور ارتجال کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ عربی خطبے سادگی اور عام فہم اسلوب کا نمونہ ہوتے تھے اور ان کے خطبات میں تجربات اور مشاہدات کی عمدہ تمثیلیں عام ہوتی تھیں، البتہ کاہنوں کی عبارتوں میں تکلف اور سجع کا پہلو غالب ہوتا تھا۔ سجع دوسرے خطبات میں پایا جاتا تھا۔ وصیت اور نصیحت کے خطبات میں بھی سجع کے آثار ملتے ہیں۔ غالباً سجع کا سبب اس کی تاثیر ہے کیونکہ الفاظ کا شکوہ سامع کو بہت متاثر کرتا ہے اور اس کے صوتی اثرات قلب و ذہن کو محظوظ کرتے ہیں کیونکہ سجع موزونیت کے لحاظ سے شعر کے قریب تر ہوتا ہے۔ مترادف الفاظ کا استعمال بھی عربوں کے خطبات میں عام پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب بھی سامع کے ذوق کی تسکین ہے۔

انداز خطابت:

جاہلیت میں خطابت کا ایک اپنا الگ انداز تھا اور خطیب کے بعض اوصاف ایسے تھے جن کے بارے میں ادب و تاریخ میں بکثرت اشارات ملتے ہیں۔ خطیب کے اوصاف میں سے بعض کا تعلق اس کی خلقت و جبلت سے تھا اور بعض کا اس کے لباس اور دیگر لوازمات سے تھا، خطیب کے بعض اوصاف پیدائشی ہیں جن میں سے حوصلہ مندی اور حواس پر قابو رکھنے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ موقع ومحل کے مطابق حاضر جوابی سے کام لینا اور جرأت وحوصلہ سے حالات کا سامنا کرنا خطابت کے بنیادی لوازمات میں سے ہے۔ جاہلیت میں قوی دلائل پیش کرنا بھی قابل ستائش تصور کیا جاتا تھا۔ گلا پھاڑ کر بات کرنا اور باچھیں کھولنا بھی

عربوں میں پسندیدہ تصور کیا جاتا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس وصف کو ناپسند فرمایا ہے۔
خطیب کے لیے گرج دار آواز اور رعب دار لہجہ ایک بنیادی وصف ہے چنانچہ قدامہ بن جعفر نے کہا ہے کہ:

''بلند آواز (جہیر الصوت) ہونا خطیب کے عظیم ترین اوصاف، حسن خطابت اور اس کی عظمت تاثیر کی ضمانت ہے۔''

جاحظ نے لکھا ہے کہ:

''کچھ خطباء باچھیں کھولنے اور ہونٹوں کو لٹکانے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ جب سرکار دو عالم ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے باچھیں کھولنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''فصاحت دکھانے کے لیے باچھیں نہ کھولو۔'' (ایاك والتشادق) ایک اور روایت میں فرمایا: ''مجھے سب سے زیادہ وہ لوگ ناپسند ہیں جو فضول بک بک کرتے ہیں اور بہت منہ پھلا کر باتیں کرتے ہیں۔'' (البیان والتبیین: ۱/۱۳)

((وكان من الخطباء من ينتحل سعة الاشداق وهدل الشفا وقد نهى الرسول عن التشادق بقوله، اياى والتشادق، وقال ايضا بعضكم الى اثر ثارون المتفيهقون.)) (احسان نصر: ۲۰)

''اور جاہلی دور میں کچھ خطباء باچھیں کھولنے اور ہونٹ لٹکانے میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ پس سرکار دو عالم ﷺ تشریف لائے تو آپؐ نے باچھیں کھولنے سے روکتے ہوئے فرمایا: کہ میرا باچھیں کھول کر خطابت کرنے کے اس انداز سے کیا واسطہ اور فرمایا: میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ لوگ ہیں جو فضول گوئی سے کام لیتے اور منہ پھلا کر باتیں کرتے ہیں۔''

دور جاہلیت میں خطیب میں کچھ باتیں نہایت معیوب سمجھی جاتی تھیں۔ ان میں ایک بات کرنے سے عاجز ہونا (عیّ) اور بات کرتے کرتے رک جانا (حصر)، زبان میں لکنت اور تلفظ و اعراب میں غلطی کرنا سرفہرست ہے۔ اس قسم کے خطیب اپنے قبائل کے لیے

باعث ننگ وعار سمجھے جاتے تھے۔

خطیب کا مقام:

جاہلیت میں عرب شاعر کو خطیب پر فضیلت دیتے تھے۔ شاعر کی پیدائش پر تو قبیلے کے افراد ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے، لیکن خطیب کی قدر و منزلت بھی کچھ کم نہ تھی بلکہ بہت بلند تھی۔ چنانچہ جاحظ نے لکھا ہے:

''شاعر کا مرتبہ خطیب سے بلند تھا کیونکہ ہر قبیلہ والے اپنے محاسن وفضائل کو باقی رکھنے اور اپنے کارناموں کو یاد کرنے میں شاعر کے بہت محتاج ہوتے تھے (کیونکہ اشعار اس دور میں آج کل کے میڈیا کی طرح تھے) لیکن جب شعراور شعراء کی کثرت ہوگئی تو خطیب کا مرتبہ شاعر سے بلند ہوگیا۔''

(کتاب البیان والتبیین: ۴/۱۰۰)

ایک اور مقام پر جاحظ نے لکھا ہے کہ:

''جاہلیت میں شاعر کو خطیب پر ایک گونہ فوقیت حاصل تھی کیونکہ وہ لوگ شعراء کے محتاج تھے کہ شعراء ان کی رفعت شان اور فضائل ومحاسن کا تذکرہ کریں، ان کے دشمنوں کو (اپنے اشعار سے) خوف زدہ کریں۔ قوم کے شہسواروں سے دشمنوں کو ڈرائیں، کثرت تعداد کی ہیبت ان کے دلوں پر بٹھائیں، ان کے شاعر کو خوف زدہ کریں لیکن جب شعراء بہت ہوگئے اور انھوں نے شاعری کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا اور بدزبانی پر اتر آئے اور وہ لوگوں کی عزت وآبرو سے کھیلنے لگے تو خطیب کو شاعر پر برتری اور فوقیت حاصل ہوگئی۔ (البیان والتبیین: ۱/۱۵۱)

یہ جاحظ کی رائے ہے جو اس نے بیان کی لیکن بعض حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے کیونکہ خلافت کا منصب قیادت کا متقاضی ہے یعنی خطابت قیادت کی راہ ہموار کرتی ہے اور اکثر و بیشتر خطابت سے محرومی قیادت سے محرومی کا باعث ہو جاتی ہے۔ عرب کے خطیب اپنے اپنے قبیلے کے قائد اور زعماء بھی ہوتے تھے۔ عرب جہاں خطابت وتدبر اور حکمت ودانش کو قیادت کے لیے ضروری اور لازمی سمجھتے تھے وہاں ایک دانا خطیب کی قیادت بھی قبول

کرتے تھے۔ جاحظ نے متعدد عرب خطباء کے نام دیئے ہیں جو خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے البتہ جاحظ کا خیال یہ ہے کہ خطابت اور شعر گوئی ایک ساتھ کسی شخصیت میں کم ہی جمع ہوتی ہے، اگر یہ دونوں چیزیں کسی شخصیت میں جمع ہو جائیں تو پھر خطابت خوب چمکتی ہے۔

جاہلیت کے مشہور خطباء:

جاہلیت عرب میں ہر قبیلہ میں فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کے رنگ میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھی لیکن جاحظ کے بیان کے مطابق دو قبیلے اس فن میں بہت ممتاز تھے اور ان کی مثالیں دی جاتی تھیں اور وہ قبیلے تھے بنوتمیم اور بنو ایاد، عہد اسلام میں بھی ان دونوں قبیلوں میں بڑے جلیل القدر خطباء پیدا ہوئے۔ بنو ایاد کے خطباء میں قیس بن ساعدہ، لقیط بن معبد اور زید بن جندب الایادی وغیرہ اور بنوتمیم کے خطباء میں اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ اور قیس بن عاصم بہت مشہور خطباء ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بنو کنانہ، بنو حنیفہ، بنو اسد اور بنو ربیعہ کے خطباء بھی بہت مشہور تھے۔ قیس بن ساعدہ الایادی کو خطیب العرب کہا جاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور حکمت و نصیحت میں اس کی ایک ممتاز حیثیت تھی۔ وہ توحید اور روز قیامت پر ایمان رکھتا تھا اور عربوں کو بت پرستی چھوڑ کر اپنے خالق کی عبادت کی دعوت دیتا تھا جیسا کہ اس کے خطبات سے معلوم ہوتا ہے۔

اکثم بن صیفی بنوتمیم کا خطیب اعظم تھا۔ عرب کے اہل عقل و دانش اور ماہرین انساب میں وہ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھا۔ اصالت فکر، قوت دلیل اور الفاظ و معانی کی حلاوت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس نے کسریٰ کے دربار میں ایک مرتبہ خطبہ دیا تو بادشاہ نے بہت داد دی۔

عہد اسلامی میں خطابت:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے بعد ہر شئے میں کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوئی۔ اخلاقی، فکری، ادبی اور ذہنی اقتدار تبدیل ہوئیں۔ نظام حکومت بدلا، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظاموں میں تبدیلی واقع ہوئی۔ چنانچہ شعر و خطابت میں بھی بہت تبدیلی وجود میں آئی۔ خطابت ہمیشہ دو قسم کے حالات میں ترقی کرتی ہے۔ کبھی تو خوابیدہ قوم اور مغلوب و مقہور لوگوں کا مقدر جاگ اٹھتا ہے اور اس کی تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی ہے، یا جب کبھی جمہوری قسم

کا نظام حکومت برپا ہوتا ہے تو ان حالات میں خطابت پروان چڑھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان حالات میں خطباء جنم لیتے ہیں چنانچہ اسلامی انقلاب نے بھی جلیل القدر خطباء کو جنم دیا۔ یہ خطباء کبھی دین وسیاست کے منبر پر اور کبھی میدان جہاد میں اپنے انقلابی مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔

اسلام کی آمد سے خطابت کے موضوعات اور اسالیب میں نمایاں تبدیلی آئی۔ چنانچہ جاہلیت کی بعض اصنافِ خطبہ متروک ہوگئیں اور بعض نئی اقسام کا اضافہ ہوا، بعض وہ چیزیں خطابت سے نکال دی گئیں جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں چنانچہ تفاخر ومنافرت اور انتقام وغیرہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں لہٰذا ایسے تمام خطبات متروک ہوگئے جن میں منافرت و مفاخرت پائی جاتی تھی۔ ان متروکات کے ساتھ خطابت کی چند نئی قسمیں وجود میں آئیں۔ عہد نبویؐ، خلافت راشدہ اور عہد بنوامیہ میں خطابت عربی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے جس میں لفظی اسلوب بیان کی سلاست وروانی کے ساتھ معنی کی گیرائی، گہرائی اور اثر انگیزی بھی موجود ہے اگرچہ اس زمانے میں خطباء کے ہاں کوئی تحریری اصول وقواعد نہ تھے لیکن قرآن حکیم، احادیث نبویؐ اور خطبات نبوت کے نمونے ان کے سامنے موجود تھے۔ وہ ان سرچشموں سے مستفید ہوتے تھے۔ مسجد نبویؐ میں خطبہ جمعہ اور عیدین کے خطبات امت مسلمہ کا ہفتہ وار معمول بن گیا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری وساری رہے گا۔

چند مشہور خطبائے اسلام:

جس طرح دور جاہلیت میں بعض خطباء بڑے مشہور تھے اسی طرح اسلام میں بھی بڑے عظیم خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خود سرکار دو عالم ﷺ افصح العرب تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے گہرے اثرات پڑے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خطباء کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ انصار مدینہ میں ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ خطیب رسول ﷺ کے لقب سے ملقب تھے، انھوں نے مختلف مواقع پر سرکار دو عالم ﷺ کے خطیب کی حیثیت سے اپنی فصیح و بلیغ خطابت کے جوہر دکھائے۔ ان کے علاوہ سیدنا سعد بن ربیع، سیدنا سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر رضی اللہ عنہم انصار کے خطباء

میں ایک بلند مقام کے حامل تھے، مہاجرین میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف، سیدنا زبیر بن عوام، سیدنا خالد بن ولید، سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا طلحہ بن عبیداللہ، سیدنا نعمان بن مقرن، سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عمرو بن عاص، سیدنا مغیرہ بن شعبہ اور سیدنا عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہم وغیرہ کی خطابت تاریخ کے چند زندہ اور تابندہ لوگوں میں ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی فصاحت و بلاغت میں ایک نہایت اونچے مقام کے حامل تھے۔ ان کے علاوہ سیدنا عبداللہ بن عباس، جریر بن عبداللہ بجلی اور اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم وغیرہ بھی خطابت میں بلند مقام رکھتے تھے۔ سیدنا امیر معاویہ، سیدنا سعید بن عاص، سیدنا حبیب بن مسلمہ الفہری رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نام بھی خطابت کے فن میں بہت نمایاں ہیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس عہد کا ایک سیاسی گروہ جو شعر و ادب اور خطابت میں بھی بہت اہم مقام رکھتا ہے، وہ خوارج کا گروہ ہے، اس گروہ میں بھی بڑے خطیب پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خطابت سے اس گروہ کو مسلمانوں سے الگ رکھا یہاں تک کہ انھوں نے اس گروہ کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

بعض خطباء مختلف شہروں میں وعظ وارشاد کی مجلسوں میں خطبات دیتے تھے جن میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری، سیدنا مسلم بن جندب اور سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہم بہت مشہور ہیں۔

اسلام کے مشہور خطیب

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد دنیائے اسلام میں جو مشہور خطیب ہوئے ان میں سے چند کے نام گذشتہ سطور میں دیئے گئے ہیں، ان میں سے کچھ اور حضرات درج ذیل ہیں:

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مردوں میں سب سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ اور خوبیوں کے علاوہ اپنی خطابت کے لحاظ سے بھی بہت مشہور تھے چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر انصار مدینہ میں آپؓ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ تاریخ اسلام کا ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ اس خطبہ کا پس منظر یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی وفات کے جاں گداز واقعہ کے تھوڑی دیر بعد ایک شخص سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کے پاس یہ خبر لایا کہ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کو اکٹھا کیا ہوا ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہے۔ خبر دینے والے نے یہ بھی بتایا کہ اگر آپ دونوں حضرات کو امت کی مصلحت پیش نظر ہے تو قبل اس کے کہ انصار اس بارے میں کوئی فیصلہ کریں، فوری طور پر وہاں پہنچ جایئے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر رضی اللہ عنہما اور تمام اہل بیت نبوت سرکار دو عالم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے۔ ایک شخص نے دیوار کے پیچھے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو آواز دی اور کہا کہ ذرا باہر تشریف لائیں۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی آواز سن کر فرمایا: ”چلو ہٹو، ہم سرکار دو عالم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہیں۔ ہمیں تمھاری بات سننے کی فرصت نہیں ہے۔ اس شخص نے کہا: ”عمرؓ! غضب ہوگیا، تمام انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں اور قبل اس کے کہ وہ کوئی ایسی بات کر گزریں جو فتنہ یا جنگ کا باعث ہو آپ ان کی خبر لیجئے۔ یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کان میں یہ

بات کہی اور وہ دونوں سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ (فتح الباری: ۷/۲۳)

ایک اور روایت میں ہے کہ امین الامت سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سقیفۂ بنی ساعدہ میں گئے۔ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ مبادا انصار عجلت میں کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت نہ کر بیٹھیں اور بعد میں وہ فتنہ کا سبب اور امت مسلمہ کے لیے یہ عمل مصیبت کا باعث نہ بن جائے۔ یہ دونوں حضرات فوری طور پر سقیفہ بنی ساعدہ روانہ ہو گئے۔ ادھر سے دو نہایت نیک فطرت انصار تشریف لا رہے تھے جنھوں نے مہاجرین کا ذکر کرنے کے بعد سقیفہ میں جمع شدہ لوگوں کی حقیقت بیان کی اور پھر ان دونوں نے سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما سے ان کا ارادہ دریافت کیا۔ یہ دونوں حضرات سیدنا عاصم بن عدی اور سیدنا عقویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہما تھے۔ انصار نے ان کو اپنی مجلس سے نکال دیا تھا اور کہا تھا کہ جو تمھارا ارادہ ہے اس پر یہاں بالکل عمل نہیں ہو سکے گا۔ ان دونوں نے سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر اور سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم کے بھی سقیفہ میں جانے سے روکنے کی کوشش کی کیونکہ انھیں انصار کے جذبات کا علم تھا لہٰذا کہا کہ آپ حضرات اپنا کام کریں، انصار کے اجتماع میں نہ جائیں۔

غرض کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما فوری طور پر سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف لے گئے۔

جب یہ حضرات سقیفہ پہنچے تو دیکھا کہ انصار سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہیں اور بعض انصار رضی اللہ عنہم بھی یہ کہتے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر ان میں سے ہو۔ انصار کا گمان یہ تھا کہ خلافت کا استحقاق ان کا ہے اس لیے کہ انصار نے ان کی نصرت کی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں ٹھہرایا اور آپ کے ساتھ ہو کر اللہ کے دشمنوں سے جہاد و قتال کیا ہے۔ مختصر یہ کہ وہاں مسئلۂ خلافت پر بحث ہو رہی تھی۔ یہ تینوں جب سقیفہ میں پہنچے تو انصار مسئلہ خلافت پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ ان تینوں حضرات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے، سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ باوجود مریض ہونے کے کمبل اوڑھے مجلس کے درمیان بیٹھے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ صاحب کون ہیں؟'' لوگوں نے بتایا: ''یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ تینوں حضرات بھی انصار کے درمیان میں بیٹھ گئے۔ اب سب لوگ حیران تھے کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔'' اس اجتماع کا کیا نتیجہ نکلے

گا؟ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا کیونکہ اب مہاجرین کے بھی تین سربرآوردہ حضرات انصار کے اس اجتماع میں آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ایک تقریر کی، بعض حاضرین نے اس تقریر کی بڑی تحسین کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ کچھ بولیں لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر کہ اے عمرؓ! ٹھہرو انھیں خاموش کر دیا۔ (طبری:۲/۴۴۶)

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس مجلس میں کہنے کے لیے کچھ باتیں سوچ رکھی تھیں چنانچہ جب وہ اپنی سوچی ہوئی باتیں کہنے کے لیے اٹھے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عمر رضی اللہ عنہ! بیٹھ جاؤ، مجھے پہلے بات کر لینے دو۔ پھر تم اگر کچھ کہنا چاہو تو کہہ لینا، شاید ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس لیے روکا کہ ان کی طبیعت جلالی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ طبیعت کے جلال کی وجہ سے کچھ تلخ کلامی کی نوبت آ جائے اور معاملہ بجائے سنورنے کے بگڑ جائے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ موقع نرمی اور بردباری سے کام لینے کا ہے، سختی اور تیزی دکھانے کا نہیں۔ اس وقت معمولی سی چوک اور تیزی اور طرفین میں تلخ کلامی اور درشتی حالات کے دھارے کو یکدم تبدیل کر سکتی تھی اور نبوت کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور محنت کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔

حالات کے نشیب و فراز اور وقت کی کروٹیں بتاتی ہیں کہ اس نازک وقت میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس اصابت رائے، دُور اندیشی، خردمندی اور فرزانگی کا ثبوت دیا، وہ انھی کا حصہ تھا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے امت مسلمہ پر ایک بہت بڑا انعام ہے کہ اس نازک موقع پر مہاجرین کے یہ تینوں سربرآوردہ اور زیرک لوگ انصار کے اس اکٹھ میں تشریف لے گئے اور ان تینوں نے اپنی زیرکی، دانش مندی اور فہم و فراست سے اس نازک مسئلہ کو جس طرح سلجھایا، تاریخ کے اوراق اس کی آج بھی تحسین کرتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انصار کے اس اجتماع میں جو طریقہ گفتگو اختیار فرمایا وہ بھی ایک منفرد طریقہ تھا جس میں طرفین کے مناقب و فضائل کو ذہن میں رکھا گیا اور کسی کی حق تلفی کرنے یا کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

اب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خود اٹھے اور انصار کے اس اجتماع میں جو تقریر فرمائی اس کا اردو

ترجمہ یہ ہے:

''لوگو! ہم لوگ مہاجرین ہیں جو سب لوگوں سے پہلے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ گھر کے لحاظ سے بھی ہم وسط میں ہیں، حسب ونسب میں بھی معزز ترین ہیں۔ سب سے خوب رُو ہیں، تمام عرب میں کثیر النسل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔ ہم تم لوگوں سے پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ قرآن حکیم میں ہمیں تم پر مقدم رکھا گیا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ (التوبہ۹:۱۰۰) یعنی مہاجرین وانصار میں سے سابقون الاوّلون اور جنھوں نے بھلائی کے ساتھ ان کا اتباع کیا، تو ہم ہیں مہاجرین اور آپ لوگ ہیں انصار، دین میں ہمارے بھائی، مال غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمن کے خلاف ہمارے مددگار، آپ لوگوں نے ہمیں پناہ دی اور ہمارے ساتھ ہمدردی کی، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ سو ہم امراء ہیں اور آپ وزراء ہیں۔ عرب اس قبیلۂ قریش کے علاوہ کسی کی اطاعت قبول نہیں کریں گے۔ آپ کو اپنے مہاجر بھائیوں سے اس نعمت میں مقابلہ نہیں کرنا چاہیے جو انھیں اللہ نے دی ہے۔ ہم اللہ کے گھر والے ہیں، ہمارے گھر بیت اللہ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین رشتہ رکھتے ہیں۔ مسئلۂ خلافت کے لیے اگر خزرج نے ہاتھ پاؤں مارے تو اوس بھی اس سے پیچھے نہیں رہیں گے اور اگر اوس نے خلافت کے لیے کوشش کی تو خزرج والے پیچھے نہیں رہیں گے۔ ان دونوں قبیلوں کے مقتول اور زخمی بھی تھے جنھیں فراموش کرنا یا ان کو ردّ کرنا ممکن نہیں۔ تو اب اگر آپ میں سے کسی نے آواز نکالی تو گویا اس نے خود کو شیر کے جبڑوں میں دے دیا۔ مہاجرین اسے نگل جائیں گے اور انصار اسے نوچ ڈالیں گے۔''

(البیان والتبیین:۳/۲۹۷، عیون الاخبار:۲/۲۳۳، العقد الفرید:۴/۲۵۸)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں سے دوسرے خلیفہ تھے، انھوں نے دنیا میں سب سے پہلے اسلامی فلاحی مملکت قائم فرمائی۔ اسلامی فلاحی مملکت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے، وہ کم سے کم ہو اور دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرتکز ہو کر نہ رہ جائے بلکہ پورے سماج میں اس کی گردش ہو جیسے خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ اس اصول کو قرآن حکیم نے چند الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر۵۹:۷)

''تاکہ ایسا نہ ہو کہ دولت تمھارے صاحب ثروت لوگوں کے درمیان ہی چکر کھاتی رہ جائے۔''

شعر وشاعری اور خطابت میں بھی آپ کو ایک بلند مقام حاصل تھا۔ آپ خود تو بہت کم شعر کہتے تھے لیکن عرب کے مشہور شعراء کا کلام آپ کو کثرت سے یاد تھا اور ہر بڑے شاعر کے بارے میں آپ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے تھے، فن شعر اور خطابت میں آپ کو ایک خاص مذاق حاصل تھا، جاحظ نے لکھا ہے:

((كان عمر بن الخطاب اعلم الناس بالشعر)) (البیان والتبیین:۱/۹۷)

''یعنی سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے دور میں علم شعر کے سب سے بڑے عالم تھے۔''

زہیر کو آپ تمام شاعروں سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اگرچہ بعض حضرات امراء القیس اور نابغہ کو بڑا شاعر سمجھتے تھے لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک زہیر سب سے بڑا شاعر تھا کیونکہ وہ نامانوس الفاظ کی تلاش میں نہیں رہتا، اس کے کلام میں اغلاق نہیں اور اسی مضمون کو وہ شعر میں سموتا ہے جس سے وہ آشنا ہوتا ہے۔ جب وہ کسی کی تعریف یا مدح کرتا ہے تو اس کے انھی اوصاف کو بیان کرتا ہے جو واقعی اس میں ہوتے ہیں۔

زہیر کے بعد آپ نابغہ کے فضل وکمال کے معترف تھے اور اس کے بھی اکثر اشعار آپ کو ازبر تھے۔ آپ اسے ''اشعر العرب'' کہا کرتے تھے اور زہیر کو ''اشعر الشعراء'' فرماتے تھے۔ ان دونوں شاعروں کے علاوہ آپ امراء القیس کے بھی بڑے معترف تھے۔ ایک مرتبہ

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ نے امراء القیس کے بارے میں فرمایا:

"وہ سب سے آگے ہے اور اسی نے شعر کے چشمہ سے پانی نکالا، اس نے اندھے مضامین کو بینا کر دیا۔"

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اچھے شعر سنتے تو اس کو بار بار پڑھتے اور صحیح مزہ لیتے۔ یہ بات بھی ان کے ذوق شعر کی پختگی پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ آپ امور خلافت میں دن رات مشغول رہتے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کو بہت سے اشعار حفظ تھے اور جب بھی کسی معاملہ کا فیصلہ فرماتے تو ضرور کوئی نہ کوئی شعر بھی پڑھتے۔ آپ کو چونکہ شعر کا ذوق بہت زیادہ تھا اس وجہ سے چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی اشعار کو یاد کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ:

"لوگوں کو اشعار یاد کرنے کا حکم دو کیونکہ وہ بلند اخلاق، صحیح رائے اور انساب کی معرفت کی طرف راہ دکھاتے ہیں۔"

ایک اور خط میں سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ:

"دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرو، سنت نبویؐ سے آشنائی حاصل کرو، عربی زبان سیکھو اور سمجھو اور ابوالاسود الدوئلی سے کہو کہ اہل بصرہ کو عربی قواعد سکھائیں۔"

(انباہ الرواۃ علی انباء النحاۃ: ۱/۱۶)

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ہی کے نام ایک اور خط میں لکھا:

"اہل بصرہ کو تاکید کرو کہ عربی سیکھیں۔ ایسا کرنے سے ان میں صحیح بول چال کا طریقہ پیدا ہوگا۔ ان کو عربی اشعار پڑھنے اور دوسروں کو سنانے کی بھی تلقین کرو، ایسا کرنے سے ان میں اخلاق عالیہ پیدا ہوں گے۔" (کنز العمال: ۵/۲۴۱)

اس زمانہ میں جتنے اہل کمال شاعر اور خطباء وغیرہ تھے سب آپ کی بارگاہ خلافت میں آئے اور آپ کی قدردانی سے مستفید ہوئے۔ اس میں سب سے بڑا شاعر متمم ابن نویرہ تھا جس کے بھائی کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے غلطی سے قتل کر دیا تھا۔ بھائی کے اس قتل سے اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ہمیشہ رویا کرتا اور مرثیے وغیرہ کہا

کرتا۔ گلی کوچوں میں نکل جاتا۔ مرد وزن اس کے گرد جمع ہو کر اس سے مرثیے سنتے رہتے۔ مرثیہ پڑھتے وقت وہ خود بھی روتا جاتا اور سننے والوں کو بھی رلاتا۔ ایک مرتبہ وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اسے مرثیہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے چند اشعار پڑھے جس سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بہت محظوظ ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے متمم سے کہا کہ اگر مجھ کو ایسا مرثیہ کہنا آتا تو میں اپنے بھائی زید بن خطاب رضی اللہ عنہ کا مرثیہ کہتا: متمم بن نویرہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جواب میں کہا:

''امیر المومنین! اگر میرا بھائی آپ کے بھائی زید رضی اللہ عنہ کی طرح شہید ہو کر مارا جاتا تو میں ہرگز اس کا مرثیہ نہ کہتا اور نہ ہی اس کا ماتم کرتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ''متمم بن نویرہ نے جیسی میری تعزیت کی کسی اور نے ایسی تعزیت نہیں کی۔''

اس دور میں خنساءؓ نامی ایک بڑی مرثیہ گو شاعرہ تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بیت اللہ میں روتے اور چیختے دیکھا۔ پاس جا کر آپ نے اسے تسلی دی اور جب اس کے چار بیٹے جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے تو آپ نے چاروں کے وظیفے اس کے نام جاری کر دیئے۔ اصبہانی نے اس شاعرہ کے حالات کتاب الاغانی میں لکھے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں یہ عورت اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سوق عکاظ میں اس کے خیمے کے دروازے پر ایک علم نصب ہوتا تھا جس پر لکھا ہوتا ''ارثی العرب'' یعنی تمام عرب میں سب سے بڑھ کر مرثیہ گو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اچھے شعر، اچھے شاعر اور ایک ماہر خطیب کی بڑی قدر فرماتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خطابت کی تاریخ میں بھی ایک نمایاں اور اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ احمد الاسکندری نے لکھا ہے:

((كان رحمه الله من ابين الناس منطقا وابلغهم عبارة، واكثرهم صوابا وحكمة، وارواهم للشعر، وانقدهم له.))

(البیان والتبیین: ۲۸۹/۳)

''وہ اپنے بیان میں سب سے زیادہ واضح انداز والے، بلیغ ترین عبارت والے،

سب سے زیادہ حکمت وصواب ان کے کلام کی خوبی تھی، شعر پر سب سے گہری ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔"

ابن رشیق القیروانی انھیں "انقد اھل زمانه للشعر" لکھتا ہے۔ کتب ادب وتاریخ میں ان کی فصاحت و بلاغت اور کمال خطابت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

((لکل شئی راس وراس المعروف تعجیله .))

(البیان والتبیین: ۳/۲۹۹)

"یعنی ہر شے کی ایک روح ہوتی ہے اور نیکی کی روح یہ ہے کہ اس میں عجلت سے کام لیا جائے۔"

جاحظ نے ایک اور مقام پر لکھا ہے:

"آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی معاملات پر نظر رکھتا ہے، اس لیے ان سے کماحقہ عہدہ برآ ہوتا ہے، دوسرا توکل پسند انسان ہے جو قبل از وقت نہیں دیکھتا لیکن مشکل آن پڑے تو اہل عقل وفکر سے مشورہ کرتا ہے اور ان کی رائے کو قبول کر لیتا ہے۔ تیسرا آدمی وہ ہے جو حیرت میں بھٹکنے والا ہے، نہ تو وہ عقل کی بات مانتا ہے اور نہ کسی راہ نما کی سنتا ہے۔"

(البیان والتبیین: ۳/۲۹۹)

غرض کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک بہترین خطیب اور شعری شوق وذوق کے حامل تھے اور آپؓ کا ہر خطبہ فصاحت و بلاغت کا مرقع ہوتا تھا، چنانچہ ایک خطبہ میں آپؓ نے فرمایا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"لوگو! ایک وہ وقت تھا جب میں یہ گمان کیا کرتا تھا کہ جو بھی قرآن حکیم پڑھتا ہے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے ہاں سے اجر وثواب ہوتا ہے۔ البتہ اب مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ قرآن حکیم پڑھتے ہیں مگر اس کا اجر لوگوں سے مطلوب ہوتا ہے۔ غور سے سنو! تلاوت قرآن حکیم سے تمھارا مطلوب ومقصود صرف اور صرف اللہ کی ذات ہونی چاہیے کیونکہ ہم تمھیں اس وقت تو

پہچان لیتے تھے جب نزول وحی کا سلسلہ جاری وساری تھا اور سرکار دو عالم ﷺ ہم میں موجود تھے لیکن وحی کا سلسلہ تو ختم ہوگیا اور اللہ کے رسول ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو چکے، اس لیے اب میں جو کچھ تم لوگوں سے کہوں گا اسی سے ہی تم مجھے پہچانو گے۔ ہاں تو جو ہمارے سامنے بھلائی اور نیکی کا اظہار کرے گا ہم اس کو نیک اور بھلا سمجھیں گے اور اس کی تعریف اور ستائش کریں گے اور جس نے ہمارے سامنے بدی کا مظاہرہ کیا ہم اسے بد اور برا ہی سمجھیں گے اور اس سے اظہار نفرت کریں گے۔ سنو! اپنے نفوس کو ان کی خواہشات سے روکتے رہا کرو کیونکہ یہ اپنی ہوا وہوس اور خواہشات کی جانب شدید میلان رکھتے ہیں، اگر تم انھیں باز نہ رکھو گے تو یہ تمھیں بدترین منزل تک گھسیٹتے چلے جائیں گے۔ حق تو بوجھل لگتا ہے مگر نتائج کے لحاظ سے خوشگوار اور اچھا ہوتا ہے مگر باطل ہلکا پھلکا اور خفیف ہوتا ہے لیکن نتیجے کے لحاظ سے بہت گندہ اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔ توبہ کی ضرورت پڑنے سے بہتر یہی ہے کہ گناہ ہی ترک کر دیا جائے۔ بعض اوقات ایک نظر بھی شہوت کا باعث بن جاتی ہے اور لمحہ بھر کی ہوس رانی طویل رنج وغم کا شکار بنا دیتی ہے۔“

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم رضی اللہ عنہ کے تیسرے خلیفہ تھے۔ فصاحت و بلاغت اور خطابت میں ان کا بھی ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ کتابوں میں آپ کے فرامین اور مکتوبات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کے الفاظ کی فصاحت اور کلام کی بلاغت پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے۔ آپ نے اپنے ایک خطبہ میں نہایت بہترین اسلوب اور فصیح و موثر الفاظ میں دنیا کی بے ثباتی کو یوں بیان کیا ہے:

((ایها الناس! ان بعض الطمع فقر وان بعض الیاس غنی، انکم تجمعون، مالا تاکلون، وتاملون مالا تدرکون، وانتم موجلون فی دار غرور.)) (طبری:۳/۱۴۷)

''اے لوگو! بعض طمع اور حرص فقر واحتیاج ہے اور بعض نا امیدی اور یاس تونگری ہے اور بے شک تمھاری حالت یہ ہے کہ تم ایسی اشیاء کو جمع کرنے کے پیچھے لگے ہوئے ہو جن کو تم کھا نہیں سکتے اور نہ ان سے فائدہ ہی اٹھا سکتے ہو اور ایسی امیدیں باندھتے ہو جو پوری نہیں ہوسکتیں۔ حالت یہ ہے کہ تم ایک خاص وقت تک کے لیے دھوکے کے گھر میں چھوڑے گئے ہو۔''

آپ کو شعر وشاعری سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ آپ کو اشعار اس کثرت سے ازبر تھے کہ موقع ومحل کی مناسبت سے دو دو اور پانچ پانچ اکٹھے پڑھ جاتے تھے۔ (طبری:۳/۱۴۷)

مسعودی کا بیان ہے:

((کان عثمان رضی اللہ عنہ کثیرا ماینشد ابیاتا قالها ویطیل ذکرها لا تعرف لغیره.))

''یعنی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس کثرت سے اشعار پڑھتے جتنا اور کوئی نہ پڑھتا ع

لفنی اللذاذة ممن قال صفوتها
من الحرام ویبقی الاثم والعار
یلقی عواقب سوء من مغبتها
لاخیر فی لذة من بعدها النار

(مروج الذہب:۲/۳۵۶)

''جو شخص حرام چیزوں سے لذت اور لطف حاصل کرتا ہے اس کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان اشیاء کی لذت تو فنا ہو جاتی ہے لیکن اس کا گناہ اور ننگ و عار باقی رہ جاتے ہیں۔ حرام کی لذت غائب ہو جانے کے بعد اس کے برے نتائج وعواقب فنا نہیں ہوتے تو پھر اس لذت کا کیا فائدہ جس کا انجام جہنم کی آگ ہو۔''

غرض کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا اسلوب بیان نہایت فصیح و بلیغ تھا اور شعر وشاعری میں بھی آپ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے

نام کئی خطوط اور گشتی مراسلے تحریر فرمائے جن سے آپ کے سیاسی شعور، بلند فکری، ژرف نگاہی اور قلبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور جہاں تک آپ کے خطبات کا تعلق ہے آپ کو خطبات میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں آپ کے جس قدر خطبات ملتے ہیں، ان کے ایک ایک حرف سے آپ کی علمی قابلیت، فصاحت و بلاغت اور زور خطابت کا پتہ چلتا ہے اور یہ جو بعض ناہنجار لوگوں نے لکھ دیا ہے کہ آپ تقریر و خطابت میں کمزور تھے اور آپ نے خلیفہ بننے کے بعد جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس میں دورانِ تقریر آپ کانپنے لگے اور فرمایا:

((ایھا الناس! انا اول مرکب صعب، وان اعش فستاتیکم الخطبة علی وجھھا .))

''یعنی اے لوگو! بے شک پہلی دفعہ سوار ہونا مشکل ہوتا ہے، اگر میں زندہ رہا تو آئندہ تمھارے سامنے ٹھیک طور پر خطبہ دوں گا۔''

یہ کسی ایسے شخص کا قول ہے جس کا قلب بغض عثمان رضی اللہ عنہ سے بھرا ہوا ہے، وگرنہ یہ بات اتنی ہی غلط ہے جتنی یہ کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اصول جہان بانی سے نا آشنا تھے یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بات صرف صاحب ''العقد الفرید'' نے کہی ہے:

((ولکن لم ار باسناد تسکن النفس الیه .)) (البدایہ والنہایۃ: ۷/۱۴۸)

''یہ روایت کسی ایسی سند کے ساتھ میری نظر سے نہیں گزری جس سے تسکین قلب حاصل ہو۔''

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں احمد الاسکندری نے کہا ہے:

((کان رحمه الله من بلغاء الخلفاء، واوجزھم لفظا، واجزلھم معنی، واسھلھم عبارة .)) (البیان والتبیین: ۱/۲۰۶)

''وہ بلیغ خلفاء میں سے تھے۔ ان کے الفاظ کم اور معنی عظیم ہوتے تھے اور ان کا اسلوب عبارت آسان ترین ہوتا تھا۔''

جب شورش پسند اور باغی انھیں شہید کرنے کے لیے سرکشی پر اتر آئے تو شہادت سے

قبل آپ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

''ہر قوم کی ایک آفت ہوتی ہے اور ہر نعمت کے لیے انجام کار زوال ہوتا ہے۔ اس امت کی آفت وہ عیب جو، طعنہ زن اور بدخواہ منافق ہیں جو اظہار تو ان باتوں کا کرتے ہیں جنھیں تم پسند کرتے ہو لیکن ان کے دلوں میں وہ زہر چھپا ہوتا ہے جسے تم مکروہ سمجھو گے۔ یہ آوارہ، اوباش اور شتر مرغ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جونہی کوئی کوا کائیں کائیں کرتا سنتے ہیں، اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو جو بات میری طرف سے ناگوار معلوم ہوئی ہے، وہی بات انھیں عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ناگوار لگی تھی مگر عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں لگام دے کر ان کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اللہ کی قسم! میں قریب ترین مددگار بھی رکھتا ہوں اور افراد خانہ کی کثیر تعداد بھی، میرے پاس فاضل دولت کی بھی کمی نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنی اس فاضل دولت کو بھی اپنی مرضی سے نہیں خرچ کر رہا یعنی میں طاقت اور دولت سے ان فتنہ پردازوں کو زیر کر سکتا ہوں مگر اپنی خاطر امت مسلمہ کا خون بہانے کے بجائے مظلومیت اور شہادت کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔'' (البیان والتبیین: ۱/ ۳۷۷)

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو آپ نے اس وقت جو خطبہ دیا وہ بھی آپ کے فن خطابت میں ماہر ہونے کی ایک بین دلیل ہے۔ آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''لوگو! تم اپنی باقی زندگیاں دار قلعہ (یعنی مدینہ منورہ جو شیطانی دست رس سے محفوظ و مصئون ہے) میں گزار رہے ہو چونکہ ساز ہستی کا تار ٹوٹنے والا ہے لہٰذا جس نیکی اور بھلائی کرنے پر قدرت حاصل ہے، اس کو اس عالم رنگ و بو میں جس میں تم اپنے شب و روز گزار رہے ہو، جلد از جلد کر لو، کیونکہ دنیا ایک فریب کدہ ہے اور اس دنیا کی زیب و زینت کہیں تمھیں اس کے خم و پیچ میں الجھا کر نہ رکھ دے اور شیطان کے پنجۂ اغوا میں گرفتار نہ کر دے۔ تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کے حالات بد سے عبرت حاصل کرو اور سرمایہ آخرت کی فراہمی میں

کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھو اور غفلت کو اپنا شعار نہ بناؤ۔ ذرا اس کرۂ ارض پر نظر تو دوڑاؤ کہ ابنائے دنیا اور دنیا کی محبت میں منہمک ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھولنے والے لوگ کہاں گئے؟ انھوں نے اس دنیا کی تعمیر و ترقی میں کافی حصہ لیا، بلاد و امصار کو بسایا پھر اپنے خیال میں کافی مدت تک اس سے بہرہ یاب اور لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔ کیا دنیا نے ان کو اپنے سے دور نہیں پھینک دیا؟ تم بھی دنیا کو اسی طرح پھینکو جیسا اللہ رب العزت نے اس کو پھینکا ہے اور ہمیشہ آخرت کی تلاش جاری رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک بہترین مثال سے سمجھایا ہے:

﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا○ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا○﴾ (الکہف ۱۸: ۴۵۔۴۶)

”(اے پیغمبر!) آپ ان لوگوں سے ایک مثال بیان فرما دیں کہ اس دنیوی زندگی کی مثال پانی کی طرح ہے جس کو ہم نے بارش کی شکل میں آسمان سے اتارا۔ پس زمین کی روئیدگی پانی سے مل گئی پھر آخر کار بھوسہ ہو کر رہ گئی جس کو ہوائیں لیے پھرتی ہیں اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ مال اور بیٹے اس دنیوی زندگی کی چند روزہ ٹھاٹھ باٹھ ہیں اور اعمال صالحہ آپ کے رب کے نزدیک بلحاظ ثواب اور جزاء کے بہتر اور اچھے ہیں۔“

(البدایہ والنہایہ: ۷/۱۴۷، الطبری: ۳/۳۰۵)

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حق تعالیٰ شانہ نے تقریر و خطابت میں ایک بلند مرتبہ عطا فرمایا ہوا تھا تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف مواقع پر آپ نے اپنی خطابت سے لوگوں کے پژمردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور قوائے عمل کے اضمحلال کو یکسر دور کر دیا۔ الفاظ کی بندش اور موقع و محل پر اس کا استعمال آپ کی خاص خصوصیات تھیں۔

آپ سے منسوب عربی کی مشہور کتاب "نہج البلاغہ" میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطبات، خطوط اور حکیمانہ اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ اس کتاب کے مولف شریف المرتضیٰ المشہور "بہ علم الھدی" (م ۴۰۶ھ) ہیں لیکن اس کتاب کا اکثر و بیشتر حصہ جعلی ہے اور شیعہ علماء نے اسے وضع کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا ہے اگرچہ شیعہ علماء نے اس بات کی تردید کی ہے لیکن اس بات کو انھوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کتاب کی تالیف کے وقت سے لے کر "نہج البلاغہ" کے بہت بڑے حصے کے متعلق علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد کا یہی خیال تھا کہ اس کا امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف انتساب درست اور صحیح نہیں ہے اور وہ یہ یقین کرتے تھے کہ اس کے مشمولات کو فصحاء شیعہ نے لکھا ہے جن میں خود شریف رضی بھی شریک تھا چنانچہ ابن خلکان نے اپنی کتاب "وفیات الاعیان" میں شریف المرتضیٰ کے احوال میں لکھا ہے کہ:

"لوگوں کو کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں جو مجموعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے کلام کا ہے، اختلاف ہے کہ اسے شریف المرتضیٰ نے جمع کیا یا ان کے بھائی شریف رضی نے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کلام نہیں ہے اور جس نے اسے جمع کیا اور ان کی طرف منسوب کیا، اس نے اسے وضع کیا ہے۔"

(وفیات الاعیان: ۱/ ۴۷۸)

علامہ یافعی نے مرآۃ الجنان (۳/ ۵۵) اور ابن حماد نے شذرات الذہب (۳/ ۲۵۷) میں ابن خلکان کی رائے کی تائید کی ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"جن پر کتاب نہج البلاغہ کے وضع کرنے کی تہمت لگائی جاتی ہے ان کو مختلف علوم میں مہارت تامہ وقویہ حاصل تھی اور جس نے ان کی کتاب نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا ہے اسے یقین ہے کہ یہ کتاب امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نام پر بنائی گئی ہے کیونکہ اس میں کھلا سب وشتم ہے اور دو سرداروں یعنی سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی توہین ہے اور اس میں ایسا تناقض، رکیک باتیں اور عبارتیں ہیں جسے قریش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ کتابت اور گفتگو معلوم ہے اور وہ ان کے بعد کے

لوگوں کے اسلوب کو پہچانتا ہے، وہ یقین کرے گا کہ اس کا بڑا حصہ باطل ہے۔"

(میزان الاعتدال: ۲/۲۰۱، لسان المیزان: ۴/۲۲۵)

مختصر یہ کہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اس کتاب کا اکثر و بیشتر حصہ جعلی ہے اور مولف کتاب نے خواہ وہ شریف المرتضٰی ہو یا سید شریف رضی، خود وضع کر کے شامل کتاب کر دیا ہے لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہایت فصیح اللسان شخص تھے اور خطابت میں نہایت زبان آور اور قادر الکلام تھے۔ ان کے کلام سے حکمت کے سوتے پھوٹتے تھے اور بلاغت کا دریا ان کی زبان سے رواں تھا۔ واعظ ایسے تھے کہ قلب ونگاہ پر چھا جاتے تھے۔ کلام و بیان پر اس درجہ قدرت تھی کہ جس بات کو چاہتے اور جس طرح چاہتے ادا کرتے چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں آپ کی وہ تقریریں جو مختلف مواقع پر آپ نے اپنے فوجیوں اور لشکریوں کو کیں، ان کی تشبیہات اور ندرت بیانی ہمارے اس موقف کی تائید کرتی ہے۔

جہاں تک شعر وشاعری کا تعلق ہے اس میں بھی آپ کو ایک خاص ملکہ اور درک حاصل تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں بھی آپ کے کچھ شعر منقول ہیں جیسے جنگ خیبر میں آپ نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

انا الذی سمتنی امی حیدرہ
کلیث غابات کریہ المنظرہ

لیکن جس طرح نثر میں ایک کتاب "نہج البلاغہ" کے نام سے تالیف کر کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہے، اسی طرح ایک پورا دیوان "دیوان علی" کے نام سے لکھ کر آپ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان اشعار کی زبان ہی اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جیسا فصیح و بلیغ انسان ایسے شعر نہیں کہہ سکتا لیکن لوگ بغیر سوچے سمجھے صرف اس وجہ سے کہ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اشعار ہیں، ان کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں بلکہ بعض مدارس کے کورس میں بھی یہ کتاب ہے۔

احمد الاسکندری نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

((وکان رحمہ اللہ افصح الناس بعد رسول اللہ ﷺ واکثرھم

عـلـمًا وزهدًا وشدة فى الحق ، وهو امام الخطباء من العرب على الاطلاق بعد رسول الله ﷺ .))

''سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بڑے فصیح و بلیغ، سب سے بڑے عالم وزاہد اور حق پرستی میں ثابت قدم تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد خطبائے عرب کے امام تھے۔''

مسند خلافت پر تشریف فرما ہونے کے بعد جمعہ کا دن تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف لے گئے۔ یہ ماہ ذی الحجہ کے اختتام سے پانچ روز قبل کا واقعہ ہے۔ خلیفہ ہونے کے بعد یہ آپ کا سب سے پہلا خطبہ تھا۔ حمد وثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم کو ہادی بنا کر نازل فرمایا اور اس میں خیر وشر کو واضح طور پر بیان فرمایا۔ پس تم لوگ خیر کو اختیار کرو اور شر سے بچو۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی اشیاء کو حرمت کا درجہ دیا اور اس میں سے بڑی حرمت ایک مسلمان کی ہے اور توحید اور اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق کو مضبوطی سے باندھا۔ چنانچہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے تمام مسلمان محفوظ رہیں مگر یہ کہ احکام شریعت ہی کا تقاضا ہو۔ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو اذیت دے مگر یہ کہ ایسا کرنا واجب اور ضروری ہو۔ عوام اور خواص کے حقوق کی ادائیگی میں عجلت سے کام لو کیوں کہ موت سر پر کھڑی ہے۔ پس لوگ آپ کے سامنے ہیں اور پیچھے قیامت ہے جو آگے بڑھ رہی ہے۔ اپنے آپ کو علائق دنیا سے ہلکا پھلکا رکھو تا کہ منزل تک آسانی سے پہنچ سکیں۔ آخرت لوگوں کے لیے چشم براہ ہے۔ اے اللہ کے بندو! اللہ کے بندوں اور ان کی سرزمین کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تم سے قیامت میں ہر چیز کے بارے میں سوال ہوگا حتیٰ کہ بہائم (جانوروں) اور زمین کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔ جب تم خیر کا کام

دیکھوتو اس کوفوراً اختیار کرلو، اور جب شر اور معصیت کا کام دیکھوتو اس سے فوراً کنارہ کش ہو جاؤ۔ (اس کے بعد آپ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی):

﴿وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝﴾ (الانفال:۲۶)

'اور تم اس وقت کو یاد کرو جب تم زمین (مکہ مکرمہ) میں تھوڑے تھے اور کمزور اور ضعیف سمجھے جاتے تھے اور تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک کر نہ لے جائیں، پس اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی مدد سے تم کو تقویت بخشی اور پاکیزہ اور طیب اشیاء تمھیں کھانے کو دیں تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔''

(البدایہ والنہایہ:۴/ ۲۲۷،طبری:۳/ ۴۵۷)

جاحظ نے اپنی کتاب میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خطبہ نقل کیا ہے جس میں آپ نے ایک ضرب المثل اور ایک شعر کو کتنی خوبصورتی سے تضمین فرمایا ہے، فرمایا:

''مشفق عالم تجربہ کار خیر خواہ کی نافرمانی بھٹکنے اور نادم ہونے پر منتج ہوتی ہے۔ اس تحکیم کے بارے میں میں نے تمھیں اپنا حکم دے دیا تھا اور اپنی مخلصانہ رائے واضح کر دی تھی۔ کاش قصیر کا حکم مان لیا جایا کرتا، مگر تم نے جفا کار مخالفوں اور اکڑنے والے نافرمانوں کی طرح میرا حکم نہ مانا حتی کہ مخلص کو اپنی خیر خواہی میں شک ہونے لگا اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، میری اور تمھاری کیفیت ہوازن کے اس شاعر کی سی تھی جس نے کہا تھا کہ میں نے لوی پہاڑ کی ڈھلوان کے پاس انھیں اپنا حکم دے دیا تھا، مگر میرے اخلاص اور خیر خواہی کا علم انھیں اگلے روز چاشت کے وقت ہی ہو سکا۔'' (البیان والتبیین:۲/۵۳)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور خطابت:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت کا بہت بڑا اثر تھا۔ مدینۃ العلم سے آپ کو علم و معرفت کا بہرۂ وافر نصیب ہوا۔

فصاحت و بلاغت میں آپ کو بہت بلند مرتبہ حاصل تھا اور آپ عرب کی خطیبات میں سے شمار ہوتی ہیں۔ آپ کے اقوال لوگوں میں بہت مشہور تھے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

((کل شرف دونه لوم، فاللوم اولی به، وکل لوم دونه مشرف مالشرف اولی به.)) (البیان والتبیین: ۱/۳۰۲)

''وہ شرف جو کمینگی سے حاصل ہوتا ہے اس سے کمینگی ہی بہتر ہے اور ہر وہ کمینگی جس کے ساتھ شرف حاصل ہو تو شرف اس سے بہتر ہے۔''

جاحظ نے لکھا ہے کہ:

''جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''اللہ تعالیٰ آپ کے چہرے کو تر و تازہ کرے اور آپ کے نیک اعمال کی آپ کو جزا دے، آپ نے دنیا کو حقیر سمجھتے ہوئے اس سے منہ موڑ لیا اور آخرت پر دھیان دے کر اسے عزیز و محترم جانا۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ آپ کی جدائی کی مصیبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کی مصیبت کے بعد سب سے بڑی ہے اور ان کی وفات کے بعد آپ کی وفات سب سے بڑا غم ہے لیکن کتاب اللہ یہ وعدہ کرتی ہے کہ آپ کے بارے میں جس صبر اور تعزیت حسن معاوضہ و بدل کا باعث ہے، میں آپ کے متعلق صبر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بدلے کی دعا کرتی ہوں اور آپ کی مغفرت کے لیے اس سے دعا کرتی ہوں، لوگ اگرچہ دنیا کے درپے ہیں مگر آپ کا مطمح نظر تو دین تھا۔ دین کے شعبے ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اسے ڈھیروں صدمات پہنچے ہیں اور اس کے کنارے لرز اٹھے ہیں۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ ایک ایسی ہستی آپ کو الوداع کہتی ہے جو آپ کی طرز زندگی سے بیزار نہ تھی اور آپ کی موت کو حقیر نہیں جانتی۔''

(البیان والتبیین: ۲/۲۰۳، العقد الفرید: ۳/۲۴، نہایت الارب: ۵/۱۶۷)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھٹے خلیفہ راشد تھے۔ انھیں بھی شعر و ادب میں

ایک خاص مذاق حاصل تھا چونکہ آپ کے والدین بھی شاعر تھے، لہٰذا آپ شیریں الفاظ کے بہت شائق تھے اور عرب کی فصاحت و بلاغت کے بہت گرویدہ تھے۔ آپ اشعار اور خطابت کو تہذیب واخلاق کے سنوارنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک روز آپ نے عبدالرحمٰن بن حکم بن عاص سے فرمایا:

''اے میرے بھتیجے! تو شعر گوئی کا بڑا شوقین ہے لہٰذا عورتوں کے ساتھ تشبیب سے بچنا تاکہ کسی شریف عورت کو عار نہ لگے اور ہجو سے بچنا کہ کسی شریف کی بدنامی نہ ہو اور کوئی کمینہ تیرے پیچھے نہ پڑ جائے اور مدح سے بچنا کیونکہ یہ بے حیائی کی روزی ہے، ہاں، اپنی قوم کے مفاخر پر فخر کرنا اور ایسی باتیں کہنا جس سے تیرا نفس مہذب ہو اور دوسرے بھی ادب پکڑیں۔''

(معاویہ،نصولی: ص ۷۷)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے حلیم و بردبار اور دوراندیش تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ فصیح و بلیغ خطیب خلفاء میں سے تھے۔ جدید اور قدیم عرب ماہرین فن خطابت میں انھیں ((اخبر خطباء العرب بالنفسیات)) ''یعنی نفسیات کے ماہرین عرب خطباء'' میں شمار کرتے تھے۔ یزید کی ولی عہدی پر سیدنا مروان بن حکم کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ وہ اس وقت مدینہ کے والی تھے۔ معزول ہو کر دمشق واپس آئے اور غیظ وغضب کے عالم میں بارگاہ خلافت میں تشریف لائے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

''اللہ نے ہر شئے کی ایک اصل بنائی ہے اور ہر بھلائی کا کسی نہ کسی کو اہل بنایا ہے۔ پھر اس نے آپ کو کرامت و بزرگی میں میری اصل بنایا۔ باپ کے رشتہ سے آپ میرے عزیز ہیں۔ میں نے قائد سرداروں کو چنا تو آپ کو بھی چنا اس لیے کہ آپ کرامت اور بزرگی کے سرچشمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اے میرے عم زاد! خوش آمدید، آپ امیرالمومنین کے ہم پلہ ہی ہیں۔ ہر سختی میں ان کا سامان اور سہارا ہیں اور ولی عہد کے بعد آپ ہی کا درجہ ہے۔ میں نے آپ کو اپنی قوم کا سرپرست بنا دیا ہے اور خراج میں آپ کا حصہ بھی بڑھا دیا ہے۔ آپ

کے وفد کو انعام بھی دوں گا اور اچھے عطیات بھی۔ امیر المومنین کے ذمہ ہے کہ آپ غنی رہیں اور وہ آپ کی خوشی کا خیال رکھے۔"

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش اور تربیت پانے والے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ فصاحت و بلاغت کے پیکر تھے۔ فصاحت نبویؐ اور بلاغت علوی دونوں میں آپ کو حظ وافر عطا ہوا تھا۔ باپ کی زندگی اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی حسین حیات میں تو آپ کو کوئی خطبہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ طبری نے میدان کربلا میں ان کا ایک خطبہ نقل کیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ سیدنا حسین اونٹنی پر سوار ہو کر میدان کربلا میں تشریف لائے اور انھوں نے عمرو بن سعد کی فوج کو مخاطب کر کے انھیں اپنے بارے میں نصیحت فرمائی۔ آپ جب انھیں یہ سب کچھ فرما رہے تھے تو خیموں میں سے عورتوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے بھتیجے عباس رضی اللہ عنہ اور اپنے بیٹے علی اکبر رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ جا کر انھیں چپ کرائیں پھر جب وہ چپ ہو گئیں تو آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"ذرا تم میرے نام و نسب پر غور کرو اور ذرا دیکھو تو میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھو کہ کیا تمھارے لیے میرا خون بہانا اور میری عزت و حرمت کو پامال کرنا کسی صورت بھی جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبیؐ کا نواسہ نہیں ہوں اور ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا حمزہ سید الشہداءؓ میرے باپ کے چچا اور جعفر طیارؓ میرے چچا نہیں تھے۔ کیا تم نے یہ بات نہیں سنی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ "یہ دونوں نوجوانان جنت کے سردار ہیں"؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچی ہے تو پھر کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی سلطنت میں ابھی وہ لوگ زندہ ہیں، ان سے پوچھ لو (آپ نے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لیے) کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کانوں

سے اس حدیث کو سنا، پھر کیا یہ سب چیزیں تمھیں میرا خون بہانے سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس بات میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسول ﷺ کا نواسہ ہوں اور بخدا! مشرق سے مغرب تک کوئی بھی رسولؐ کا نواسہ میرے سوا موجود نہیں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں میرے درپے ہو؟ کیا کسی مقتول کا بدلہ لینے کو جس کو میں نے قتل کیا ہے؟ یا کسی مال کے سلسلہ میں جس کو میں نے ضائع اور تلف کر دیا ہے؟ یا میں نے کسی کو زخمی کیا ہے جس کا قصاص لینا چاہتے ہو؟''

یہ خطبہ بڑا طویل ہے جو اہل کوفہ نے بڑے آرام سے سنا۔

(پورے خطبہ کے لیے ملاحظہ ہو طبری ۶/۲۴۲، ۲۴۳)

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور خطابت:

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ قریش کے ممتاز خطباء میں سے تھے۔ ان کے والد زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی ایک بہت بڑے خطیب تھے۔ جاحظ نے دونوں باپ بیٹوں کے خطبات کے نمونے نقل کیے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی فصیح و بلیغ تقریر سن کر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

((انکحوا النساء علی آبائھن واخواتھن .))

مروان بن الحکم اور عبدالملک بن مروان کے مقابلہ میں خلافت کے دعویدار ہوئے اور حجاج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ والدہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کی لاش کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ میرا بیٹا زندہ بھی خطیب تھا اور مر کر بھی خطیب ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب، تاریخ اسلام جلد ۲)

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ افریقہ کو فتح کر کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور انھیں واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے بیان کرنے کے اس انداز کو بہت پسند فرمایا۔ اور ان سے کہا کہ کیا آپ عوام کے سامنے بھی اس واقعہ کو بیان کرنا پسند کریں گے۔ انھوں نے کہا: ضرور۔ پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر عوام سے کہا: ''لوگو! تمھیں افریقہ

کی فتح نصیب ہو، اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس کی تفصیل آپ کے سامنے بیان کریں گے۔
اب جو سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنا بیان شروع کیا اور جب خطاب ختم کیا تو ان کے والد زبیر رضی اللہ عنہ اٹھے اور ان کی پیشانی چوم لی اور فرمایا: ''باکمال لوگوں کی اولاد بھی باکمال ہوتی ہے پھر مزید فرمایا:

''اے بیٹے! تم تو خاموش ہونے تک ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان میں بول رہے تھے۔''

(العقد الفرید: ۲/۱۴۹)

احنف بن قیس تمیمی اور خطابت:

احنف بن قیس بنوتمیم کا قائد اور خطیب تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین تھا۔ بلخ اور ہرات اسی کے ہاتھوں فتح ہوئے۔ جسم اور شکل کا کوئی بھدا پن ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہو۔

((ولكنه اذا تكلّم جلى عن نفسه .))

مگر جب بات کرتا تو اپنی شخصیت کو ظاہر کر دیتا یعنی چند لفظوں میں سب کچھ کہہ دیتا تھا
ایک مرتبہ اس نے بنوتمیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

یا بنی تمیم! تحابوا تجتمع كلمتكم، وتباذلوا تعتدل اموالكم وابداوا بجهاد بطونكم وفروجكم يصلح لكم دينكم ولا تغلوا يسلم لكم جهادكم .))

''اے بنوتمیم! اگر تم اتحاد کے خواہاں ہو تو آپس میں محبت کرو اگر اپنے احوال میں اعتدال اور توازن چاہتے ہو تو ایک دوسرے پر خرچ کرو، اگر دین کی اصلاح کے خواہاں ہو تو اپنے پیٹوں اور شرم گاہوں کے خلاف جہاد کرو، خیانت سے ہمیشہ باز رہو تو تمھارا جذبۂ جہاد سلامت رہے گا۔''

ایک مرتبہ ربیعہ اور ازد قبائل کو کہا:

''اے ازد اور ربیعہ کے قبائل! تم ہمارے دینی بھائی ہو، ہم آپس میں شادیوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ نسب میں بھی تم ہمارے سگے بھائی ہو۔ تم ہمارے پڑوسی بھی ہو اور دشمن کے خلاف ہمارے دست و بازو بھی۔ اللہ کی قسم!

از د بصرہ ہمیں کوفہ کے بنو تمیم سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں۔ سو اگر تمھاری عداوت بڑھ گئی ہے اور تمھارے سینوں کی جلن ضد ہی کر رہی ہے تو پھر ہمارے مال و دولت بھی ہماری بردباری کی طرح وسیع ہیں، ان میں ہمارے اور تمھارے لیے بہت گنجائش ہے۔"

سحبان وائل اور خطابت:

عربی زبان کے علاوہ فارسی میں بھی جو خطیب امتیازی حیثیت رکھتا تھا وہ سحبان وائل بن زفر بن ایاد تھا جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا دور پایا۔ اسلام لانے کے بعد وہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ منسلک ہو گیا اور مختلف مواقع پر اپنی آتش بیانی کے جوہر دکھائے۔ ایک دفعہ خراسان سے ایک وفد آیا جس میں سیدنا سعد بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ اس موقع پر سحبان نے جو خطبہ دیا وہ صبح سے لے کر شام تک جاری رہا۔ اس دوران میں نہ تو وہ کھانسا، نہ رکا اور نہ اس کی گفتار کی رفتار میں کوئی سستی یا رکاوٹ آئی۔ آخر میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب کہا کہ ((انت اخطب العرب)) "تو عرب کا سب سے بڑا خطیب ہے۔" تو اس نے کہا تھا کہ ((انا اخطب العرب والعجم)) اس کے ایک خطبہ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"یہ دنیا عارضی گھر ہے اور آخرت تو قرار کی جگہ ہے۔ لوگو! اس گزر گاہ والے گھر سے قرار والے گھر کے لیے کچھ کر لو۔ اس ذات کے سامنے اپنے اسرار کا پردہ نہ چاک کرو جس پر تمھارے اسرار پوشیدہ اور مخفی نہیں رہ سکتے۔ اپنے دل دنیا سے اٹھا لو، اس سے پہلے کہ تمھارے اجسام دنیا سے اٹھا لیے جائیں۔ اس دنیا میں تم رہے لیکن پیدا ایک اور دنیا کے لیے کیے گئے ہو۔ آدمی جب مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ وہ کیا چھوڑ گیا جب کہ ملائکہ کہتے ہیں اس نے آگے کیا بھیجا۔ کچھ آگے بھی بھیجو جو تمھارے کام آئے۔ سب کچھ پیچھے مت چھوڑ جاؤ جو تم پر بوجھ بن جائے۔"

زیاد بن ابی سفیان اور خطابت:

زیاد بن ابی سفیان اپنے زمانے کا ایک بہترین حاکم اور خطیب تھا۔ یہ ایک عرصہ تک خراسان میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا گورنر رہا۔ پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق اور خراسان کا گورنر ہوا۔ زیاد کہا کرتا تھا: ((لو ضاع حبل بینی وبین خراسان لعرفت اخذہ)) ''اگر خراسان کے دور دراز علاقوں میں ایک رسی بھی گم ہو جائے تو میں اس رسی کے چرانے والوں کو پکڑ لوں گا۔ اس کی فصاحت کا یہ عالم تھا کہ جاحظ نے امام شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے جب بھی منبر پر کسی خطیب کی اچھی تقریر سنی، اس خوف سے کہ وہ بعد میں بری تقریر نہ کرے اس کے خاموش ہونے کی دعا کرتا تھا سوائے زیاد کے کہ وہ جیسے جیسے زیادہ بولتا فصاحت کے دریا بہاتا جاتا تھا، زیاد کی فصاحت کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی مانتے تھے حالانکہ ان کے دور میں یہ بالکل نوجوان تھا۔ وہ اپنے ایک خطبے میں حمد وثناء کے بعد کہتا ہے:

> ''سب سے بڑی جہالت اندھی گمراہی اور لوگوں کو جہنم میں لے جانے والی بے راہ روی ہے جس میں تمھارے احمق ڈوبے ہوئے ہیں اور اہل عقل بھی ملوث ہیں۔ بڑی باتوں سے چھوٹی باتیں جنم لیتی ہیں اور بڑی بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ نہ تم نے کتاب اللہ پڑھی اور نہ تم نے وہ ثواب عظیم سنا ہے جو اللہ نے اہل اطاعت کے لیے تیار کیا ہے اور نہ وہ عذاب الیم جانا ہے جو اس نے نافرمانوں کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ اس غیر فانی دنیا میں ہوگا جسے فنا نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی نظر کو دنیا اچھی نہ لگی ہو، ہوس نے اس کے کان نہ بند کیے ہوں اور دائمی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی پر فانی زندگی کو ترجیح نہ دی ہو۔''

جب جلولاء کے مقام پر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو سپہ سالار لشکر ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو فتح کی خوش خبری دینے کے لیے مال غنیمت کا خمس وغیرہ لے جانے والے قافلے میں چند آدمی ساتھ کیے جن میں زیاد بن ابیہ (زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ) جیسا خطیب بھی تھا۔ جب وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو انھوں نے زیاد سے

جنگ کی کیفیت دریافت کی۔ انھوں نے جب واقعہ بیان کیا تو ان کے انداز بیان نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بہت متاثر کیا اور انھیں زیاد کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ ان کی خواہش ہوئی کہ عام مسلمانوں کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دی جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد سے پوچھا: ''کیا یہ واقعہ عوام کے سامنے بھی بیان کر سکتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''جی ہاں۔'' پھر انھوں نے عوام الناس کے سامنے پورا قصہ بیان کیا اور تفصیل سے بتایا کہ کیا قصہ پیش آیا کتنے افراد قتل ہوئے اور کتنا مال غنیمت ہاتھ آیا اور کس طرح فتح حاصل ہوئی۔ زیاد کا انداز اس قدر فصیح و بلیغ تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بول پڑے:

((انہ لھو الخطیب المقنع)) (البدایہ والنہایہ:۳/۱۵۷)

حجاج بن یوسف ثقفی اور خطابت:

مورخین نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف ثقفی دنیا کے جابر حکمرانوں میں سے تھا۔ یہ اموی حکومت کا معمار اور عرب کا ایک عظیم خطیب تھا۔ احمد الاسکندری کا قول جاحظ نے نقل کیا ہے کہ ((کان الحجاج آیة من البلاغة و فصاحة اللسان و قوة الحجة)) یعنی بلاغت فصاحت زبان اور دلائل کے قوی ہونے میں حجاج ایک علامت اور نشانی تھا۔ قرآن حکیم پر نقطے اور اعراب لگوائے، عربی کو سرکاری دفتری زبان بنایا۔ جب وہ عراق کا گورنر بن کر آیا تو نقاب پہنے ہوئے تھا۔ منبر پر نقاب کھولا اور کہا:

''کوفہ والو! مجھے کچھ سر نظر آرہے ہیں جو پک چکے ہیں اور انھیں کاٹنے کا وقت آگیا ہے اور یہ کام میں کروں گا۔ مجھے عماموں اور داڑھیوں کے درمیان بہتا ہوا خون نظر آرہا ہے۔''

اسی خطبے میں حجاج نے کہا:

''اے افتراق و نفاق اور بداخلاقی کے پیکر عراقیو! نہ تو مجھے دبایا جا سکتا ہے اور نہ دھمکایا جا سکتا ہے۔ مجھے بڑی ذہانت اور تجربے کے بعد تلاش کیا گیا ہے۔ امیر المومنین، (اللہ ان کی عمر دراز کرے) نے اپنے ترکش کے تمام تیر اپنے سامنے پھیلائے۔ ان کی لکڑی کو ٹٹولا تو انھیں پتہ چلا کہ میری لکڑی سب سے تلخ

اور مضبوط ترین ہے۔ چنانچہ یہ تیر انھوں نے تمھیں دے مارا ہے۔ مدتوں سے تم فتنہ پردازی میں تیزی دکھاتے رہے ہو۔ بخدا! میں تمھیں لاٹھی کی طرح گھڑ کر سیدھا کردوں گا اور تمھاری کھال یوں اتاروں گا جس طرح کیکر کی چھال اتاری جاتی ہے۔ میں تمھیں اس طرح ماروں گا جس طرح بھاگتے ہوئے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔''

قتیبہ بن مسلم الباہلی اور خطابت:

بنو امیہ کے عہد خلافت میں قتیبہ بن مسلم ایک عظیم سپہ سالار تھے، کئی شہروں کو فتح کر کے اپنی بہادری کی ہیبت اور رعب لوگوں کے دلوں پر بٹھایا، لیکن اس عسکری مہارت کے ساتھ خطابت میں بھی ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ خطابت میں ان کی حاضر جوابی اور جوش بیان اور شعلہ نوائی کو ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک مرتبہ خطبہ کے دوران ان کے ہاتھ سے عصا گر پڑا جسے بدفالی تصور کرتے ہوئے ان کے دوست نہایت غم زدہ ہوئے اور دشمن خوش ہوگئے۔ قتیبہ نے حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے یہ شعر پڑھ کر بات کو اپنے موضوع سے ہٹا دیا:

فالقت عصاها واستقر بها النوى
كما قر عينا بالاياب المسافرا

''سو اس نے عصا رکھ دیا اور اس کی دوری اور جدائی پایۂ اختتام کو پہنچی تو اُسے یوں قرار آ گیا جیسے کوئی مسافر اپنے وطن لوٹ کر آنکھوں کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہے۔''

ایک مرتبہ اہل عراق کو مخاطب کر کے آپ نے ایک خطبہ دیا جس کے چند جملوں کا ترجمہ یہ ہے:

''اے اہل عراق! مجھ سے زیادہ تمھیں اور کون جانتا ہوگا۔ یہ قبیلہ جو بالائی علاقے میں رہتا ہے، یہ لوگ صدقے کے اونٹوں کی طرح منتشر لیکن موٹے تازے ہیں۔ رہے بنو بکر بن وائل تو وہ اس گدھی کی مانند ہیں جو اپنی ٹانگوں کو بھی نہیں سنبھال سکتی۔ رہے بنو عبدالقیس تو وہ بھی جنگلی گدھے کی دم کی طرح

ذلیل ہیں۔ یہ قبیلہ ازد تو اللہ کی مخلوق کے گدھے اور ملی جلی قوم ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر میں برسرِاقتدار آ گیا تو لوگوں کے ہاتھوں پر پہچان کے لیے نشان لگا دوں گا۔ یہ بنو تمیم تو وہ ہیں جو دورِ جاہلیت میں غداری کو ہوشیاری کا نام دیا کرتے تھے۔"

عکرشہ بنت اطرش اور خطابت:

قرونِ اولیٰ کے دور میں بعض خواتین بھی خطابت میں نہایت اعلیٰ مقام رکھتی تھیں جن میں ایک عکرشہ بنت اطرش تھی۔ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطباء میں سے تھی اور علوی افواج کو معرکۂ جنگ میں کود پڑنے پر برانگیختہ کرتی تھیں۔ جنگ صفین کے موقع پر انھوں نے اپنے خطبے میں کہا تھا:

"لوگو! تم اپنی ذات کے ذمہ دار ہو۔ پھر اگر تم راہِ راست پر ہو گے تو تمھیں کسی کی گمراہی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ جنت ایک ایسا مقام ہے جسے وطن بنانے والا وہاں سے کبھی کوچ نہیں کرے گا، وہاں کا رہنے والا کبھی بوڑھا نہ ہوگا اور اس میں داخل ہونے والوں کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ اس جنت کو ایسی دنیا کے بدلے میں خرید لو جس کی نعمتوں کو دوام نہیں، جس کے غم ٹل ہی نہیں سکتے۔ تم ایک ایسی قوم بن جاؤ جسے اپنے دین میں بصیرت حاصل ہو اور اپنے حق کی طلب میں جو صبر سے کام لے کر غالب آ جائیں۔"

یہ تو صرف چند مشہور خطباء کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے ورنہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بہت سے ممتاز اور نامور خطباء پیدا ہوئے اور آج تک پیدا ہو رہے ہیں، بلکہ اسلام کے علمبردار جہاں جہاں بھی پہنچے وہاں بہترین قسم کے خطباء پیدا ہوئے۔ چنانچہ سرزمین اندلس میں ابوالحسن بن شریح اندلسی اور ابوعبداللہ بن فخار اندلسی اور سرزمین مصر میں شیخ محمد عبدہ، جمال الدین الافغانی، سعد زاغلول پاشا، علامہ مصطفیٰ المراغی اور محمد حسین ہیکل جیسے بہترین اور ممتاز خطباء پیدا ہوئے جنھوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی خطابت سے انقلاب پیدا کر دیا۔

نبوت اور خطابت

دنیا میں جتنے نبی اور رسول آئے وہ بہترین خطیب تھے کیونکہ وہ لوگوں کی رشد وہدایت کے لیے اس دنیا میں مبشر (خوشخبری دینے والے) اور منذر (اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے) بن کر آئے۔ وہ اپنے خطیبانہ بیان بلکہ نبوت کی اعجازی شان سے اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی بے نہایت اور بے پایاں رحمتوں کا پیغام دیتے اور اللہ کے باغیوں اور سرکشوں کو اس کے عذاب اور بطش شدید سے ڈراتے۔ اس دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام بھی تشریف لائے ان کے لیے ابلاغ و تبلیغ رسالت اور بلاغ مبین ایک لازمی امر تھا اس لیے یہ سارے الفاظ قرآن حکیم میں انبیاء علیہم السلام کے لیے مختلف سورتوں میں استعمال کیے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے یہ برگزیدہ بندے لوگوں کو یہ بتاتے:

﴿وَ مَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (یٰس ۳۶:۱۷)

یعنی ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اللہ کا پیغام کھول کھول کر اور واضح انداز میں لوگوں تک پہنچائیں۔

اور یہ کام ایک خطیب ہی کر سکتا ہے۔ دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کے پیغام کو اس انداز میں بیان نہیں کر سکتا جس سے لوگ متاثر ہوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے لیے فرمایا کہ......

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ﴾ (الاعراف ۷:۶۲)

یعنی ''میں تو تمھیں اپنے رب کا پیغام کھول کر پہنچاتا ہوں۔''

سیدنا شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ﴾ (الاعراف ۷:۷۹)

''یعنی میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں۔''

اور انبیاء اور رسولوں کا یہی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور پیغام اس کے بندوں تک نہایت وضاحت سے پہنچا دیں تاکہ وہ قیامت کے روز یہ عذر نہ کرسکیں کہ ہمیں تو اللہ کا پیغام ہی نہیں ملا یا اللہ کا پیغام پہنچا ہے لیکن ہم اس کو سمجھ نہیں سکے۔ اس وجہ سے انبیاء علیہم السلام وضاحت سے اللہ کا پیغام اپنی امتوں تک پہنچاتے ہیں۔

چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النحل ۱۶:۳۵)

''یعنی کیا ہمارے رسولوں پر بلاغ مبین (وضاحت سے بات پہنچانا) کے سوا بھی کوئی اور فریضہ ہے۔''

چنانچہ قرآن حکیم اور تورات وانجیل کے مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان خطیبوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو انسانیت تک پہنچانے اور انھیں واضح طور پر ان کے ذہن نشین کرانے کا جو فریضہ انجام دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی تحسین فرمادی ہے یعنی ﴿قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ﴾ (الاعراف ۷:۴۲) یعنی انھوں نے اپنے رب کے پیغام پوری طرح پہنچا دیئے ہیں۔''

سیدنا نوح علیہ السلام اور خطابت:

سیدنا نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول ہیں۔ آپ اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے اور انسانیت کی رشد وہدایت کے لیے اپنی فصاحت وبلاغت کے دریا بہاتے رہے لیکن قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سوائے نیک فطرت لوگوں کے دوسرے سرکش اور اللہ کے احکام سے بغاوت کرنے والے لوگ صراط مستقیم پر نہ آسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کے طوفان نے ان کو ہمیشہ کے لیے اس کرۂ ارض سے نیست و نابود کردیا۔ یہ طوفان ''طوفان نوح'' کے نام سے ایک ضرب المثل ہوکر رہ گیا۔ سیدنا نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم اور ان کی تبلیغ کا سورۃ ہود اور سورۂ نوح میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ ہود کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کے سامنے ''نذیر مبین'' اور ''رسول امین'' ہونے کا اعلان فرمایا، پھر انھیں نہایت فصاحت و بلاغت

سے یہ تلقین فرمائی کہ شرک ایک گناہ عظیم ہے، اس لیے اپنے ہاتھوں سے تراشے بزرگوں کے بتوں جن کے نام ودّ، سواع، یعوث، یعوق اور نسر ہیں کو یک قلم چھوڑ دو اور اللہ وحدہ لاشریک کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اس کے جو احکام میں لے کر آیا ہوں یعنی تقویٰ اور اصلاحِ نفس، ان پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عبدیت کا اظہار کرو لیکن اس سرکش قوم پر ان کی واضح تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے اخلاصِ نبوت میں ڈوبے ہوئے ان خطبات فصاحت و بلاغت کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنی کافرانہ ضد اور تکبر پر ڈٹے رہے اور دلائل نبوت کا جواب معقول طریقے سے نہ دے سکے بلکہ الٹا ان سے تمسخر و استہزاء کرنے لگے۔ جب وہ دلائل نبوت اور سیدنا نوح علیہ السلام کے اعجاز بیان سے لاجواب ہو گئے تو نہایت متکبرانہ لہجہ میں کہنے لگے:

﴿یٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ۝﴾ (ہود ۱۱:۳۲)

''اے نوحؑ! تو نے ہم سے بحث و مجادلہ کیا، تیرا یہ مجادلہ بہت ہو گیا ہے، اب تو جس عذاب کا ہم سے وعدہ کرتا ہے اسے آنے دے اگر تو سچ بولنے والوں میں سے ہے۔''

سیدنا نوح علیہ السلام کے یہ فصیح و بلیغ خطبات اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرمائے۔ چنانچہ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے ایک موقع پر یوں خطاب فرمایا:

﴿قَالَ یٰقَوۡمِ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کُنۡتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ اٰتٰىنِیۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِہٖ فَعُمِّیَتۡ عَلَیۡکُمۡ ؕ اَنُلۡزِمُکُمُوۡہَا وَ اَنۡتُمۡ لَہَا کٰرِہُوۡنَ۝ وَ یٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مَالًا ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ وَ لٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡہَلُوۡنَ۝ وَ یٰقَوۡمِ مَنۡ یَّنۡصُرُنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اِنۡ طَرَدۡتُّہُمۡ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ۝ وَ لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَ لَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ وَّ لَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ لَنۡ یُّؤۡتِیَہُمُ اللّٰہُ خَیۡرًا ؕ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ

اَنْفُسِهِمْ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾ (ہود۱۱: ۲۸ تا ۳۱)

''اے میری قوم! مجھے بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ وہ کھلی اور واضح دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھ پر اپنی رحمت بھی فرما رکھی ہے لیکن وہ تم پر مشتبہ بن گئی ہو تو کیا ہم اسے تم سے وابستہ کر دیں حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ میں اس کے بدلے تم سے کوئی مال نہیں مانگ رہا، کیونکہ میرا بدلہ اور اجر تو صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ ہاں میں اپنی نبوت پر ایمان لانے والوں کو (جنھیں تم رذیل کہتے ہو) اپنے پاس سے دھتکارنے والا نہیں ہوں، وہ تو اپنے رب سے ملنے والے ہیں مگر تم لوگ مجھے جاہل اور اکھڑ نظر آتے ہو، میری قوم کے لوگو ذرا بتاؤ! اگر میں انھیں دھتکار بھی دوں تو اللہ کے غضب سے مجھے بچانے والا کون ہوگا، کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ میں یہ کہوں گا کہ جو لوگ تمھاری نظروں میں رذیل و حقیر لگ رہے ہیں انھیں اللہ کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ ان کے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میں ظالموں میں سے ہوں گا۔''

سورۂ نوح میں سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی خطیبانہ اور مبلغانہ مساعی کو بارگاہ الوہیت میں نہایت اچھے انداز میں بیان فرمایا ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا۝ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا۝ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا۝ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ

لَّکُمۡ اَنۡہٰرًا ؕ﴿۱۲﴾ مَا لَکُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ﴿ۚ۱۳﴾ وَ قَدۡ خَلَقَکُمۡ اَطۡوَارًا ﴿۱۴﴾
اَلَمۡ تَرَوۡا کَیۡفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿ۙ۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الۡقَمَرَ فِیۡہِنَّ
نُوۡرًا وَّ جَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَ اللّٰہُ اَنۡۢبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا ﴿ۙ۱۷﴾ ثُمَّ
یُعِیۡدُکُمۡ فِیۡہَا وَ یُخۡرِجُکُمۡ اِخۡرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ
بِسَاطًا ﴿ۙ۱۹﴾ لِّتَسۡلُکُوۡا مِنۡہَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ (نوح ۷۱: ۵ تا ۲۰)

”نوح نے اپنے رب سے کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات اور دن دعوت حق دی لیکن میری دعوت سے وہ زیادہ دور بھاگتے گئے۔ میں نے جب بھی تیری بخشش کی طرف انھیں دعوت دی تو وہ (میری خطیبانہ آواز کے مقابلہ میں) اپنی آنکھوں میں انگلیاں ٹھونستے رہے اور اپنے آپ کو کپڑوں میں لپیٹ لیا۔ وہ کفر پر اڑ گئے اور بے اندازہ تکبر کا مظاہرہ کیا۔ پھر میں نے انھیں بلند آواز سے دعوت دی۔ علانیہ طور پر تبلیغ کی اور چھپ کر بھی انھیں وعظ کرتے ہوئے کہا کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر زور کا مینہ برسانے والا بادل بھیجے گا، تمھارے مال اور اولاد میں اضافہ کرے گا، تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ سے عزت وسرفرازی کی امید کیوں نہیں رکھتے؟ وہی تو ہے جس نے تمھیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے طبق برطبق سات آسمان پیدا کیے۔ ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا۔ اللہ ہی نے تو تمھیں زمین سے پودوں کی طرح اگایا ہے۔ پھر وہ تمھیں اس مٹی میں لوٹائے گا اور پھر ایک نئی تخلیق کے لیے تمھیں اس میں سے صاف نکال لے گا۔ اللہ ہی تو ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے وسیع فرش بنایا ہے تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلا کرو۔“

پھر سیدنا نوح علیہ السلام کی یہ بددعا تاریخ کے عبرتناک طوفان کی ایک تمہید بن گئی کہ:

﴿وَ قَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾﴾

(نوح ۷۱: ۲۶)

''اور نوح نے کہا: اے میرے رب! زمین پر بسنے والا ایک کافر بھی زندہ نہ چھوڑنا۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور خطابت:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام تمام انبیاء علیہم السلام کے جدامجد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مختلف آزمائشوں میں سے گزار کر تمام لوگوں کا امام بنا دیا۔ وہ ایک بہترین خطیب تھے اور صائب الاستدلال اور قوی الحجت تھے، قرآن حکیم میں ہے کہ جہاں کہیں بھی انھوں نے دعوت حق دی اس کو دلائل سے اتنا مضبوط کر دیا کہ حریف اور مخاطب کے پاس ان کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا اور کافر مبہوت ہو گیا۔ آپ جس گھر میں پیدا ہوئے وہ گھر بت ساز بھی تھا اور بت فروش اور بت پرست بھی لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے اور آپ اپنے مخاطب کو اپنے دلائل سے لا جواب کر دیتے۔ چنانچہ آپ اپنے باپ آذر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

﴿اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۝﴾

''کیا تو بتوں کو اپنا معبود بناتا ہے، مجھے تو تُو اور تیری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا نظر آتی ہے۔'' (الانعام ۶:۷۵)

پھر ایک رات وہ ستارہ پرستوں کو مخاطب کر کے ایسی دلیل سے ان کے نظریہ کا ابطال کرتے ہیں کہ قوم لاجواب ہو جاتی ہے۔ سورۃ الانعام ہی میں یہ واقعہ نقل ہوا ہے کہ:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۝﴾ (الانعام ۶:۷۶تا۷۹)

''تو جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب

ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو اس نے کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو اس نے کہا اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہوگیا تو کہنے لگا اے میری قوم! بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو۔ بے شک میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ایک (اللہ کی) طرف ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔"

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ پھر رات کو ستارے کی چمک دمک دیکھ کر کہا کہ کیا یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ ستارہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا پھر چاند اور سورج کو جب دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان کی چمک دمک اور روشنی ستاروں سے بڑھ کر ہے مگر یہ بھی آخر کار ڈوب جاتے ہیں، اس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ یہ ڈوبنے والے معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟ پس اس موحد اعظم علیہ السلام نے شرک سے اپنی بریت کا اعلان کر دیا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پہلے شرک میں مبتلا تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے تعریضاً قوم کو سمجھایا کہ تم ان ڈوبنے والے ستاروں اور سیاروں کو میرا خدا بنانا چاہتے ہو ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ان کی بریت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس ذات کے سپرد کر دیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو نیست سے ہست کیا، میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا ماننے والا ہوں، مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ (اور ان کی قوم نے ان سے جھگڑا کیا تو آپ نے فرمایا) اے میری قوم! تم اللہ وحدہٗ لاشریک کے بارے میں مجھ سے بحث اور جھگڑا کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ میں اس بادشاہ سے نہیں ڈرتا جسے تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، ہاں مگر ہر شئے میں مشیت تو میرے رب ہی کی کارفرما ہے، کیا تم نصیحت نہیں پکڑو گے۔ بھلا میں

اس سے کیوں کر ڈرنے لگا جسے تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے حالانکہ تم لوگ تو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے سے بھی نہیں ڈرتے جس کے بارے میں اس نے تمھارے پاس کوئی مضبوط سند نہیں بھیجی۔"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ خطبہ اس قدر محبوب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی حجت اور دلیل کا مرتبہ عطا فرمایا:

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ﴾ (الانعام ۶:۸۳)

"ابراہیم کا یہ استدلال ہماری حجت اور دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے خلاف عطا کی۔"

اسی طرح سورۃ الشعراء میں بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خطبہ موجود ہے جو سرکار دو عالم ﷺ کے قلب مبارک پر وحی ربانی کے توسط سے اتارا گیا اور پھر لسان نبوت سے جاری ہوا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ○ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ○ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ○ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ○ قَالَ اَفَرَاَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ○ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ○ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ○ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ○ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ○ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ○ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ○ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ○ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ○ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ○ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ○ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ○ مِنْ دُوْنِ

اللّٰهِ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوُوْنَ ○
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ○ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ○ تَاللّٰهِ اِنْ
كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَمَآ اَضَلَّنَآ
اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ○ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ○ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ○ فَلَوْ اَنَّ
لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَّمَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ (الشعراء ۲۶: ۷۰ تا ۱۰۳)

’’جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ انھوں نے کہا ہم کچھ بتوں کی عبادت کرتے ہیں، پس انھی کے مجاور بنے رہتے ہیں۔ کہا کیا وہ تمھیں سنتے ہیں، جب تم پکارتے ہو؟ یا تمھیں فائدہ دیتے، یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا کہ وہ ایسے ہی کرتے تھے۔ کہا تو کیا تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے۔ تم اور تمھارے پہلے باپ دادا۔ سو بلاشبہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے۔ وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔ اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ اور وہ جو مجھے موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اور وہ جس سے میں طمع رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن مجھے میری خطا بخش دے گا۔ اے میرے رب! مجھے حکم عطا کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا۔ اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔ اور مجھے نعمت کی جنت کے وارثوں میں سے بنا۔ اور میرے باپ کو بخش دے، یقیناً وہ گمراہوں میں سے تھا۔ اور مجھے رسوا نہ کر، جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ جس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا۔ اور متقی لوگوں کے لیے جنت قریب لائی جائے گی۔ اور گمراہ لوگوں کے لیے بھڑکتی آگ ظاہر کر دی جائے گی۔ اور ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جنھیں تم پوجتے تھے اللہ کے سوا؟ کیا وہ تمھاری

مدد کرتے ہیں، یا اپنا بچاؤ کرتے ہیں؟ پھر وہ اور تمام گمراہ لوگ اس میں اوندھے منہ پھینک دیے جائیں گے۔اور ابلیس کے تمام لشکر بھی۔وہ کہیں گے جب کہ وہ اس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔اللہ کی قسم! بے شک ہم یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔ جب ہم تمھیں جہانوں کے رب کے برابر ٹھہراتے تھے۔اور ہمیں گمراہ نہیں کیا مگر ان مجرموں نے۔اب نہ ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والے ہیں۔اور نہ کوئی دلی دوست۔تو کاش کہ واقعی ہمارے لیے واپس جانے کا ایک موقع ہو، تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں۔بے شک اس میں یقیناً ایک نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان والے نہیں تھے۔''

اسی طرح قرآن حکیم میں سیدنا ہود علیہ السلام اور سیدنا صالح علیہ السلام کے خطبات بھی منقول ہیں۔

(ملاحظہ ہو سورۃ ہود، سورۃ الشعراء، سورۃ الاعراف وغیرہ)

سیدنا شعیب علیہ السلام اور خطابت:

جاحظ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا شعیب علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''شعیب خطیب الانبیاء''یعنی شعیب تو نبیوں کے خطیب ہیں۔اس لقب کی غرض وغایت جاحظ نے یہ بیان کی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنی کتاب میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان کی باتیں بندوں کے کانوں میں نہایت واضح طور پر سنائی دیتی تھیں۔'' (البیان والتبیین: ۱/۲۰۱،۴/۳۱)

سیدنا شعیب علیہ السلام کو تمام انبیاء علیہم السلام میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے دو قوموں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ان کے علاوہ دو امتوں کی راہ نمائی کا شرف کسی اور پیغمبر کو حاصل نہیں ہوا۔ پہلے انھیں مدین کے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا۔وہاں کے لوگ ناپ تول میں بے ایمانی اور کمی بیشی کرتے تھے۔چیزوں میں آج کل کی طرح ملاوٹ کرتے تھے۔ بیرونی تاجروں سے گھٹیا اور کم قیمت پر مال لیتے اور اس کو اچھے مال میں ملا کر زیادہ قیمت پر فروخت کرتے۔زمین میں فساد برپا کرتے، رہزنی کرتے اور لوگوں کو صراط مستقیم پر چلنے سے روکتے۔ جب ان لوگوں نے اللہ کے نبی کی بات نہ سنی تو عذاب الٰہی نے انھیں نیست و نابود کر

دیا۔ اس کے بعد سیدنا شعیب علیہ السلام کو اہل ایکہ کی طرف بھیجا گیا جو مدین کا دیہاتی علاقہ تھا۔ انھوں نے بھی اللہ کے نبی کی بات نہ سنی لہٰذا وہ بھی عذاب الٰہی میں جلا کر راکھ کر دیے گئے۔

سیدنا شعیب علیہ السلام جس معاشرہ کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے وہ ایک نہایت پیچیدہ معاشرہ تھا۔ کیونکہ جہاں خوش حالی اور مال کی بہتات کے ساتھ بدمستی شامل ہو جائے وہاں انسانیت اور شرافت دم توڑ دیتی ہے۔ چنانچہ اس مشکل اور کٹھن کام کے لیے جس زور بیان، شعلہ بیانی اور فصاحت و بلاغت کی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ارزانی فرمائی تھی۔ چنانچہ خطیب الانبیاء اس معاشرہ کو اپنے زور بیان سے توحید کی دعوت دیتے لیکن ان لوگوں کے گناہوں کی بہتات اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باعث دلوں کی زمینیں بنجر ہو چکی تھیں لہٰذا اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کرنے کے بجائے وہ مخالفت اور عداوت میں روز بروز بڑھتے چلے گئے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کے کئی خطبات میں سے بعض اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں محفوظ کر دیے ہیں جو سرکشوں اور خدا کے باغیوں کے لیے موعظت اور نصیحت کا سرچشمہ ہیں اور عبرت و سبق آموزی کا سامان پیدا کرتے ہیں لیکن جن لوگوں کی من کی دنیا تاراج ہو چکی ہو وہ آج بھی ان خطبات سے عبرت اور موعظت حاصل نہیں کرتے اور اس دور میں بھی ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں، ملاوٹ کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کے خطبات کے لیے ملاحظہ ہو (سورۃ ۸۴ تا ۸۸ الاعراف، ۸۵ تا ۸۶، سورۃ الشعراء ۱۷۶ تا ۱۸۴۔)

﴿وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ○﴾ (الاعراف ۷: ۸۵ تا ۸۶)

”اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم!

اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آ چکی۔ پس ناپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو۔ اور ہر راستے پر نہ بیٹھو کہ دھمکاتے ہو اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو اس کو جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہو۔ اور یاد کرو جب تم بہت کم تھے تو اس نے تمھیں زیادہ کر دیا اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟''

﴿كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡاَيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَيۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ۝ وَمَاۤ اَسۡـَٔـلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ ۝ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ۝ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالۡجِـبِلَّةَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝﴾ (الشعراء ۲۶:۱۷۶ تا ۱۸۴)

''ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب ان سے شعیبؑ نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانتدار رسول ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔ ناپ پورا دو اور کم دینے والوں میں سے نہ بنو۔ اور سیدھی ترازو کے ساتھ وزن کرو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ۔ اور اس سے ڈرو جس نے تمھیں اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔''

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور خطابت:

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بڑے جلیل القدر رسول تھے۔ ان کا لقب کلیم اللہ تھا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے۔ جب یہ مدین سے اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ واپس

آرہے تھے تو راستہ میں انھیں ایک نہایت کٹھن اور بھاری مشن سپرد کیا گیا۔ وہ یہ کہ تاریخ انسانی کے ایک جابر ترین حکمران فرعون کو جو اللہ تعالیٰ کا بھی باغی تھا بلکہ خود ہی دعویٰ ربوبیت کیے ہوئے تھا، اس کو اللہ کے دین کی دعوت دینا اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و جبر اور غلامی سے آزاد کرانا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰىۘ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۹۔۱۰)

یعنی کیا آپ کے پاس موسیٰ کی خبر پہنچی ہے، جب انھوں نے آگ کو دیکھا تو اپنی بیوی سے کہا: ٹھہرو، بے شک میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس سے تمھارے پاس کوئی انگارہ لاؤں یا میں آگ سے راستہ کی کوئی نشانی پاؤں۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین خطیب الانبیاء سیدنا شعیب علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی خدمت کرنے کی مدت پوری کر دی تو وہ ان سے اجازت لے کر مصر کی طرف واپس روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں اور ایک بکری تھی اور عصا تھا جس سے وہ دن کے وقت بکری کے لیے پتے جھاڑتے تھے چونکہ وہ انتہائی سرد موسم تھا۔ جب وہ رات آئی جس میں اللہ تعالیٰ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے مشرف فرمانا چاہتے تھے اور ان کو اپنے کلام سے سرفراز فرمانا چاہتے تھے تو اس رات سیدنا موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول گئے اور انھیں پتہ نہیں چلا کہ وہ کس طرف متوجہ ہوں، چنانچہ انھوں نے ایک آگ دیکھی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل سے کہا کہ تم لوگ ٹھہرو، شاید میں اس آگ سے تمھارے لیے کوئی انگارہ لاؤں یا میں آگ سے راستہ کی کوئی نشانی پاؤں۔ علماء نے لکھا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمھارے پاس انگارہ لے کر آتا ہوں کیونکہ ہوسکتا ہے ان کو جو آگ نظر آئی تھی وہ کوئی اور چیز ہوتی اور وہ اس سے اپنے وعدہ کے مطابق انگارہ نہ لا سکتے۔ تو انھوں نے وعدہ خلافی کے گناہ سے بچنے کے لیے فرمایا: ''شاید میں تمھارے پاس اس سے انگارہ لے آؤں۔'' (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۸۱۰۲)

اس کے بعد قرآن حکیم نے بیان کیا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الوہیت میں

عرض کیا:

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَ یَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَ اَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝﴾ (طٰہٰ ۲۰: ۲۵ تا ۳۱)

”موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے، میرا کام (جو میرے ذمے لگایا گیا ہے اس کو) آسان فرما دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے لیے میرے اہل میں سے ایک وزیر بنا دے میرے بھائی ہارون کو، اس سے میری کمر کو مضبوط کر دے اور میرے مشن میں اس کو میرا شریک کر دے تا کہ ہم تیری بہت تسبیح کریں اور تجھے بہت یاد کریں، بے شک تو ہمیں خوب دیکھنے والا ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا اور ایک سخت مشکل اور کٹھن کام کرنے کا حکم دیا تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے آٹھ چیزوں کا سوال کیا اور آخر میں یہ عرض کیا کہ میں نے آٹھ چیزوں کا اس لیے سوال کیا تا کہ میں تیری تسبیح اور تیرا ذکر زیادہ سے زیادہ کر سکوں۔ ان آٹھ سوالوں میں سے پہلا سوال یہ تھا کہ میرا سینہ کھول دے کیوں حق تعالیٰ شانہ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

﴿وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ﴾ (الشعراء ۲۶: ۱۳)

”اور میرا سینہ تنگ ہے اور میری زبان نہیں چل رہی۔“

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا سینہ کھول دے بلکہ یہ فرمایا کہ میرے لیے میرا سینہ کھول دے تا کہ یہ معلوم ہو کہ اس شرح صدر کا فائدہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو پہنچے گا نہ کہ حق تعالیٰ شانہ کو۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی۔ اسی لکنت کے بارے میں انھوں نے تیسرا سوال یہ کیا کہ میرے لیے میری زبان کی گرہ کھول دیجیے تا کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ زبان کی یہ گرہ بعض کے نزدیک پیدائشی تھی اور بعض کے نزدیک زبان کے جلنے کی وجہ سے

ہوئی۔ روایات میں ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں فرعون کی داڑھی نوچ لی تھی۔ اس سے فرعون یہ سمجھا کہ یہ میرا دشمن بنے گا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ تب ان کی بیوی آسیہ نے کہا: ''یہ بے عقل بچہ ہے اور ایک تھال میں یاقوت اور انگارہ رکھا اور کہا کہ اگر اس نے یاقوت کو اٹھا لیا تو اس کو ذبح کر دینا اور اگر اس نے انگارہ اٹھا لیا تو پھر یہ اس کے بچپن کا تقاضا ہے، اس کو چھوڑ دینا پھر سیدنا جبرئیل علیہ السلام آئے اور انھوں نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ انگارے پر رکھ دیا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اس انگارے کو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ اس وجہ سے ان کی زبان جل گئی اور ان کی زبان میں گرہ پڑ گئی اور ان کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔

(جامع البیان رقم الحدیث:۱۸۱۷۳)

اس گرہ کو کھولنے کا سوال سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے ان وجوہ سے کیا تھا:

- تا کہ فرائض نبوت کی ادائیگی میں خلل واقع نہ ہو۔
- جس شخص کی زبان میں لکنت ہو اس کی بات کو توجہ اور غور سے نہیں سنا جاتا اور اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اور ایک نبی اور رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہترین خطیب ہوتا کہ لوگ اس کی بات کو توجہ سے سنیں اور اس کی دعوت پر غور وفکر کریں۔
- اس لکنت کا دور ہونا اس کا معجزہ تصور کیا جائے کیونکہ اہل مصر کو علم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت ہے اور وہ روانی سے بات نہیں کر سکتے۔ پھر جب وہ روانی سے بات کریں گے تو یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہوگا۔
- اس لکنت کے دور ہونے کے باعث سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مشن آسان ہوگا کیونکہ فرعون ایک نہایت متکبر، مغرور اور سرکش انسان تھا جو اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر سمجھتا تھا اگر اس کے سامنے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اٹک اٹک کر بات کرتے اور لکنت والی زبان سے اپنی دعوت دیتے تو وہ ان سے متاثر ہونے کے بجائے الٹا ان کا مذاق اڑاتا۔

سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ پیغمبری اور رسالت کے منصب کے لیے خطیبانہ فصاحت و بلاغت ایک بنیادی چیز ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے اس سوال کے بارے میں جاحظ نے لکھا ہے کہ:

''سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کی جب انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی حجت واضح کرنے اور اپنے دلائل کو کھول کھول کر بیان کرنے کے لیے فرعون کی طرف بھیجا تو اس وقت انھیں اپنی زبان کی وہ گرہ اور قوت نطق وبیان کی وہ رکاوٹ یاد آئی تو بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: ''اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے اور میرا مشن میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور میرے اپنوں میں سے میرا بھائی ہارونؑ میرا وزیر بنا دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔''

(البیان والتبیین: ۱/۷)

ان آٹھ التجاؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى﴾ (طٰہٰ: ۳۶)

یعنی اے موسیٰ علیہ السلام! تیری یہ دعائیں قبول ہوئیں۔ ایسا اس لیے ہوا کہ آپ وسعت قلب اور فرحت کے ساتھ کار نبوت کو پورا کرنے کے لیے روانہ ہوں۔ اس لیے فرمایا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تمھارا سوال پورا کر دیا۔ جاحظ نے بھی اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ ''اے موسیٰ! تیری دعا قبول ہوئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دونوں دعائیں زبان کی گرہ کشائی اور نبوت ہارون علیہ السلام) قبول فرمائی تھیں۔ فرعون چونکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی گرہ کے بارے میں جانتا تھا اور وہ خود کو صاحب بیان سمجھتا تھا، اس لیے اپنے درباریوں سے کہنے لگا:

﴿اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ﴾

یعنی ''کیا میں اس شخص سے بہتر نہیں ہوں جو حقیر بھی ہے اور قوت بیان سے بھی محروم ہے۔'' (الزخرف ۴۳: ۵۲)

اسی وجہ سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کرنے کی بارگاہ خداوندی میں التجا کی کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ ایک رسول اور نبی کے لیے فصیح اللسان ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر وہ فصیح

اللسان اور صحیح معنوں میں خطیب نہیں ہوگا تو وہ مخاطب کو متاثر نہیں کر سکے گا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام فصیح اللسان تھے اگر چہ ان کے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام ان سے زیادہ فصیح اللسان تھے۔ اسی لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کے بارے میں فرمایا کہ ((ھو افصح منی لسانا)) یعنی وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں۔

جاحظ نے اس بارے میں لکھا ہے۔ ''سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا:

﴿وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ﴾ (القصص ۲۸:۳۴)

کہ میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، اس لیے میرے ساتھ اسے بھی رسول بنا دیجیے تا کہ وہ میری تائید اور تصدیق کر سکے۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ وہ سب میری تکذیب کریں گے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی کہا تھا:

﴿وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ﴾ (الشعراء ۲۶:۱۳)

''اور میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے۔''

اس میں ان کی یہ خواہش پنہاں تھی کہ حجت کو نہایت کھول کر اور واضح طور پر بیان کیا جائے، دلائل کو اچھے اور احسن طریقے سے واضح کیا جائے تا کہ لوگ ان کی طرف زیادہ مائل ہوں اور لوگوں کی عقل میں بات بیٹھ جائے اور ان کے دلوں پر جلدی اثر کرے اگر چہ وہ اپنی حاجت پوری کر سکتے ہوں گے اور کچھ مشقت کے بعد اپنی بات کو ان کے ذہن نشین کر لیتے ہوں گے۔'' (البیان والتبیین: ۱/۷)

جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی زبان کی گرہ دور کر دی گئی تو قرآن حکیم نے ان کے ارشادات کو نہایت خوب صورت اور مختصر جملوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو سورۂ طٰہٰ ۴۸ تا ۵۲، سورۃ الشعراء ۱۸ تا ۲۰ وغیرہ)

﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا

يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى○﴾ (طٰہٰ۲۰: ۴۸ تا ۵۲)

''بے شک ہم، یقیناً ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ بے شک عذاب اس پر ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔ اس نے کہا تو تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی، پھر راستہ دکھایا۔ اس نے کہا تو پہلے زمانوں کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہا ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔''

﴿قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ○ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ قَالَ فَعَلْتُهَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ○﴾ (الشعراء ۲۶: ۱۸ تا ۲۰)

''اس نے کہا کیا ہم نے تجھے اپنے اندر اس حال میں نہیں پالا کہ تو بچہ تھا اور تو ہم میں اپنی عمر کے کئی سال رہا۔ اور تو نے اپنا وہ کام کیا، جو تو نے کیا اور تو ناشکروں میں سے ہے۔ کہا میں نے اس وقت وہ کام اس حال میں کیا کہ میں خطا کاروں سے تھا۔''

سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی خطابت و نبوت کا تذکرہ ان کے عصا کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا کیونکہ عصا کو خطابت سے ایک گہرا تعلق ہے، عرب کے فصیح و بلیغ خطیب عصا کے سہارے خطبہ دیا کرتے تھے بلکہ ان کے ہاں تو عصا کے بغیر خطبے کا تصور ہی نہ تھا لیکن اس سے قبل یہ عصا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں نظر آتا ہے ؏

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

یہ عصا سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں نبوت ملنے سے پہلے بھی ہوتا تھا جو بعد میں پیغمبرانہ خطابت کی علامت اور ان کی نبوت کا اعجاز بن گیا۔

سیدنا داؤد علیہ السلام اور خطابت:

سیدنا داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحب زادے دونوں بادشاہ بھی تھے اور اللہ کے نبی بھی۔ یہ دونوں اقتدار کی عظمت کے ساتھ ساتھ حکمت و دانش اور پیغمبرانہ خطابت سے بھی نوازے

گئے تھے۔ قرآن حکیم نے ان تینوں انعامات کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا داوٗد علیہ السلام کو ارزانی فرمائے گئے تھے چنانچہ فرمایا:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص ۳۸:۲۰)

"اور ہم نے (داوٗد علیہ السلام) کی سلطنت کو مضبوط کر دیا تھا اور انھیں حکمت نبوت سے نوازا تھا اور فیصلہ کن انداز خطاب عطا کیا تھا۔"

جاحظ نے سیدنا داوٗد علیہ السلام کی خطابت کے کمالات بیان کرتے ہوئے اسی آیت کریمہ کی تشریح وتوضیح میں لکھا ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا داوٗد علیہ السلام کی ذات میں حکمت نبوت کے ساتھ عقل اور دانش مندی کا کمال، انتہائی حلم و بردباری، وسعت علم ودانش اور دراست فیصلہ کرنے کی حکیمانہ صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ انھیں جو فیصلہ کن انداز تکلم اور اسلوب خطابت عطا ہوا تھا، اس کے ساتھ اجمال کی تفصیل کرنا، الجھی ہوئی باتوں کو باریک بینی اور دور بینی سے سلجھا دینا، سرعت کے ساتھ قطعی فیصلہ کرنے کا موقع یا مقدمے میں آخری اور فیصلہ کن بات کہنے کے موقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں صاحب نظر وبصیرت بنا دیا تھا۔

"فصل الخطاب" کا لفظ جوان کے بارے میں استعمال کیا گیا ہے اس کی مفسرین نے مختلف تشریحات کی ہیں لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فصل الخطاب سے مراد ایسا انداز بیان ہے جو خالص واضح ہو اور جو مخاطب کو کسی فرق کے بغیر اپنے مقصود کے بارے میں خبردار کر دے۔

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور رسول کو دنیا کی قیادت کے لیے بھیجا تھا لہٰذا ہر نبی اور رسول کو خطابت کا ملکہ بھی عطا فرمایا تھا۔ اس کی خطابت سے لوگ متاثر ہو کر اللہ کے دین اور پیغمبر کی دعوت کو قبول کرتے اور اس پیغمبر اور رسول کے امتی ہونے کا شرف حاصل کرتے۔

افصح العرب ﷺ اور فصاحت و بلاغت

جب ہر نبی اور رسول فصیح و بلیغ اور بہترین خطیب تھا تو سرکار دو عالم ﷺ جو سید الاولین والآخرین تھے اور جن کو تمام خصائص نبوت بدرجہ کمال عطا ہوئے تھے وہ کس قدر فصیح و بلیغ ہوں گے اس کا اندازہ آئندہ کی بحث سے ہوگا۔ فصاحت و بلاغت کا تعلق علم سے ہوتا ہے۔ جاہل شخص کی گفتگو اور تقریر نہ تو فصیح ہوتی ہے اور نہ ہی بلیغ۔ نبی دنیا میں علم لے کر آتا ہے، اس لیے وہ اپنی تمام امت میں فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے درجہ کمال پر ہوتا ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کو چونکہ اولین وآخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا۔ (اوتیت علم الاولین والآخرین) اس وجہ سے آپؐ تمام انبیاء علیہم السلام سے اور تمام عرب میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپؐ کو عملی معجزات کے ساتھ ایک علمی معجزہ (قرآن حکیم) بھی دیا گیا جبکہ کسی دوسرے پیغمبر کو کوئی علمی معجزہ نہیں دیا گیا۔ آپؐ کا علمی معجزہ قرآن حکیم پہلے بھی اور آج بھی اپنے لفظ و معنی کے تمام محاسن اور خصائص کے ساتھ عربوں بلکہ تمام انسانیت کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے اور قیامت تک رہے گا جس کی بحث آگے آرہی ہے۔

فصاحت و بلاغت کا نبوت سے ایک خصوصی تعلق ہوتا ہے کیونکہ ان کے ذمے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام نہایت وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ چنانچہ قرآنی حکیم میں سرکار دو عالم ﷺ کو یہ حکم دیا گیا:

﴿يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ (المائدۃ ۵: ۶۷)

''اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے واضح طور پر (لوگوں کو) پہنچا دیجیے اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا پیغام خداوندی کو

آپؐ نے اچھی طرح نہیں پہنچایا۔"

شاید یہی وجہ تھا کہ خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تین بار یہ فرمایا: ((الاھل بلغت؟)) یعنی کیا میں نے بات کو واضح طور پر پہنچا دیا ہے۔ سب نے اس بات کی گواہی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت خداوندی کو کھول کھول کر اور وضاحت کے ساتھ امت تک پہنچا دیا ہے پھر آپؐ نے فرمایا:

((اللھم اشھد)) "اے اللہ گواہ رہنا۔"

ایک اور مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت کے اس منصب کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (المائدۃ ۵:۹۲)

"(اے لوگو!) جان لو کہ ہمارے رسولؐ کی ذمہ داری اور منصب صرف بات کو واضح طور پر پہنچانا ہے۔"

فصاحت و بلاغت کی حقیقت:

پیشتر اس کے کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت پر مزید بحث کریں ہم فصاحت و بلاغت کی حقیقت واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت ہے کیا چیز؟ تاکہ فصاحت و بلاغت کی صحیح حقیقت قارئین کرام کے ذہن نشین ہو جائے کیونکہ گذشتہ سطور میں یہ الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے معانی لغوی اور اصطلاحی طور پر حسب ذیل ہیں:

بلاغت:...... بلاغت کے لغوی معنی تو وصول اور انتہا کے ہیں۔ بلغ فلان وہ یعنی فلاں اپنی مراد کو پہنچ گیا اور بلاغت کلام یہ ہے کہ الفاظ کے مفردات اور پورا جملہ فصاحت کی شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ مقتضائے حال کے بھی مطابق ہو اور بلاغت متکلم کے اس ملکہ کو کہتے ہیں جس سے انسان ایسا بلیغ جملہ کہنے پر قدرت رکھتا ہو جو فصیح ہونے کے ساتھ ساتھ مقتضائے حال کے بھی مطابق ہو۔

فصاحت:...... فصاحت کے لغوی معنی تو بیان اور ظہور کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس کے معنی یہ بتائے جاتے ہیں کہ فصاحت ایسے ظاہر المعنی اور واضح الفاظ سے عبارت ہے جو

حسن ترتیب کے سبب جلد اپنا مفہوم واضح کرتے ہیں اور ان کا استعمال اہل قلم، ادباء اور شعراء کے ہاں مانوس ہے۔فصاحت کلمہ، کلام اور متکلم تینوں کی صفت ہے اور تینوں کے لیے اس کا مفہوم مختلف ہے۔

کلمہ کی فصاحت یہ ہے کہ وہ تنافر حروف سے پاک ہو اور غرابت سے مبرا ہو۔اس میں کوئی کلمہ مخالفت قیاس اور کراہت فی السمع سے یک قلم پاک ہو۔

فصاحت کلام سے مراد یہ ہے کہ کلام کلمے کی فصاحت کے ساتھ ساتھ ان چھ عیوب سے پاک ہو۔

تنافر کلمات ،ضعف تالیف،تعقد لفظی،تعقد معنوی، کثرت تکرار اور تتابع اضافات سے یک قلم پاک ہو۔

اور متکلم کی فصاحت یہ ہے کہ متکلم اپنے مافی الضمیر کو فصیح کلام کے ذریعے بیان کرنے پر قادر ہو۔

فصاحت و بلاغت میں فرق:...... فصاحت و بلاغت میں فرق یہ ہے کہ فصاحت لفظ کا وصف ہے جب کہ بلاغت الفاظ مع المعانی کا وصف ہے۔اس بنا پر ایسا لفظ جو محض ایک ہی معنی پر دلالت کرتا ہو اور اس سے بہتر لفظ کلام عرب میں موجود اور متداول بھی ہو وہ بلیغ نہیں کہلا سکتا اگر چہ وہ فصیح ہوسکتا ہے۔اس وجہ سے ہر بلیغ کلام فصیح ضرور ہوگا لیکن ہر فصیح کلام ضروری نہیں کہ بلیغ بھی ہو۔

ان دونوں الفاظ کے مفہوم اور ان کی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

آپ ایک سوٹ سلوانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ اس کپڑے کو دیکھیں گے کہ وہ کپڑا کیسا ہے؟ اس کا سوت کیسا ہے؟ کپڑے کا مادہ صحیح ہے کہ نہیں؟ اگر سوت اور اس کا تانا بانا اچھا اور عمدہ ہو تو کہیں گے کہ کپڑا نہایت اعلیٰ اور عمدہ ہے۔یہ کپڑے کی ذات ہے۔گویا یہ کلام کی فصاحت ہے کہ کلام کے اندر الفاظ نہایت بامحاورہ ہوں،لفظوں میں کوئی منافرت نہ ہو کہ کان اس کے سننے سے اکتا جائیں اور کانوں پر اس کا سننا بار گزرے بلکہ ایسا ہو کہ کان میں کلام پہنچا اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا۔گویا کلام کے اندر الفاظ بھی اعلیٰ ہوں،

الفاظ میں کوئی پیچیدگی نہ ہو، ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو، الفاظ میں کوئی منافرت نہ ہو، اتنا سلیس ہو کہ فوراً قلب میں اتر جائے اور اتنا جامع ہو کہ سارے حقائق اور مضامین اس میں چھپے ہوئے اور مضمر ہوں۔ اس کا نام ہے ''فصاحت''۔

بلاغت یہ ہے کہ یہ سوٹ بدن کے مطابق سلا ہوا ہو۔ یہ نہیں کہ کپڑا تو بہت اعلیٰ اور عمدہ ہو لیکن درزی جاہل اور اناڑی تھا۔ اس نے سوٹ نہایت جلدی میں سی دیا۔ جب آدمی اس کو پہن کر نکلا تو لوگ دیکھ کر کہنے لگے: کپڑا تو نہایت عمدہ ہے لیکن وضع قطع اور سلائی نہایت بھدّی ہے۔ سلائی کے بھدے ہونے سے کپڑے کی عمدگی اور خوبیاں بھی غلط ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کپڑے کا بدن کے مطابق ہونا بہ منزلہ ''بلاغت'' کے ہے۔

ان دونوں چیزوں کے علاوہ کلام میں ایک اور خوبی ہوتی ہے جس کا نام ہے ''براعت''۔ وہ یہ ہے کہ آپ کے سوٹ کے لیے کپڑا بھی نہایت عمدہ لیا گیا، سلایا بھی ایک نہایت کاریگر اور ماہر ٹیلر ماسٹر سے جس نے آپ کے بدن کے مطابق اسے سیا۔ اس نے اس کپڑے کے اوپر کوئی نقش ونگار اور رنگین پھول بھی ڈال دیئے جس سے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس کو ''براعت'' کہیں گے۔ اب جو کلام فصیح بھی ہو، بلیغ بھی ہو اور بدیع بھی ہو وہ نہایت اعلیٰ اور عمدہ کلام ہوگا۔ گویا کلام اپنی ذات میں بھی اعلیٰ، سننے والے اور مخاطبین کے مزاج کے بھی مطابق اور اس کے اندر مرصع و مسجع اور مقفّٰی ہونا بھی داخل ہو تو ایسا کلام فصیح بھی ہوا اور بلیغ بھی ہوا اور بدیع بھی ہوا۔ سرکار دو عالم ﷺ کی خطابت ان تینوں خوبیوں سے مزین تھی۔

بلاغت کی قسمیں:

امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ قول بلیغ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کلام فی حد ذاتہ فصیح و بلیغ ہو جس کے لازمی اوصاف تین ہوتے ہیں:

- لغوی لحاظ سے کلام درست ہو۔
- معنوی اعتبار سے اپنے مقصود سے مطابقت رکھتا ہو۔
- اور یہ کلام فی ذاتہ صحیح وصادق ہو۔

قول بلیغ کی دوسری قسم یہ ہے کہ بات کہنے والا بھی بلیغ ہو اور مخاطب پر اس کا اثر بھی ہو تو کلام بلیغ کہلائے گا۔

سرکار دو عالم ﷺ کو جس قول بلیغ کا حکم ہے اس میں بلاغت کی ہر دو قسمیں شامل ہیں۔ (البیان والتبیین: ۲/ ۲۸)

رسول اللہ ﷺ کو جب اسلام کی دعوت دینے کا منصب سپرد ہوا تو فصاحت و بلاغت کے ساتھ حکمت و موعظت اور حسن استدلال کا حکم بھی ہوا۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل ۱۶: ۱۲۵)

''اے رسول! اپنے رب کے راستے کی دعوت دیجئے حکمت اور اچھے وعظ و نصیحت سے اور اگر ان لوگوں کے ساتھ بحث و مباحثہ اور مجادلہ بھی کرنا پڑے تو وہ بھی احسن طریقے سے کریں۔''

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ۝﴾

''بے شک آپؐ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔'' (النحل ۱۶: ۱۲۵)

اس آیت کریمہ میں خطابت کے علاوہ دعوت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو دعوت اور تبلیغ احکام کا حکم دیا گیا۔ آیت کو صیغہ امر ''ادع'' سے شروع کیا گیا۔ یہ چونکہ ایک متعدی فعل ہے لہٰذا اس کے لیے ایک فاعل یعنی داعی اور ایک مفعول یعنی مدعو کی ضرورت ہے پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دعوت کیا دی جائے یعنی کس شئے کی طرف دعوت دی جائے جسے مدعو الیہ کہتے ہیں لہٰذا صیغہ ''ادع'' خطابت کے علاوہ چار اور مقامات کا حامل ہے۔

(۱)......دعوت (۲)......داعی (۳)......مدعو (۴)......مدعو الیہ۔

جب فعل دعوت "ادع" سے ثابت ہے کہ داعی اور مدعو کا ثبوت قدرتی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ کوئی داعی بغیر اپنے مخاطب مدعو کے داعی نہیں کہلا سکتا اور پھر داعی اور مدعو بغیر اس شئے اور دعوت کردہ عمل کے داعی اور مدعو نہیں ہو سکتے اس وجہ سے مندرجہ بالا چاروں مقامات صیغہ ''ادع'' سے ثابت ہو گئے۔

آیت کی مخاطب سب سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ اس لیے اس دعوت کے داعی اولاً رسول اللہ ﷺ ہیں اور پھر امت کے وہ تمام علمائے دعوت و تبلیغ ہیں جو آپؐ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت چونکہ کسی قوم و ملت کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپؐ سارے عالم کے لیے نبی ہیں ﴿إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ اس لیے آپؐ کی دعوت کی مدعو تمام ملل و اقوام ہوں گی جس کو ''امت دعوت'' کہتے ہیں۔ جب اطلاق عام مقصود ہوتا ہے تو مفعول کو لفظوں میں ذکر نہیں کرتے۔ اس سے پتہ چلا کہ آیت میں دعوت کا مدعو کوئی خاص فرد یا قوم نہیں بلکہ دنیا کا ہر وہ فرد ہے جس میں دعوت کو سمجھنے کا مادہ موجود ہے، لہٰذا تمام ملل و اقوام کا مدعو ہونا بھی اس سے معلوم ہو گیا۔ اب رہ گیا وہ پروگرام جس کی طرف دعوت دی جائے تو وہ بھی آیت میں ذکر ہے یعنی "سبیل رب" اللہ کا راستہ۔

مختصر یہ کہ یہ چاروں مقامات دعوت، داعی، مدعو اور مدعو الیہ پھر ان چاروں کے مصداق اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں۔

دعوت کا مقصد:

اب دعوت "سبیل رب" داعی ذات پیغمبر اور ان کے نائبین علماء اور مدعو تمام دنیا کی ملل و اقوام اور اس دعوت کا مقصود ان مدعوین کی اصلاح و ہدایت ہے کیونکہ نفس انسانی کی اصلاح دو چیزوں پر منحصر ہے، علم نافع اور خلق عادل۔ ان دونوں سے اصلاح کی منزل مقصود سامنے آجاتی ہے۔ اسی سے اصلاح کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کو صحیح علم دینا اور اخلاق کی تعدیل کی تربیت دینا یعنی تعلیم و تربیت۔ معلوم ہوا کہ اپنے نفس کی اصلاح کا ذریعہ تو راہ علم و اخلاق کا مجاہدہ ہے اور دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ دعوت و ارشاد اور تبلیغ و موعظت

ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خود عالم باعمل بن کر دوسروں کو عالم وعامل بنانا تکمیل سعادت ہے۔ اس لیے دعوت کا مقصود ہے مدعو کی اصلاح وہدایت اور اس ہدایت واصلاح کا دار ومدار دراصل دعوت کی خوبی، داعی کی قابلیت اور پروگرام کی مقبولیت پر ہے یعنی پروگرام جاذب توجہ ہو جو مدعو کو اپنی طرف کھینچ لے اور پھر داعی کا اسلوب بیان نہایت اعلیٰ، فصاحت و بلاغت سے مملو اور لفظ نہایت شیریں، ملائم اور انجذاب تامہ رکھتے ہوں، جو مدعو کو اپنی طرف کھینچ سکیں گویا کہ

گلہ بھی ان سے جو کرنا پڑا تو از پے شوق
لفظ جو ہم نے لیے چن کے پیارے پیارے لیے

دعوت دل آویز طریقہ سے ہو کہ مدعو کو جانے نہ دے۔ داعی کا کریکٹر معیاری ہو کہ مدعو پر اثر انداز ہو سکے۔

چہارگانہ مقاصد:

اس آیت کریمہ سے دعوت کے پروگرام کے چار حسب ذیل مقاصد ثابت ہوئے۔

- دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہو کہ اس میں مدعوئین تک پہنچنے کی صلاحیت ہو۔
- دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو کے مناسب حال ہو۔
- داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔
- مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبولیت دعوت کا جذبہ موجزن ہو۔

دعوتی پروگرام:

یہ دعوتی پروگرام جس کی طرف لوگوں کو بلایا جائے، مخاطب کے حق میں کوئی طبعی چیز نہ ہو بلکہ ایک القائی شے ہو جسے دعوت وتبلیغ کے ذریعے اس میں ڈالا اور اتارا جائے لیکن اگر وہ چیز مخاطب کی طبیعت میں موجود ہو تو پھر اسے دعوت کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی طرف راہنمائی انسان کی طبیعت خود بخود کرتی ہے خواہ کوئی داعی اور ہادی آئے یا نہ آئے مثلاً کھانا پینا، بولنا چالنا، چلنا پھرنا وغیرہ انسان کے طبعی امور ہیں اور یہ سب امور طبیعت کے تقاضے کے مطابق انسان سے سرزد ہوتے ہیں لہٰذا ان میں کسی ہادی، داعی اور معلم ومبلغ کی قطعاً کوئی

ضرورت نہیں۔

اسی طرح عقلیاتی امور میں بھی دعوت و تبلیغ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ عقل ہر انسان میں تھوڑی بہت موجود ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے عقلیات میں ہر شخص کے لیے رائے زنی کا حق موجود ہے، اس میں تقلید نہیں ہے۔ اسی طرح مسموعات میں بھی دعوت و تبلیغ کی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعوت و تبلیغ صرف ایسے ہی مقاصد کی ہوسکتی ہے جو انسان میں دعوت و تبلیغ ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ علم شرعی ہے جس کو علم الٰہی بھی کہتے ہیں یعنی وہ علم جو خالق سے منقول ہو کر انسان تک پہنچا ہو اور اس علم شرعی کے سوا دوسری تمام چیزیں انسان میں دعوت و تبلیغ سے قبل بھی موجود تھیں۔ معلوم ہوا کہ دعوتی پروگرام کی اولین خصوصیت علم الشرائع ہے جو من جانب اللہ ہو، خلق کی طرف سے نہ ہو اور اگر غور کیا جائے تو اس مدعوالیہ دعوتی پروگرام کی یہ خصوصیت اس آیت دعوت ہی سے نکل رہی ہے کیونکہ آیت میں مدعوالیہ کی تعیین ''سبیل رب'' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور خدا کا راستہ علم تشریع ہے جو اس کے علوم وکمالات اور اخلاق پر مشتمل ہے۔

جب آیت کریمہ میں یہ کہا گیا کہ دعوت و تبلیغ ''سبیل رب'' یعنی اللہ کے راستہ کی کرو اور خدا کا راستہ شرعی پروگرام ہے جو علم الٰہی اور اخلاق ربانی پر مشتمل ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ غیر خدا کے راستہ کی طرف شرعی دعوت مت دو اور غیر خدا کا راستہ وہ طبعی اور عقلیاتی پروگرام ہے جو ہر انسان کی طبیعت سے خود بخود ابھرتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ محدثات و بدعات کی تبلیغ و دعوت جائز نہیں کیونکہ وہ ''سبیل رب'' کا پروگرام نہیں بلکہ سبیل خلق یا سبیل نفس کا پروگرام ہے۔ اس لیے ہر داعی اور مبلغ کو دعوت اور تبلیغ سے قبل اس پر غور و فکر کر لینا چاہیے کہ جس مسئلہ کی وہ دعوت دے رہا ہے وہ شرعی ہے بھی یا نہیں؟ اور آیا شریعت کی مستند اور معتبر کتابوں میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟ کیونکہ کسی مسئلہ کا صرف زبان زد ہوجانا یا مسلم معاشرہ میں رواج پکڑ جانا یا کسی غیر معتبر کتاب میں درج ہو جانا اس کے شرعی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ جب تک کہ ثقہ اور باوثوق اہل علم کی زبان وقلم سے اس کی تصدیق وتائید اور نقل وروایت نہ ہو۔ جن کا رات دن کا مشغلہ شرعیات کی تعلیم اور کتب شرعی میں غور وتفکر ہے

چنانچہ ایک داعی اور مبلغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلی اور سادہ دین کی دعوت دے اور خالص وحی کی تبلیغ کرے کیونکہ مکمل وحی آ جانے کے بعد اختراع کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا کہ بدعات ومحدثات کی تبلیغ جائز رکھی جائے بلکہ صرف اتباع کا درجہ باقی رہ جاتا ہے لہٰذا موضوع اور منکر روایات، اسرائیلیات، من گھڑت قصے کہانیاں جو عموماً پیشہ ور واعظوں کا وطیرہ بن گئی ہیں ''سبیل رب'' کے لفظ سے سب ممنوع قرار پاتی ہیں جن سے ایک داعی کو احتراز کرنا چاہیے ورنہ اس کی دعوت بجائے مفید ہونے کے مضر اور بجائے امن وسکون قائم کرنے کے فتنہ وفساد کا ذریعہ ثابت ہوگی اور امت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی۔ غرض کہ شرعیات کی دعوت وتبلیغ آیت کے منطوق سے ضرور ثابت ہوتی ہے جب کہ غیر شرعیات اور محدثات و بدعات کی دعوت اسی آیت سے ممنوع قرار پاتی ہے۔

دعوتی پروگرام کی خصوصیات:

اس دعوتی پروگرام کی کچھ خصوصیات ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

۱. **سادگی** :...... سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دعوتی پروگرام میں سادگی ہو، تکلف نہ ہو، کیوں کہ ''سبیل رب'' کی دعوت وتبلیغ میں تو صرف نقل کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ غیر سبیل رب کی دعوت کی بنیاد ہی تکلف پر ہوتی ہے کیونکہ محدثات اور بدعات کو بنانا پڑتا ہے جب کہ سنت بنی بنائی ہوتی ہے لہٰذا ایک داعی کو مدعوالیہ میں سادگی اختیار کرنی چاہیے اور ہر قسم کے تکلفات سے احتراز کرنا چاہیے جیسے خاص انداز سے بیان کرنا، بیان کرتے وقت خاص ہیئت بنانا، الفاظ میں قافیہ اور سجع کی رعایت تکلف سے کرنا وغیرہ۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ مَآ اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥﴾ (ص ۳۸: ۸۶-۸۷)

''اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس قرآنی دعوت پر نہ کچھ اجر اور معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ اور تکلف کرنے والوں میں سے ہوں، اس لیے کہ یہ قرآن تو سب جہانوں کے لیے اللہ کا ذکر ہے (اور ذکر میں بناوٹ

نہیں ہوتی)''۔

۲۔ **جامعیت**:...... دوسری خصوصیت اس دعوتی پروگرام کی جامعیت ہے لہٰذا ''سبیل رب'' کا وہ پروگرام ساری ملل واقوام میں پھیلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، کسی خاص وطن یا قوم کے لیے وہ دعوتی پروگرام نہ ہو۔ اس میں ذاتی طور پر عمومیت ہو کہ وہ دوسری ملل واقوام کی طرف منتقل اجتماعی دستور العمل بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ جامعیت صرف اور صرف اسلام کی دعوت میں ہے۔ یہ نہ عیسائیت میں ہے اور نہ ہی یہودیت میں ہے بلکہ خود قرآن حکیم میں ہے:

﴿لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾

''ہر قوم کے لیے ایک ہادی آیا ہے۔''

اس سے یہ پتہ چلا کہ ہر ایک ہادی اپنی قوم کی ہدایت کا ذمہ دار ہے۔ اس کا دعوتی پروگرام اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوم کے لیے نہ تھا۔ چنانچہ ہر نبی کی دعوت اور تبلیغ اسی قوم کے دائرہ تک محدود تھی جس کے لیے وہ ہادی بن کر آیا تھا۔ یہ عمومیت نہ تو عیسائیت میں ہے اور نہ ہی یہودیت میں اگر زبردستی اسے عالم گیر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو خود اپنوں کی نگاہ میں اس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے لیکن ان مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی تعلیمات اپنی ماہیت اور حقیقت کے لحاظ سے ہمہ گیر اور ساری دنیا کے لیے ہیں۔ یہ کسی قوم، ملت اور وطن کی طرف منسوب نہیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ جب عرب قبائل کو دعوت دینے سے فارغ ہوئے تو آپ نے دنیا کے مختلف بادشاہوں کو دین اسلام کے دعوتی خطوط لکھے اور انھیں دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔

فصاحت نبویؐ اور اس کے ترکیبی عناصر

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کا جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ کسی اور پیغمبر کو عطا نہیں فرمایا تھا۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس کے ہاں کمال کا معیار ہی قوت بیان میں فصاحت و بلاغت تھا۔

(البیان والتبیین: ۲/ ۲۸)

تاریخ وسیرت کی تمام کتابوں کو کھنگال لیجیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ آپؐ کی زبان کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں عرب کا کوئی ادیب آپؐ پر حرف گیری نہ کر سکا۔ آپؐ کے دشمنوں میں سے کسی کو بھی آپؐ کی فصاحت و بلاغت میں کوئی عیب نظر نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات دیکھنے یا سننے میں آئی ہوتی تو وہ لوگ اپنی مجلسوں میں اس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے اور اپنی خلوت گاہوں میں اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتے۔ اس سلسلہ میں ان کے خطیب اور شعراء اس کا ضرور تذکرہ کرتے کیوں کہ دنیا کے علم میں یہ بات تھی کہ آپ کے دشمنوں میں خطیب اور شعراء کثرت سے تھے جو آپؐ کے مختلف عیوب کے بارے میں تنقید کی خوردبین لگا کر صبح و شام دیکھا کرتے تھے۔ (البیان: ۲/ ۲۸)

رسول اللہ ﷺ کی فصاحت اور خطیبانہ کمالات کے اگر چہ کچھ دنیوی اسباب بھی تھے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کوئی کام انجام دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے اسباب مہیا کر دیتے ہیں لیکن سب سے بڑا سبب آپؐ کی ذات اور اللہ تعالیٰ کے فیوض و برکات کا تھا۔ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپؐ سے یہ سوال کر ہی دیا کہ ((ما راینا الذی ہو افصح منك)) ہم نے آپؐ سے بڑھ کر اور کسی شخص کو فصیح و بلیغ نہیں دیکھا۔ آپؐ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا:

میری فصاحت میں کیا شے مانع ہو سکتی ہے، قرآن حکیم میری زبان میں نازل ہوا، جو

لسان عربی مبین یعنی منجھی ہوئی عربی زبان میں ہے۔ پھر ایک اور موقع پر فرمایا: میں افصح العرب ہوں کیونکہ میں قریش کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں اور میری نشو ونما قبیلہ بنو سعد میں ہوئی ہے۔ (الشفاء لقاضی عیاض: ۱/۷۷)

طبرانی نے اس بارے میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

((انا اعرب العرب، ولدت في قريش، ونشأت في بني سعد، فاني ياتيني اللحن.)) (طبرانی علی ہامش الشفاء: ۱/۱۷۸)

''میں تمام عربوں سے بڑھ کر بات کو کھول کر بیان کرنے والا ہوں کیونکہ میں قریش میں پیدا ہوا ہوں اور بنی سعد میں میری پرورش ہوئی ہے لہٰذا اب میرے کلام میں لحن کہاں سے آئے؟ یعنی میری فصاحت و بلاغت میں نقص کہاں سے آئے۔''

آپ کی فصاحت و بلاغت میں کمی اور نقص کہاں سے آتا جب آپ ﷺ نے خود فرمایا تھا کہ ((ادبني ربي فاحسن تاديبي)) ''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا ہے اور میری خوب تربیت کی ہے۔''

کسی قبیلہ کا ایک شخص عطیۃ السعدی ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے اس کے قبیلہ کی زبان اور لہجے میں فرمایا:

((ما افناك الله، فلا تسال الناس شيئا فان اليد العليا هي المنطية واليد السفلى هي المنصاة.))

''اگر اللہ تعالیٰ تجھے بے نیاز کر دے تو تو لوگوں سے کچھ بھی نہ مانگنا کیونکہ اوپر والا ہاتھ عطا کرنے والا ہوتا ہے اور نچلا ہاتھ عطیہ لینے والا ہوتا ہے۔''

ہر قبیلہ کی زبان اور لہجہ سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ کم گو بھی تھے اور ''جہیر الصوت'' اور شیریں آواز بھی تھے۔ آپ کی آواز میں وہ شیرینی تھی کہ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر آپؐ کا کلام اور آپؐ کے خطبات سنتے تھے اور بلند آواز اتنے تھے کہ دور بیٹھے ہوئے

لوگ بھی آپ ؐ کو بخوبی سن لیا کرتے تھے۔ چنانچہ سیدہ ہانی رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں:

((کنا نسمع قراۃ النبی ﷺ فی جوف اللیل عند الکعبہ وانا علی عریشی .)) (الخصائص الکبری للسیوطی:۱/۲۶)

"ہم رسول اللہ ﷺ کو آدھی رات کے وقت کعبہ کے پاس قرأت فرماتے ہوئے آپ کی قرأت کو سن لیا کرتے تھے جب کہ ہم اپنے مکان کی چھت پر ہوتے تھے۔"

سیدنا عبدالرحمٰن بن معاذ التیمی فرماتے ہیں کہ منیٰ میں سرکار دو عالم ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ نے ہماری قوت سماعت بڑھا دی چنانچہ ہم اپنے خیموں ہی میں آپ ؐ کا خطبہ سنتے رہے۔

ہجرت کے سفر کے دوران قدید کے علاقہ سے گزرتے ہوئے آپ ؐ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں بنوخزاعہ کی ایک عورت ام معبد کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ ام معبد کا نام عاتکہ بنت خالد تھا۔ یہ ایک پختہ عمر کی باعفت خاتون تھیں۔ آپ ؐ نے اس سے کھانے کی اشیاء کے بارے میں پوچھا۔ وہ کہنے لگیں کہ قحط کا دور ہے۔ سارا علاقہ بری طرح متاثر ہے، اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو میں ہرگز بخل سے کام نہ لیتی۔ آپ ؐ کی نظر ایک بکری پر پڑی جو خیمے کے ایک کونے میں بندھی ہوئی تھی۔ آپ ؐ نے اس بکری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ یہ کمزوری اور نقاہت کے باعث ریوڑ کے ساتھ نہیں جاسکی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم مجھے اس کا دودھ دوہنے کی اجازت دیتی ہو؟ اس نے اجازت دے دی۔ آپ ﷺ نے اس کو پکڑ کر اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا۔ اللہ کا نام لیا اور دعا کی۔ اس نے پاؤں پھیلائے اور اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ آپ ؐ نے ام معبد کے ہاں سے ایک بڑا برتن لیا جو دودھ سے بھر گیا اور اپنے ساتھیوں کو پلایا۔ پھر آپ ؐ نے اسی برتن میں اتنا دودھ دوہا کہ برتن بھر گیا۔ دودھ سے بھرے برتن چھوڑ کر آپ ﷺ تو سفر پر روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ام معبد کا شوہر گھر آیا تو وہ دودھ کا بھرا ہوا برتن دیکھ کر حیران رہ گیا اور پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا۔ اس نے اپنے شوہر کو یہ سارا واقعہ سنایا۔

اس نے کہا: معبد کی ماں! اس مبارک شخص کا حلیہ تو بیان کر۔ اس نے کہا کہ ”میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جس کا حسن و جمال نمایاں تھا، چہرہ روشن تھا، اخلاق پاکیزہ تھے، بدن نہ بھاری تھا اور نہ نحیف، خوب صورت اور خوش اندام تھا، آنکھوں میں گہری سیاہی تھی، پلکیں لمبی، آنکھوں کے کوئے سیاہی مائل تھے۔ بھنویں نہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں نہ بالکل ملی ہوئیں بلکہ درمیان میں ہلکے ہلکے بال تھے، بھنوؤں کے کنارے باریک تھے، بال نہایت سیاہ تھے، گردن صراحی دار تھی، داڑھی گھنی تھی، خاموشی میں اس کا وقار نمایاں تھا اور گفتگو میں اس کی آواز گردوپیش پر چھا جاتی تھی، گفتگو ایسی تھی گویا زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ وار نکلتی چلی آرہی ہے، کلام نہایت شیریں اور واضح تھا نہ کم گو اور نہ کثیر الکلام، دور سے آواز سب سے زیادہ بلند مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی اور قریب سے بہت شیریں اور لطیف، میانہ قد نہ ایسا دراز کہ بدنما نظر آئے اور نہ اتنا پست کہ کوئی نگاہ اس سے بلند تر کی طرف متوجہ ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ خوش منظر تھے اور سب سے زیادہ بہتر قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھی انھیں گھیرے رکھتے، ان کی بات بڑی توجہ سے سنتے اور اس کے حکم پر دوڑ پڑتے۔ وہ مخدوم تھا، نہ ترش رو تھا اور نہ درشت کلام۔ (طبقات ابن سعد: ۲۳۰/۱، ۲۸۸/۸، انساب الاشراف بلاذری: ۲۶۲/۱، ابن ہشام: ۲۵۵/۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم: ۱۱۷، مستدرک حاکم: ۱۱۔۹/۳، الاستیعاب: ۴۹۵/۴، ابن اثیر: ۱۰۶/۲، طبری: ۳۸۰/۲، روض الانف: ۲۳۴/۲، اسد الغابہ: ۴۹۷/۵، الشمائل لابن کثیر: ۴۹۰۴۴، عیون الاثر: ۱۸۹/۱، الاصابہ: ۴۹۷/۴، مجمع الزوائد: ۵۵/۶، ۲۷۸/۸، الشفا قاضی عیاض: ۱۷۸/۱)

قاضی عیاض کی اس عبارت سے آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے عناصر ترکیبی معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ چار ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق ماحول اور معاشرتی حالات سے ہے جب کہ دو عطیہ ربانی اور تائید الٰہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ قریشیت:

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ((انا افصح العرب بیدانی من قریش)) ”میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں مگر میں قریش سے تعلق بھی رکھتا ہوں۔“ اس روایت میں آپؐ نے اپنی دو خوبیاں بیان فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ میں تمام عربوں

میں زیادہ فصیح اللسان ہوں اور دوسری یہ کہ میں قریش میں سے ہوں کیونکہ قبیلہ قریش لسانی فصاحت و بلاغت میں تمام عرب میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اس قبیلے کے لوگوں کی زبان نہایت سلجھی ہوئی تھی۔ قرآن حکیم بھی انھی کی زبان میں نازل ہوا اور عرب کے تمام خطباء اور شعراء قریش کی زبان ہی کو پسند کرتے تھے۔ جاہلیت کے مشہور ترین شعراء جن کے قصائد ''سبعہ معلقات'' میں شامل ہیں، اسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ سوق عکاظ میں جو شعراء شعری مقابلہ میں شامل ہوتے تھے، ان کی زبان بھی یہی ہوتی تھی۔ تمام قبائل عرب میں قریش کی فصاحت و بلاغت اپنا لوہا منوائے ہوئے تھی۔ اسی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''میں افصح العرب ہوں اور قریش سے بھی تعلق رکھتا ہوں۔'' یہ بات آپؐ کی انتہائی فصاحت و بلاغت کی ایک بین دلیل ہے۔

قریش کا خاندان عرب کا ایک نہایت ممتاز خاندان تھا۔ یہ خاندان عرب میں اپنی طاقت اور قوت میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ اس خاندان کا نام ہی اس کی شجاعت، بہادری، جواں مردی، لسانی برتری اور عزت واحترام کی خاطر ''قریش رکھا گیا تھا۔ کیونکہ قریش ایک سمندری جانور کو کہتے ہیں جو اپنی طاقت وقوت کے باعث دوسرے تمام جانوروں پر غالب رہتا ہے۔ ہر جانور پر اس کو مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنا دل بہلانے کے لیے رکھ چھوڑتا ہے۔ سب پر غالب وحاکم ہوتا ہے لیکن اس پر نہ تو کوئی حاکم ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی غالب آ سکتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قریش کی وجہ تسمیہ یہی بیان کی ہے اور بطور دلیل شمرخ بن عمرو حمیری کے یہ شعر پیش کیے ؎

وقریش ھی التی تسکن البحر
بھا سمیت قریش قریشا
تاکل الغث والسمین ولا
تترکن لذی جناحین ریشا

هـكـذا فـی البلاد حیّ قریـش
یـاکـلـون البـلاد اکلاً کمیشـاً

(فتح الباری:۶/۴۱۶، البدایہ والنہایہ:۲/۲۰۰)

''قریش دراصل ایک سمندری جانور ہے (اور بعض کے نزدیک بڑی سمندری مچھلی ہے) جو سمندر میں رہتا ہے۔ اسی کے نام پر قریش کا نام قریش رکھا گیا۔ وہ جانور دبلے پتلے اور طاقتور اور موٹے جانوروں کو چٹ کر جاتا ہے اور ان کے پر تک نہیں چھوڑتا۔ اسی طرح یہ قبیلہ قریش مختلف شہروں کو نہایت تیزی سے کھا جاتا ہے۔''

شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ قریش ایک بحری جانور ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔ اس کا بدن باہم ایک دوسرے کے ساتھ گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ اہل مکہ نے اپنی اجتماعی زندگی کی جو تنظیم کی تھی وہ سمٹ کر ایک نقطہ اور اکائی پر مرکوز تھی۔ اسی وجہ سے اس اجتماعی تنظیم کا نام ''قریش'' رکھا گیا۔ (فتوحات مکیہ:۳/۱۰۶)

جس طرح قریش کا یہ قبیلہ سب سے بڑا تھا اسی طرح ان کی زبان بھی تمام عرب میں خالص اور ٹکسالی عربی مانی جاتی تھی، چنانچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ افصح العرب کون لوگ ہیں؟ تو انھوں نے قریش کی زبان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے سائل کے منہ سے کہلوایا کہ افصح العرب قریش ہیں۔ (البیان والتبیین:۳/۲۱۲، الروض الانف:۱/۱۰۹)

۲۔ بنوسعد میں پرورش:

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے افصح العرب ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ میری پرورش بنوسعد میں ہوئی۔ بنوسعد عرب کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھا اور قریش کے اشراف وسادات کے بچے عموماً اسی قبیلہ میں پرورش پاتے تھے اور اس قبیلہ کی عورتیں ہر سال بچوں کو اپنے ہاں لے جانے کے لیے مکہ میں آتی تھیں۔ جس سال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اس سال بھی اس قبیلہ کی عورتیں مکہ میں آئیں تا کہ وہ اشراف وسادات مکہ کے بچوں کو لے جا کر ان کی رضاعت کریں۔

تاریخ کے اوراق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عربوں کو اور خصوصی طور پر قریش کو اپنی زبان سے والہانہ محبت تھی۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جا سکتا تھا جو فصیح اللسان نہ ہوتا چنانچہ بچپن ہی سے بچوں کو فصیح و بلیغ عربی کا عادی بنایا جاتا۔ مکہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی فصیح عربی کا عادی ہو کیونکہ خانہ کعبہ ہونے کی وجہ سے یہاں مختلف علاقوں سے ہزاروں لوگ اللہ کے اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے آتے تھے۔ وہ یہاں کئی کئی روز یہاں قیام کرتے، لوگوں سے بات چیت ہوتی، اس وجہ سے یہاں کی زبان مخلوط عربی ہوگئی تھی جس میں کئی زبانوں کے مختلف الفاظ ملے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے قریش نے کچھ دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان ٹکسالی فصیح عربی مانی جاتی تھی چنانچہ وہ شیر خوارگی ہی میں اپنے بچوں کو ان قبائل میں پرورش اور رضاعت کے لیے بھیج دیتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ بچپن ہی سے ان کے بچوں کے کانوں میں ٹکسالی عربی کے الفاظ پڑتے اور اس طریقہ سے فصاحت و بلاغت ان کی گھٹی میں پڑ جاتی جس کے اثرات پوری زندگی ان کے اندر رچے بسے رہتے۔ چنانچہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا:

((انا اعربکم، انا قرشي واسترضعت في بني سعد بن بكر))

(سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۰۴، الروض الانف: ۱/۱۰۹)

"میں تم میں سب سے زیادہ شستہ اور صحیح عربی بولنے والا ہوں کیونکہ میں قریشی ہوں اور قبیلہ سعد بن بکر میں میں نے دودھ پیا ہے۔ (جو فصاحت و بلاغت میں ایک اعلیٰ مقام کا حامل ہے)۔"

کچھ اسی قسم کے الفاظ ابن سعد نے طبقات ۱/۷۱ میں بھی نقل کیے ہیں۔

دوسرے عرب میں یہ دستور تھا کہ شرفاء اور سادات اپنے شیر خوار بچوں کو ابتداء ہی سے دیہات میں بھیج دیتے تھے تاکہ وہاں کی صاف و شفاف آب و ہوا میں ان کی نشو و نما ہو سکے۔ اور وہ اصلی عربی تمدن اور اصلی عربی زبان سے آشنا ہو کر صحیح معنوں میں عربی تہذیب و تمدن اور زبان و اسلوب زبان کے پیکر ثابت ہو سکیں، چنانچہ امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"معد بن عدنان کی ہیئت کو اختیار کرو یعنی عجم کا لباس اور ان کی ہیئت کو اختیار نہ کرو اور شدائد و مصائب پر صبر کرو اور موٹا جھوٹا پہنو یعنی تنعم اور عیش و عشرت میں نہ پڑو۔"

تیسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ قریش میں خوشحالی اور برتری کے زعم کا ایک تکلف یہ تھا کہ بڑی بڑی بیگمات اپنے بچوں کو دودھ نہ پلاتی تھیں بلکہ دوسری خاندانی عورتوں یا باندیوں سے دودھ پلوایا کرتی تھیں۔ پھر مستقل طور پر بچہ کو اخلاق و خصائل کے لحاظ سے اعلیٰ قبیلہ کی کسی دیہاتی عورت کے سپرد کر دیا جاتا اور بچہ اس خالص عربی ماحول اور خوش خصال اور بلند اخلاق عورت کے دودھ سے صحت مندانہ نشو و نما پاتا۔

اسی دستور کے مطابق ہر سال بنو سعد کی بعض عورتیں شیر خوار بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ آیا کرتی تھیں۔ قبیلہ سعد بن بکر بن ہوازن طائف کے قریب بود و باش رکھتا تھا۔ وہاں کی آب و ہوا صحت افزا تھی۔ ہر سال اس قبیلہ کی کچھ عورتیں مکہ مکرمہ میں ایک خاص موسم میں آتیں اور قریش کے شیر خوار بچوں کو اپنے ہاں لے جاتیں اور دو سال کی مدت رضاعت پوری کر کے واپس پہنچا دیتیں اور رضیع کے والدین سے حسب توفیق انعام و اکرام حاصل کرتیں۔

جس سال سرکار دو عالم ﷺ اس عالم ظلمانی میں جلوہ فگن ہوئے اس سال دس عورتیں مکہ مکرمہ آئیں جن میں ایک حلیمہ سعدیہ بنت ابی ذویب بھی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۶۹)

اس طریقہ سے آپ ﷺ نے سیدہ حلیمہ سعدیہ کی گود میں قبیلہ سعد بن بکر بن ہوازن میں پرورش پائی۔ روایات میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی نشو و نما ایک روز میں اتنی ہوتی جتنی عام بچوں کی ایک ماہ میں ہوتی ہے اور ایک مہینے میں آپ اتنا بڑھتے جتنا دوسرے بچے ایک سال میں بڑھتے ہیں۔ (نہایۃ الارب: ۱۶/۸۱، عیون الاثر: ۱/۳۴، تاریخ الاسلام ذہبی: ۱/۴۷)

اس طرح آپؐ نے بنو سعد میں نشو و نما پائی۔ آپؐ کے رضاعی چچا ابو ثروان نے ایک مرتبہ کہا تھا:

"میں نے آپؐ کا ہر دور دیکھا ہے اور ہر دور میں میں نے آپؐ کو سب سے بہتر پایا۔ زمانہ شیر خوارگی میں سب سے بہتر شیر خوار، اور جب آپؐ کا دودھ چھوٹا تو

سب سے بہتر فطیم، (عربی زبان میں دودھ پینے والے بچہ کو رضیع یا مرضع کہتے ہیں اور جب وہ دودھ چھوڑ دیتا ہے تو اس وقت اس کو فطیم کہتے ہیں) جوان ہوئے تو سب سے زیادہ صالح اور باکردار نوجوان، گویا آپؐ کے اندر خیر وصلاح کے خصائل کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔'' (خصائص کبریٰ:۱/۵۹)

بنو سعد کے علاوہ آپؐ کے ننھیال بنو زہرہ اور آپؐ کے سسرال بنو اسد کی فصاحت و بلاغت بھی پورے عرب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا بھی آپؐ کی تربیت، فصاحت اور اسلوب کلام پر اثر پڑا۔ بنو اسد کی فصاحت کا نمونہ تو آپؐ کی زوجہ محترمہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ان الفاظ سے ملتا ہے جو انھوں نے آپؐ کی پہلی وحی پر آپؐ کے بارے میں فرمائے تھے:

((كلا والله لا يخزيك الله ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق.)) (بخاری مع فتح الباری:۱/۲۲)

''بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ناکام اور نامراد کردے اور آپؐ کی مدد نہ کرے کیونکہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، تھکے ہارے اور درماندہ انسانوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور ایسی خدمات جلیلہ انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، بے ٹھکانہ مسافروں کو اپنا مہمان بناتے ہیں اور حق بجانب امور میں معین ومددگار ہوتے ہیں۔''

۳۔ قرآن حکیم:

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے جو جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا پیغام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زندۂ جاوید معجزہ ہے جس کے چیلنج کا جواب چودہ سو سال میں غیر مسلم دنیا نہیں دے سکی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تمام انبیاء سے زیادہ ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کائنات میں اپنی ربوبیت کی معرفت کے لیے عرش سے لے کر فرش تک اور مشرق

سے لے کر مغرب تک نشانیاں پھیلائی ہیں جن کو دیکھ کر حق تعالیٰ شانہ کی ربوبیت کا مشاہدہ ہوتا ہے اسی طرح سرکار دو عالم ﷺ کی معرفت کے لیے بھی آیات نبوت کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دی گئی ہیں جن کو شمار کرنا مشکل ہے۔ (الجواب الصحیح: ۴/ ۲۴۸)

قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کی ایک معجزانہ شان ہے۔ مفردات الفاظ، ترکیب کلمات، اسلوب بیان، خلوص مقاصد، جامعیت مضامین، ربط آیات، انتہائے بلاغت وغیرہ کے لحاظ سے دانشورانِ عالم اور دنیا کے فصحاء اور بلغاء اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ عربی کا ایک محاورہ ہے: ((قدر الشهادة بقدر الشهود)) شہادت کی عظمت شاہدوں سے ہوتی ہے، اگر شاہد عادل اور صادق ہے تو اس کی شہادت بھی سچی ہوگی اور اگر شاہد میں کھوٹ ہے تو اس کی شہادت بھی کھوٹی ہوگی۔ اسی طرح کلام کی عظمت اور وقعت بھی متکلم سے ظاہر ہوگی۔ جس درجے کا متکلم ہوگا اسی درجے کا کلام ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کلام کی عظمت کے لحاظ سے چند چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ جس کلام میں یہ چیزیں ہوں گی وہ باعظمت اور عظیم کلام ہوگا۔

- ان میں سب سے پہلی شئے علم وفضل ہے، اگر متکلم عالم وفاضل ہوگا تو اس کا کلام بھی بلند وبرتر ہوگا اور اگر متکلم جاہل اور احمق ہوگا تو اس کے کلام سے جہالت اور حماقت ٹپکتی ہوگی اور آدمی اس کے کلام کو سن کر ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ کسی جاہل کا کلام ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ کسی کلام کے عظیم اور فصیح وبلیغ ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز علم اور خبر ہے۔
- دوسری چیز دانش وفہم ہے کیونکہ عالم کے لیے عاقل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس کا کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو، اگر عقل ودانش اور فہم وفراست نہ ہوگی تو کلام بھدّا اور غیر موثر ہوگا۔
- تیسری شئے منصب اور مقام ہے۔ کلام کرنے والا اگر عظیم منصب پر فائز ہے، صاحب حیثیت ومنصب ہے تو اس کا کلام بھی بلند اور برتر ہوگا چنانچہ کسی ملک کا صدر یا وزیر اعظم کوئی کلام کرتا ہے تو اس کے کلام کا ایک ایک لفظ نہایت نپا تلا ہوگا، مقتضائے حال

کے مطابق ہوگا اور سننے والے کے دل پر اثر انداز بھی ہوگا اور اس کی وقعت بھی پیدا ہوگی کیونکہ کلام ایک شخص کی شخصیت کا آئینہ دار ہوگا ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دین میل دارد در سخن بیند مرا

جب یہ بات مسلّم ہے کہ جس شخص کا علم جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی اس کا کلام بھی بڑا ہوگا اور جس قدر کسی کا منصب بلند ہوگا اس کا کلام بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہر لحاظ سے بلند تر ہے۔ اس کا علم لامحدود ہر غیب وحاضر کا جاننے والا، وہ جس طرح بادل کی گرج کو سنتا ہے اسی طرح زمین کی تہ میں چکنے پتھر پر جو چیونٹی چل رہی ہے اس کے رینگنے کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ وہ سمیع وبصیر ہے، علیم بذات الصدور ہے یعنی دلوں کے مخفی رازوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اس لیے اس کا کلام بھی ظاہر و باطن پر حکمران ہوگا اور جامع ترین اور عظیم ترین ہوگا۔ اس میں ہر لحاظ سے جامعیت ہوگی۔ فصاحت بھی اعلیٰ، بلاغت بھی اعلیٰ اور بداعت بھی اعلیٰ ترین ہوگی اور ایسی ہوگی کہ اس کی نہ کوئی حد ہوگی اور نہ نہایت۔ انسانی کلام کتنا ہی فصیح و بلیغ اور اعلیٰ خیالات پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن اس سے بہتر ممکن تو ہوگا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جو کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کی نظیر ہے اور نہ اس کے کلام کی نظیر ہو سکتی ہے۔ نہ اس کی کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کی کوئی مثل ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿لَا يَأْتُوْا بِمِثْلِهٖ﴾ یعنی اس کے کلام کا کوئی مثل نہیں لا سکتا اس لیے کہ اس کی ذات وصفات کا کوئی مثل موجود نہیں۔ جب اس کی ذات بے چون اور بے چگون ہے اور اس کی صفات کی کوئی نظیر نہیں تو پھر اس کے کلام اور اس کے افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ اس کی صفات میں سے کلام بھی ایک صفت ہے۔ کلام کرنے کا حق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ مخلوق تو اس کے پرتو سے متکلم بن گئی۔ موجود حقیقی وہ ہے اور اس کے وجود کا پرتو پڑ گیا تو ہم بھی موجود کہلانے لگے ورنہ ہمارا اپنا ذاتی اور اصلی وجود نہیں ہے۔

خدائی کام اور خدائی کلام:......جس طرح خدا کے کام کی کوئی نظیر اور مثل نہیں اسی طرح خدا کے کلام کی بھی کوئی نظیر اور مثل موجود نہیں۔ موجودہ زمانے میں انسان نے سائنسی لحاظ سے اس قدر ترقی کر لی کہ ستاروں پر کمندیں ڈالیں، چاند کی مٹی لے کر انسان زمین پر آیا، سمندر میں تیرا، خلاؤں میں اڑنے لگا۔ لاسلکی اور فیکس کے پیغامات نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا لیکن مچھر کا ایک پر نہ بنا سکا۔ زراعت میں ترقی کر کے دنیا میں سبز انقلاب لایا، گلاب کے کئی رنگوں کے پھول اگائے لیکن زمین کا ایک ذرہ نہ بنا سکا۔ آج سے کروڑوں سال قبل بھی مادہ میں یہ سب طاقتیں موجود تھیں لیکن موجودہ انسان نے اپنے ذہن سے کئی قسم کے اکتشافات کیے۔ ایٹم کو توڑا، ایٹم کی طاقتوں کو اپنے قبضہ میں کیا، ستاروں کی گزرگاہوں کا سراغ لگایا، کہکشاؤں کا پتہ چلایا لیکن انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا نہ بنا سکا، ایک مکھی کو عدم سے وجود میں نہ لا سکا۔ جب خدائی کاموں کا یہ حال ہے تو خدائی کلام کا بھی حال اس سے مختلف نہیں ہے۔ بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء دنیا میں پیدا ہوئے لیکن قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ قرآن حکیم کے نزول کے وقت عرب کے ہر قبیلہ میں آتش بیان خطباء اور زبان آور شعراء موجود تھے لیکن قرآن کی زبان نے سب کی زبانیں گنگ کر دیں۔ کفار مکہ نے دین اسلام کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا کوششیں نہیں کیں، اپنے عزیزوں اور جگر پاروں کو جنگ کے میدانوں میں مسلمانوں کی تلواروں کا لقمہ بنوایا، خود اپنی جانوں کو ہتھیلیوں پر رکھا، اپنے دین وکیش کو برباد کیا، دولت مندوں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ خطباء اور شعراء نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا لیکن قرآن کے چیلنج کے باوجود ایک سورت تو کیا ایک آیت بھی اس کے مقابلہ میں بنا کر نہ لا سکے۔ جب وہ اہل زبان اس کے مقابلہ سے عاجز و درماندہ تھے تو اس کے بعد کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔ لبید عرب کے مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کے اسلام لانے کے بعد ایک روز سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی۔ اس فرمائش کا جو جواب انھوں نے دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا:

''جب خدا نے مجھ کو سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سکھائی تو مجھے اب شعر کہنا زیب نہیں دیتا۔'' (الاستیعاب ترجمہ لبید)

یہ گویا عجز و درماندگی کا اظہار تھا جو بڑے لطیف پیرائے میں کیا گیا ؎

تیرے آگے سب ہیں دبے لچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم حقیقتاً معجزہ ہے کیونکہ معجزہ کے معنی یہی ہیں کہ تمام دنیا اس جیسی چیز لانے سے عاجز آ جائے۔ اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات ہیں وہ سب اعجازی ہیں۔ کوئی مخلوق ویسی اعجازی صفات کی حامل نہیں ہو سکتی اور قرآن جیسا معجز کلام نہ کوئی لا سکتا ہے اور نہ بنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا، زمین بنائی، چاند اور سورج بنائے لیکن یہ چاند اور سورج کی ایک کرن نہ بنا سکے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب چیزیں آپ کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ یہ کسی ایسے حکیم کی بنائی ہوئی ہیں، جس کی حکمت کی کوئی انتہا نہیں۔ چاند اور سورج تو اوپر ہیں جن تک ابھی آپ کی رسائی نہیں ہوئی۔ یہ زمین جو رات دن آپ کے قدموں کے نیچے پامال ہوتی ہے اس کا ایک ذرہ بھی آپ نہیں بنا سکتے۔ اس زمین سے آپ کام تو لے سکتے ہیں، اس کے ذروں کو جوڑ کر آپ نے مختلف چیز بنا لیں، مختلف قسم کی ایجادات کر لیں، آپ اس کے اجزا کا کیمیکل تجزیہ کر لیں گے لیکن ایک ذرہ مٹی پیدا کر لیں یہ آپ کے بس میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معجزہ ہے اس ذات کا بنایا ہوا ہے جس کا علم لامحدود، قدرت لامحدود، اقتدار لامحدود اور اس کی ذات لامحدود یعنی لا یحد و لا یتصور تو جتنے کام اللہ کے ہیں وہ سب معجزات ہیں۔ ساری دنیا اس کے بنانے سے عاجز اور درماندہ ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو باپ کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کارخانۂ قدرت کا کام جاری ہے۔ بچہ بن رہا ہے اور صورت بنائی جا رہی ہے۔ ایک قطرہ پانی پر تصویر کشی کی، صورت بنائی، نقش بنایا، نہ ماں کچھ کر سکتی ہے اور نہ باپ۔ خالق اللہ تعالیٰ ہیں، نہ ماں خالق ہے اور نہ باپ۔ اسی لیے قرآن حکیم میں فرمایا:

﴿ءَ اَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخَالِقُوۡنَ۝﴾ (الواقعہ:۵۹)

''اس کو تم پیدا کرنے والے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔''

تو جیسے اللہ تعالیٰ کا ہر کام اپنی نظیر نہیں رکھتا اسی طرح اللہ کا کلام بھی اپنی مثل اور نظیر نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے چودہ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اہل عرب کو بلکہ تمام دنیا کو، اور نہ صرف اس زمانہ کے لیے بلکہ قیامت تک کے لیے یہ چیلنج دے دیا کہ:

﴿عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ﴾ (الاسراء ۱۷:۸۸)

''اس قرآن کا مثل لاؤ۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے علم کی وجہ سے پتہ تھا کہ دنیا کا کوئی انسان اس کا مثل نہ لا سکے گا لہٰذا فرمایا:

﴿لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء ۱۷:۸۸)

''یہ اس کی مثل بالکل نہیں لا سکتے چاہے سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔''

اب اندازہ فرمائیں کہ تمام دنیا کے فصحاء اور بلغاء کو چیلنج دیا اور اس قوم کو خطاب کیا جس کو اپنی ادبی قابلیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا اور پھر وہ قرآن اور حامل قرآن کے سخت دشمن بھی تھے۔ قرآن حکیم کے اس دعویٰ کو توڑنا ان کے لیے نہایت اہم اور ضروری تھا۔ پھر جس شخصیت کے منہ سے یہ چیلنج نکلوایا، وہ خود امّی تھا۔ کسی مدرسہ میں کسی استاد کے سامنے اس نے کبھی بھی زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ اس اعلان اور چیلنج نے مخالفین اسلام وقرآن کی ادبی غیرت کو بھڑکایا لیکن وہ قرآن جیسی ایک آیت بھی بنا کر نہ لا سکے۔

حدیث میں بھی قرآن حکیم کے اعجاز کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کو خاص خاص معجزات ایسے نہ دیئے گئے جن کے باعث لوگ ان پر ایمان لائے۔

((وانما کان الذی او تیتہ وحیا اوحاہ الی))

(بخاری: ۲/۷۴۴، ۱۰۸، البدایہ والنہایہ: ۶/۶۹)

''مگر جو خاص معجزہ مجھ کو عطا ہوا ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمائی۔''

اس ''اوحاہ الی'' سے مراد کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم ہے جس کو آپ ﷺ نے معجزہ فرمایا:

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ دنیا میں اور کئی کتابیں بھی آسمان سے نازل ہوئیں، زبور آئی، انجیل آئی، تورات آئی، مختلف صحائف نازل ہوئے لیکن کلام خداوندی اگر کوئی ہے تو وہ صرف قرآن حکیم ہے اور کتابیں ''کتاب اللہ'' تو ہیں لیکن قرآن حکیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ''کلام اللہ'' ہے اور کلام کہتے ہیں "ما یتکلم به" یعنی جس کا کلام کرنے والا تکلم کرے۔ تورات اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی لیکن وہ لکھی لکھائی آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ تکلم نہیں فرمایا۔ انجیل کو سیدنا عیسیٰ کے قلب مبارک پر بطور مضمون کے القا فرمایا لیکن تکلم نہیں فرمایا لہٰذا اسے مضمون خداوندی کہیں گے کلام خداوندی نہیں کہیں گے لیکن قرآن حکیم وہ ہے جس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ نے تکلم فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ:

﴿نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى﴾

''(اے محمدؐ!) ہم تلاوت کرتے ہیں تم پر موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾

یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جس کی ہم تلاوت کر رہے ہیں تمھارے سامنے حق کے ساتھ

اور خود حدیث نبویؐ میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ جب کوئی آیت بھیجتے تھے تو کلام فرماتے تھے۔ اس کلام کو سب سے پہلے جبریل علیہ السلام سنتے تھے اور اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے اور تمام آسمان والے بھی اس کی عظمت سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جب ہوش آتا تو پوچھتے ((ماذا قال ربنا)) یعنی ہمارے رب نے کیا فرمایا؟ اس وقت جبریل علیہ السلام جواب دیتے: ((قال الحق وهو العلي الكبير)) اس سے بھی پتہ چلا کہ قرآن حکیم کا اللہ تعالیٰ نے تکلم فرمایا۔ اس لیے صحیح معنوں میں کلام اللہ وہی ہے جس کا حق تعالیٰ تکلم فرمائیں اور وہ صرف قرآن حکیم ہے لیکن ساتھ ہی یہ کتاب اللہ بھی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لوح محفوظ میں لکھ بھی دیا ہے لہٰذا قرآن حکیم کلام اللہ بھی ہے اور کتاب اللہ بھی اور کلام، اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جس طرح خدائی کام اور بندوں کے کام میں فرق ہے ایسے ہی خدائی کلام اور بندوں کے کلام میں اتنا ہی فرق ہے جتنا خدا اور بندے میں فرق ہے۔ غرض کہ قرآن

حکیم چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا یہ بے مثل اور بے نظیر ہے۔ مخلوق میں سے کوئی شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی اس کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔

پھر مفردات الفاظ اور کلمات کی تراکیب کے لحاظ سے بھی قرآن حکیم ایک معجزہ ہے کیونکہ کوئی شخص اس لحاظ سے بھی قرآن حکیم سے اعلیٰ الفاظ اور تراکیب استعمال نہیں کرسکتا۔ سارا قرآن پڑھ جایئے، ایک لفظ بھی آپ کو غیر فصیح نظر نہیں آئے گا۔ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اسی مقام پر استعمال ہونے کے لیے موزوں تھا۔ اس کے بجائے اگر کوئی دوسرا لفظ استعمال ہوتا تو وہ اس مقام کے مناسب نہ ہوتا۔ ویسے بھی عربی زبان ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے دنیا کی دولت مند ترین زبانوں میں سے ہے۔ اسی وجہ سے امام سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان میں لکھا ہے کہ مکمل عربی زبان کو سوائے نبی کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس زبان میں الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ دور جاہلیت میں ''موت'' کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بائیس الفاظ تھے لیکن قرآن حکیم نے ان تمام ثقیل الفاظ کو استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے بجائے صرف دو لفظ استعمال کیے ''موت'' اور ''توفی'' لفظ توفی کا لغوی مطلب تھا ((اخذ الشئی وافیا)) یعنی کسی شئے کو پورا پورا لینا۔ یہ لفظ استعمال کر کے قرآن حکیم نے یہ بھی بتا دیا کہ موت کا مفہوم اسلام میں وہ نہیں ہے جو دوسرے مذاہب وادیان میں ہے۔ دوسرے مذاہب میں موت کا مفہوم ابدی فنا لیکن اسلام میں اس کا مفہوم ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔ موت کے لیے اس سے قبل یہ لفظ کبھی کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

اسی طرح اللہ کے راستہ میں قتل ہونے کے لیے لفظ ''شہادت'' سب سے پہلے قرآن نے استعمال کیا۔ اس سے قبل یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ ''قتل فی سبیل اللہ'' کے لیے یہ لفظ استعمال کر کے قرآن حکیم نے ایک بہت بڑی حقیقت پر متنبہ کیا اور انسان کو قتل فی سبیل اللہ کے مرتبہ سے آشنا کیا۔

اسی طرح اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے کہ مرد عورت پر حاکم ہے ''الذی علیها'' کے الفاظ استعمال کیے اور عورتوں کے حقوق بیان کرتے ہوئے اس قدر حسین انداز اختیار کیا کہ اہل زبان عش عش کر اٹھے ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

اور عورتوں کے حقوق ہیں جیسا کہ ان کے حقوق ہیں جو ان پر حاکم ہیں دستور کے مطابق یہاں اَلَّذِیْ عَلَیْهِنَّ کی تعبیر اختیار کر کے مرد کی حاکمیت کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان فرما دیا۔

یہ تو کلمات والفاظ کی بحث تھی۔ قرآن حکیم نے جو تراکیب استعمال کیں وہ بھی اعجازی شان رکھتی ہیں۔ مثلاً جنات کو شریک بنانے کے بارے میں قرآن حکیم نے جو اسلوب اختیار کیا وہ بھی عجیب حکیمانہ اعجازی رنگ لیے ہوئے اور اس کے لیے یوں بھی کہا جا سکتا تھا بلکہ ظاہر قیاس سے یہی اس کی تعبیر ہو سکتی تھی کہ

وَ جَعَلُوْا الْجِنَّ شُرَکَآءَ لِلّٰهِ

''اور انھوں نے جن اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرا لیے۔''

لیکن قرآن نے اس مفہوم کو جن الفاظ میں ادا کیا اس سے اس مفہوم کے حسن میں چند در چند اضافہ ہو گیا اور مشرکین کی ذہنی پستی بھی عیاں ہو گئی۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ الْجِنَّ﴾

اور ٹھہرائے انھوں نے اللہ کے شریک جن۔''

قدیم عرب میں غارت گری اور قتل ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ قصاص لینا ان کے لیے نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل کا علاج قتل ہے۔ اس تصور کو انھوں نے مختلف الفاظ میں ادا کیا ہوا تھا:

- القتل احیاء للجمیع .
  ''قتل سب کی زندگی ہے۔''
- اکثروا القتل لیقلل القتل .
  ''قتل کی زیادتی کرو تا کہ قتل کم ہو جائے۔''
- القتل انفی للقتل .
  ''قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔''

ان جملوں کی عربوں کے ہاں اتنی مقبولیت تھی کہ یہ زبان زد خاص و عام تھے لیکن قرآن حکیم نے اس مفہوم کو اتنے احسن پیرائے اور لطیف انداز میں بیان کیا کہ یہ تمام جملے اس کے آگے بے معنی ہو کر رہ گئے۔ قرآن حکیم نے اس مفہوم کو یوں بیان کیا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝﴾

''اے صاحبان عقل و دانش! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔'' (البقرۃ ۲:۱۷۹)

قرآن حکیم نے الفاظ اور اسالیب کو نئی وسعتیں اور نیا حسن دے کر ایک نہایت اعلیٰ عربی ادب کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد کوئی ادیب اس سے بہتر نمونہ پیش نہ کر سکا۔ چنانچہ دنیا کی بے ثباتی اور موت کے یقینی ہونے کے بارے میں قرآن حکیم نے جو اسلوب اختیار کیا، پورے عربی ادب میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران:۱۸۵)

''ہر جان موت کا ذائقہ چکھنے والی ہے۔''

الفاظ اور تراکیب کے علاوہ اسلوب کا اعجاز بھی ہے۔ قرآن ایک ایسی نثر ہے جس میں شعر کا ایک ایسا شیریں آہنگ ہے جو شعر سے کہیں زیادہ طاقت اور حلاوت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کے نزول سے قبل عربوں میں کلام کا جو اسلوب رائج تھا وہ یا تو نثر تھا اور یا نظم لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے جو کتاب عربوں کے سامنے پیش کی اس نے ان کے صدیوں پرانے اسلوب کو بدل کر رکھ دیا اور ایک نیا اسلوب ان کے سامنے پیش کیا۔ عربوں کو اس نئے اسلوب نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، چنانچہ بعض لوگوں نے قرآن کو شعر اور رسول اللہ ﷺ کو شاعر کہنا شروع کر دیا لیکن قرآن حکیم کا انداز کچھ ایسا تھا کہ نہ یہ شعر تھا اور نہ ہی اسے نثر کہا جا سکتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ اس کو نثر کہنے سے بھی جھجکتے تھے۔ اس نئے اسلوب نے جو یک دم اس کتاب میں پیش کیا گیا، پوری عرب قوم کو حیران اور پریشان کر دیا۔ وہ اس کو نثر کہیں یا نظم کیونکہ اس کی حلاوت و طراوت تو شعر سے بھی زیادہ تھی لیکن شعر کے لیے وزن اور قافیہ کی پابندی ضروری ہے جو قرآن حکیم میں بالکل نہیں تھی، چنانچہ قرآن حکیم کے متواتر صوتی آہنگ نے ان کے دلوں میں ایسا اثر پیدا کیا کہ جو سنتا وہ اپنے ادبی اور

جمالیاتی ذوق کی وجہ سے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، چنانچہ سیرۃ نبویؐ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے پاس جو بھی آیا آپؐ نے اس کو قرآن سنایا اور قرآن کے اسلوب بیان، صوتی آہنگ، بندش الفاظ، الفاظ کی شگفتگی اور اس کے معانی کی جاذبیت نے نہ صرف سرداران قریش کو بلکہ اجڈ دیہاتی لوگوں کو بھی متاثر کیا اور وہ دل ہار کر واپس گئے۔

اس سلسلہ میں مصر کے مشہور دانشور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایک بڑی اچھی بات قرآن حکیم کے اعجاز کے ضمن میں کہی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں نے اپنی اپنی زبانوں میں جو ادب تخلیق کیا ہے وہ دو اقسام پر مشتمل ہے۔ نظم یا نثر لیکن عربی زبان کا ادب دو اصناف پر مشتمل نہیں بلکہ تین اصناف پر مشتمل ہے ایک نظم، دوسری نثر اور تیسرا قرآن چونکہ قرآن نہ نظم کے زمرہ میں آتا ہے اور نہ نثر کے دائرہ میں بلکہ یہ تو ایک الگ اور مستقل تیسری صنف ہے جسے قرآن ہی کہا جا سکتا ہے چونکہ انسانی کلام نظم میں ہوتا ہے یا نثر میں اور قرآن حکیم نہ تو نظم میں ہے اور نہ نثر میں، تو ظاہر ہوا کہ یہ کسی بشر کا کلام تو ہے نہیں لہٰذا اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام اعجاز ہے۔

سرداران قریش شدید مخالفت کے باوجود بھی رات کی تاریکی میں اٹھ اٹھ کر سرکار دوعالم ﷺ کی تلاوت چھپ چھپ کر سنتے اور قرآن حکیم کے مضامین، فصاحت و بلاغت، اس کی شوکت ونزاکت اور حلاوت وطراوت سے اپنے دلوں کو سیراب کرتے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے تلاوت قرآن سے متاثر ہونے کا واقعہ مسند احمد ۱/ ۱۷، میں موجود ہے۔

کئی اور روایات میں ہے کہ ولید بن مغیرہ، ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش راتوں کو اٹھ کر ایک دوسرے سے چوری چوری قرآن حکیم کو سنتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ عتبہ آپؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے کافی دیر گفتگو کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ واقعی ہم میں حسب ونسب کے لحاظ سے لائق وفائق ہیں لیکن آپؐ نے اپنے مشن کے پرچار سے قوم میں تشتت وافتراق پیدا کر دیا ہے۔ آپؐ ہمارے باپ دادا کو احمق اور نادان بتاتے ہیں لہٰذا میں اس بارے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، آپؐ نے فرمایا: ''ابوولید! کہیے میں سنتا ہوں۔''

عتبہ نے کہا: ''بھتیجے! اگر تم مال و دولت کے خواہاں ہو تو ہم سب تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ ہم میں سے کوئی بھی تمھارا مقابلہ نہ کر سکے گا اور اگر تم کوئی عہدہ یا سرداری

چاہتے ہوتو ہم سب تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر حکومت وریاست کے خواہاں ہوتو ہم تمھیں اپنا حاکم اور بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم کسی حسین وجمیل عورت سے شادی کے طلب گار ہوتو جس عورت سے یا جتنی عورتوں سے تم چاہو ہم شادی کرا دیتے ہیں اور اگر تمھیں کسی آسیب وغیرہ کی شکایت ہے تو ہم تمھارا علاج کرانے کے لیے تیار ہیں۔''

عتبہ یہ باتیں کر کے خاموش ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابو ولید! کچھ اور کہنا ہے؟'' عتبہ نے کہا: ''نہیں، میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا۔'' آپؐ نے فرمایا: ''اب جو میں کہتا ہوں وہ سنو۔'' فرمایا: ''مجھے تمھارا مال وزر نہیں چاہیے اور نہ میں تمھاری حکومت اور سرداری کا خواہاں ہوں، میں تو اللہ کا رسولؐ ہوں اور تمھاری طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ مجھ پر ایک کتاب نازل ہوئی ہے اور مجھے تمھیں ثواب کی بشارت دینے اور عذاب سے ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہے اگر تم میری دعوت کو قبول کرلو تو تمھارے لیے سعادت کونین کا باعث ہوگی اور اگر میری دعوت قبول نہ کرو تو میں صبر وتحمل سے کام لوں گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔ پھر آپؐ نے یہ آیات تلاوت کیں:

﴿بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ! حٰمٓ o تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ o كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ o﴾ الخ....

''یہ کلام خدائے رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیات صاف اور واضح ہیں۔ ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں اتارا گیا ہے۔'' (حم السجدۃ ۴۱:۱ تا ۳۸)

سورۃ حم السجدہ کی یہ ۳۸ آیات آپؐ نے تلاوت فرمائیں۔ ادھر سرورِ کائنات ﷺ شاداں وفرحاں مصروف تلاوت تھے اور ادھر عتبہ بن ربیعہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے دم بخود اور ہمہ تن گوش ہوکر سنتا جا رہا تھا۔ وہ نہایت غور سے سنتا رہا اور حیرت سے اس پیکر روحانیت کو دیکھتا رہا جسے نہ دولت کا لالچ، نہ کسی منصب کی طلب، فرمان روائی جیسی نعمت بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ عتبہ ندامت میں غرق تھا کہ ایسے قدسی صفات شخص کو آسیب زدہ قرار دیا جائے۔ یہ تو اپنے کلام میں نہایت قیمتی حقائق بیان کر رہا ہے۔ عتبہ خود ایک

بہت بڑا شاعر تھا اور شعر کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز سے بخوبی آشنا تھا لہٰذا وہ سمجھا کہ یہ آیات جو محمد ﷺ تلاوت کر رہے ہیں، فصاحت و بلاغت میں اعجاز کا نمونہ ہیں۔ جب آپؐ سجدے کی آیت پر پہنچے تو آپؐ نے سجدہ فرمایا، پھر فرمایا: ابوولید! تمھیں جو کچھ سننا تھا سن چکے اور میں نے جو کچھ تمھاری باتوں کا جواب دینا تھا وہ دے چکا۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔"

عتبہ اٹھا اور سیدھا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا جنھوں نے اسے اپنا نمائندہ بنا کر آپ ﷺ کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال اور تاثرات اب پہلے سے مختلف تھے۔ اسے واپس آتا دیکھ کر وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: "بخدا! ابوولید تمھارے پاس وہ چہرہ لے کر نہیں آ رہا جو چہرہ لے کر وہ گیا تھا۔" عتبہ کے قلب پر اس کلام (قرآن حکیم) کے اچھے خاصے اثرات تھے، چنانچہ انھوں نے پوچھا: "کیا خبر ہے؟" عتبہ نے کہا: "میں نے محمد ﷺ سے ایک ایسا کلام سنا ہے جو اس سے قبل میں نے کبھی کسی سے نہیں سنا۔ بخدا! نہ وہ شعر ہے اور نہ جادو اور نہ وہ کہانت ہے، قریش کے لوگو! میری بات مانو، اس معاملہ کو مجھ پر چھوڑ دو، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ محمد ﷺ کو اس کے اپنے حال پر رہنے دو۔ بخدا میں نے اس کا جو قول سنا ہے اس سے کوئی زبردست واقعہ رونما ہو کر رہے گا پھر اگر اس شخص کو عرب نے مار ڈالا تو تمھارا کام دوسروں کے ذریعے انجام پا جائے گا اور اگر یہ شخص عرب پر غالب آ گیا تو اس کی عزت و بادشاہت تمھاری عزت و بادشاہت ہوگی اور اس کا وجود تمھارے لیے سعادت کا باعث ہوگا۔ یہ الفاظ سن کر قریشی رؤساء کہنے لگے: ابوولید! بخدا تم پر بھی محمد ﷺ کی زبان کا جادو چل گیا ہے۔" عتبہ نے کہا: "میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ اب تمھیں جو درست معلوم ہوتا ہے وہ کرو۔"

(البدایہ والنہایہ: ۳/۶۳، سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۹۳، زرقانی: ۱/۲۵۷، عیون الاثر: ۱/۱۹۶)

ایک اور روایت میں ہے کہ سرورکائنات ﷺ نے جب تلاوت شروع کی تو عتبہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾

"پس اگر وہ روگردانی کریں تو آپؐ فرما دیں کہ میں تمھیں ایک ایسی کڑک

(عذاب) سے خبردار کر رہا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک جیسی ہوگی۔" (حم السجدۃ ۴۱:۱۳)

پہلے تو عتبہ بیٹھ کر آپؐ کے منہ سے یہ قرآنی آیات سن رہا تھا لیکن جب آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو عتبہ تھرّا کر کھڑا ہوگیا اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سرکار دو عالم ﷺ کے منہ پر رکھ دیا کہ میں آپؐ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ کریں۔ اسے یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں وہ کڑک آن نہ پڑے۔ اس کے بعد وہ واپس قریش کے پاس چلا گیا اور انھیں جا کر وہ کچھ کہا جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۴/۳:۷۴)

عتبہ پر یہ سارا اثر قرآن حکیم کے اسلوب بیان کا تھا کیونکہ اس نے ابھی تک شعر اور نثر دونوں میں ایسا اسلوب بیان نہ دیکھا تھا۔

قرآن حکیم کے اسلوب بیان کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اگر ایک بات کو بار بار دہرایا جائے تو آدمی کی طبیعت اکتا جاتی ہے خواہ متکلم کتنے ہی اچھے پیرائے میں بات کیوں نہ کرے، خواہ وہ کتنا ہی بڑا انشاء پرداز کیوں نہ ہو لیکن قرآن حکیم کا یہ خاص اعجاز ہے کہ اس میں بعض باتیں مختلف مقامات پر بار بار ذکر کی گئی ہیں لیکن ان کو پڑھنے سے ہر بار ایک نیا کیف، نئی تاثیر اور نئی لذت محسوس ہوتی ہے۔

ایجاز اور اختصار بھی قرآن حکیم کا ایک امتیازی وصف ہے چنانچہ اس میں ایسے ایجاز اور اختصار کے ساتھ قیامت تک کے اصول بیان کر دیئے گئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر مخالف سے مخالف شخص بھی قرآن حکیم کے اعجازی اسلوب کا قائل ہو جاتا ہے۔

نظم و نثر کے اسلوب صدیوں کے ارتقاء کے بعد فصحاء و بلغاء کے ہاں تسلیم کیے جاتے ہیں اور اپنے مقام کمال کو پہنچتے ہیں لیکن یہ نیا اسلوب اپنے پہلے ہی مقام پر کمال تک پہنچا اور دنیا کے فصحاء و بلغاء سے اپنے کو تسلیم کروایا لہٰذا یہ انسانی فکر کی پیداوار نہیں بلکہ کلام اللہ ہے جس کی ابتداء ہی اس کی انتہاء ہے۔

انسان اور اس کی تمام قوتیں محدود ہیں کیونکہ اس کی ذات محدود ہے۔ اس وجہ سے ہر شاعر اور ہر نثر نگار ایک خاص دائرہ میں زور فصاحت دکھانے پر قادر ہوتا ہے جب کہ ہر دائرہ میں وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ امراء القیس کی شاعری کا زور بیان عورتوں اور گھوڑوں کی

تعریف سے مختص ہے، اعشیٰ کا شراب سے، فردوسی اور نظامی جنگ کے مضامین میں اپنا زور دکھاتے ہیں، لیکن قرآن حکیم نے ہر قسم کے مضامین کو اس اسلوب اور انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کی بے مثال بلاغت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ہر کتاب جس زبان میں ہوتی ہے سو دو سو سال کے بعد اس کتاب کے کئی الفاظ، محاورات اور تراکیب متروک ہو جاتی ہیں اور پھر اس کتاب کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ تلسی داس کی رامائن، شیکسپیئر کے ڈرامے اگرچہ انسانی ادب کا شکار سمجھے جاتے ہیں اور اپنے زمانۂ تالیف سے لے کر اب تک پڑھے جاتے ہیں لیکن ان کی زبانیں محدود وسعت کی حامل بے جان اور جامد زبانیں ہیں نہ کہ زندہ زبانیں اور ان کے بے شمار الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں لیکن زبانوں کی تاریخ میں قرآن حکیم واحد مثال ہے جو مختلف قسم کے عملی اور سیاسی انقلابات کے باوجود اپنی زبان کو مسلسل اسی حالت میں باقی رکھے ہوئے ہے جس حالت میں وہ نزول قرآن کے وقت تھی۔ انسانی معاشرہ کی کوئی بھی تبدیلی اس میں تغیر پیدا نہ کر سکی۔ عربی زبان گذشتہ چودہ سو سال سے یکساں حالت پر باقی ہے۔ اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا لیکن یہ ارتقاء اس طرح ہوا کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنوں کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا جس طرح چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عربوں میں وہ سمجھا اور بولا جاتا تھا۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ عربی زبان قیامت تک زندہ اور قابل فہم حالت میں باقی رہے کیونکہ قرآن حکیم نے قیامت تک باقی رہنا ہے اور یہ کلاسیکل لٹریچر کی الماری میں کبھی بھی نہیں جائے گا۔

قرآن حکیم کا یہ معجزاتی ادب ہی ہے جس نے عربی زبان کو تبدیلی کے اس قانون سے مستثنیٰ رکھا جب کہ دوسری تمام زبانیں متاثر ہوئیں چنانچہ مشہور عیسائی دانشور جرجی زیدان نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''مختصر یہ کہ عربی زبان کے ادب پر قرآن حکیم نے ایسا غیر معمولی اثر ڈالا جس

کی مثال کسی اور دینی کتاب کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔"

(آداب اللغات العربیہ، ص: ۲۸)

عربی زبان کو قرآن حکیم نے کیسے زندہ اور غیر متبدل رکھا اس کے بارے میں مشہور فرانسیسی مستشرق ارنسٹ ریناں نے لکھا ہے کہ:

"عربی زبان کا نہ کوئی بچپن ہے اور نہ بڑھاپا۔ وہ اپنے ظہور کے روز اول سے جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔" (اللغات السامیہ: ۶۲)

نزول قرآن کے بعد جب مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے اور جبل الطارق اور کاشغر تک اسلامی علم لہرانے لگا۔ ان علاقوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ ان میں ایسی قومیں بھی تھیں جو اپنے سیاسی نظام اور تہذیب وتمدن میں عربوں سے بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عراق میں داخل ہوئے جو ایک قدیم تمدن کا حامل تھا اور دنیا کی بڑی بڑی قوموں کا مرکز رہ چکا تھا۔ وہ ایران میں داخل ہوئے جو اپنے زمانے کی عظیم ترین سلطنت تھی اور جسے اپنے آریائی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے چیتھڑوں کو وہ آخر تک اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ مصر اور شام کی تہذیبوں سے بھی اس کا اختلاط ہوا۔ یہ اسباب کافی تھے کہ عربی زبان میں ایک نیا عمل شروع ہوتا اور ان نئے عوامل کے اثرات سے ایک نئی زبان وجود میں آتی جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا لیکن اتنے بڑے بھونچال کے باوجود قرآن حکیم نے اس زبان کو ایسا تحفظ فراہم کیا کہ وہ تمام عوامل بے اثر ہو کر رہ گئے۔

اموی سلطنت میں خالص عربی حکومت تھی۔ دوسری صدی ہجری میں اموی حکومت ختم ہوگئی اور عنان اقتدار عباسیوں کے ہاتھ میں آئی۔ عباسیوں کا دارالخلافہ بغداد تھا، جو ایران سے بہت قریب تھا۔ اس وجہ سے اور کچھ اور بھی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے عباسی حکومت پر ایرانیوں کا غلبہ ہوگیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں ہی کی مدد اور تعاون سے بنوامیہ کی حکومت کو ختم کیا تھا، اس لیے اس کے حکومتی کاروبار اور نظم ونسق میں ایرانیوں کا عمل دخل ہو جانا لازمی تھا۔ بعد میں عباسیوں نے ایرانیوں کو اتنی آزادی دی کہ وہ حکومت کے سارے معاملات میں آزادانہ کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے عرب اور عرب تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھا

اور اس کو کمزور کرنے کے لیے ہر قسم کی تدبیریں کیں۔ مختلف تہذیبیں آپس میں ملیں بلکہ ہم آغوش ہوئیں۔ کسریٰ ایران کی اولاد اور قدیم جاگیردار اور ان کی اولاد نے پھر سے سر نکالا اور اپنے آباء واجداد کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کے رسم و رواج اور ان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کو پھر سے زندہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ ایرانیوں کو دیکھ کر ترکوں، کردوں اور دوسری قوموں نے بھی اپنی تہذیب کو زندہ کرنا چاہا لیکن اس نازک موقع پر قرآن حکیم کی ادبی عظمت اور اعجازی شان عربی زبان کے لیے ڈھال بن گئی اور عربی زبان میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔

خلافت اسلامیہ جب ترکوں کے ہاتھ میں آئی اور وہ تقریباً ساڑھے پانچ سو سال عالم عرب پر حکمران رہے۔ ان کے زمانہ میں تمام عرب دنیا تقریباً چھ صدیوں تک عجمی بادشاہوں کے جھنڈے تلے رہی۔ اس مدت میں مغل، ترک اور ایرانی حکمران عرب آثار کو مٹانے پر تلے رہے۔ عربی زبان سے نفرت پیدا کی گئی یہاں تک کہ فردوسی نے اپنے شاہ نامہ میں ہر ممکن کوشش کی کہ عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ عربی کتب خانے جلائے گئے، مدرسے تاخت وتاراج کیے گئے۔ علمائے اسلام کو ذلیل و رسواء کیا گیا۔ عثمانی حکمرانوں نے اپنی پوری طاقت سے عربوں کو ترک بنانے کی مہم چلائی لیکن عربی زبان میں وہ پھر بھی کوئی مستقل تبدیلی پیدا نہ کر سکے۔ بخارا اور بغداد میں تاتاریوں نے، شام میں صلیبیوں نے اور اندلس میں یورپی اقوام نے عربی زبان وادب اور عربی تہذیب کو مٹانے اور نقصانات پہنچانے کے جو طریقے اختیار کیے وہ عربی زبان کا نام ونشان مٹانے کے لیے کافی تھے لیکن یہ سب باتیں عربی زبان کو مٹانا تو بہت بڑی بات ہے اس میں خاطر خواہ تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکیں اور یہ سب کچھ قرآن حکیم کی اعجازی شان کی وجہ سے ہوا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ”ترکوں کی جہالت اور ایرانیوں کا تعصب اگر حائل نہ ہوتا تو عربی زبان آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد زبان ہوتی۔“

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کو ان کے ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نویسوں وغیرہ نے مضبوط بڑھاوا دیا۔ ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ اٹھتا اور وہ زبان کو نیا اسلوب دے کر نئے مرحلے کی طرف لے جاتا۔ اس طرح زبان بدلتی رہتی اور نتیجہ

یہ ہوتا کہ چند صدیوں کے بعد زبان میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا کہ پچھلی زبان کی کتابوں کو لغت اور شرح کے بغیر اگلی نسل سمجھنے سے قاصر ہوتی لیکن عربی زبان کو قرآن کے اعجازی اسلوب نے وہ دوام بخشا کہ کسی ادیب اور شاعر کا اسلوب اس پر اثر نہ کر سکا۔ یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے کہ قرآن حکیم سرکار دو عالم ﷺ کا ایک ایسا زندۂ جاوید معجزہ ہے جس نے نہ صرف اپنے آپ کو قائم رکھا بلکہ اس کی وجہ سے عربی زبان بھی ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ رہی اور یہ زبان چودہ سو سال سے عالم شباب ہی میں رہی نہ اس پر دورِ طفولیت آیا نہ بڑھاپا آیا اور موت آنا تو بہت بڑی بات ہے۔

(قرآن حکیم اعجازی شان کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''پیغمبر اسلام ﷺ اور معجزات'')

یہ بھی قرآن حکیم کی ایک خصوصیت اور اعجازی شان ہے کہ بڑے بڑے خطیب، ادیب اور انشاء پرداز اپنی عبارتوں اور خطابت کو رونق بخشنے کے لیے ان میں قرآن کی آیات کے اقتباسات استعمال کرتے اور عرب خطباء اس بات کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھا اور اس بات کو نہایت مستحسن تصور کرتے تھے کہ اجتماعات وغیرہ میں خطیب کے کلام میں قرآنی آیات ہوں کیونکہ اس سے کلام میں رونق، وقار، نزاکت اور حسن تاثیر کی صورت پیدا ہوتی ہے کیونکہ قرآن حکیم کا ایک تاثیری اعجاز بھی ہے۔ اس کی شیرینی، نمکینی، قوت تسخیر جو دوست و دشمن، موافق ومخالف، شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے چنانچہ عرب کے ایک بزرگ نے ایک بہت بڑے خطیب کے بارے میں کہا اور بالکل صحیح کہا:

((هذا الفتى اخطب العرب لو كان فى خطبته شئى من القرآن)) (الروض الانف: ۱/ ۱۰۹، الشفاء: ۱/ ۱۰۶)

''اگر اس نوجوان کے خطبہ میں قرآن حکیم کی کوئی آیت ہوتی تو یہ عرب کا سب سے بڑا خطیب ہوتا۔''

جب قرآن کی یہ اعجازی شان ہے کہ ایک عام خطیب بھی اگر اپنے خطبات میں اس کی آیات کو استعمال کرے تو خطبات فصاحت و بلاغت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں تو جس ذات اقدس پر یہ قرآن نازل ہوا وہ کتنا بڑا خطیب ہوگا اور اس میں کس قدر شان فصاحت و بلاغت

ہوگی، اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے چنانچہ آپ کا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب میں یہ فرمانا کہ مجھ سے بڑا فصیح اور کون ہوگا جب کہ قرآن حکیم بھی تو میری زبان پر ہی نازل ہوا لہٰذا آپؐ افصح العرب تھے اور جونہی آپؐ کلام فرماتے وہ جوامع الکلم کی شان کے ساتھ ساتھ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا۔

۴۔ فطرت محمدیؐ کی جامعیت:

حق تعالیٰ شانہ نے آپؐ کی فطرت ہی میں جامعیت عطا فرمائی تھی۔ آپؐ چونکہ سیدالاولین والآخرین تھے اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ترین تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظرف بھی ایسا عطا فرمایا تھا جس میں اور خوبیوں کے علاوہ فصاحت و بلاغت کی خوبی بھی بدرجۂ اتم رکھی تھی کیونکہ جو معجزات تحدی اور مقابلہ کے لیے انبیاء علیہم السلام کو دیئے جاتے ہیں ان کے بارے میں عادت خداوندی یہ ہے کہ وہ معجزات اس فن کے بارے میں دیئے جاتے ہیں جس فن میں اس قوم کو اعلیٰ درجہ کی مہارت ہو کیونکہ اس فن میں اس قوم کا پوری دنیا میں کوئی ثانی اور مثل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر قوم کو معجزہ کا معجزہ ہونا سمجھ میں نہیں آ سکتا اور معجزہ سے اس قوم کو سمجھانا ہی مقصود ہوتا ہے جس کی طرف وہ نبی مبعوث ہوتا ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام جس قوم میں مبعوث ہوئے وہ فن جادوگری اور شعبدہ بازی میں ید طولیٰ رکھتی تھی اور اس فن سے آشنا لوگ اس قوم میں کثرت سے تھے کہ مفسرین نے ستر ہزار اور اسی ہزار ان جادوگروں کی تعداد لکھی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے تھے۔ فن جادوگری میں وہ اس قدر کمال رکھتے تھے کہ انھوں نے فرعون سے نہایت جرأت اور دلیری سے یہ کہا کہ ''فرعون کی عزت کی قسم! ہم ضرور غالب آئیں گے۔'' چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح کا معجزہ عطا فرمایا گیا کہ اگر وہ اپنے جادو سے رسیوں کو سانپ بنا کر دکھائیں تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام عصا سے ایک ایسا سانپ بنا کر پیش کریں جو ان کے تمام سانپوں کو نگل جائے اور ان تمام جادوگروں کو میدان مقابلہ میں ہرا دیں۔

اسی طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فن طب میں لوگوں کو کمال حاصل تھا اس فن میں دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو وہ معجزات عطا

فرمائے جو شکل وصورت میں فن طب سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ ان کو مردوں کو زندہ کرنے، مادر زاد اندھوں کو بینا کرنے اور کوڑھی اور برص والوں کو اچھا کرنے کے معجزات عطا فرمائے جس کے کرنے سے تمام اطباء عاجز اور درماندہ تھے چنانچہ مولانا روم رحمۃ اللہ نے لکھا ہے ؎

صد ہزاراں طب جالینوس بود

پیش عیسی و دمش افسوس بود

اسی طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں مبعوث فرمائے گئے اس قوم کا مابہ الافتخار سرمایہ فصاحت و بلاغت تھا۔ اس میدان میں کوئی ان سے گوئے سبقت نہیں لے جا سکتا تھا لہٰذا قاعدہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ قرآن حکیم بھی فصاحت و بلاغت کا شاہکار اور خود آپؐ کے خطبات اور کلمات بھی جوامع الکلم تھے۔ کوئی شخص فصاحت و بلاغت میں آپؐ کا مثیل نہیں تھا۔ آپؐ کو جو کتاب عطا کی گئی اس کے بارے میں پوری تحدی کے ساتھ یہ کہا گیا کہ اگر سب جن وانس جمع ہو جائیں اور قرآن کا مثل لانا چاہیں تو اس کا مثل نہیں لا سکتے اگرچہ ان کے بعض بعض کے معاون و مددگار بن جائیں۔ پھر تنزل کر کے فرمایا اور کہا: ایک ہی سورت اس جیسی بنا لاؤ۔'' سورۃ میں یہ بھی قید نہیں لگائی کہ سورۃ بقرہ جیسی اڑھائی پارے کی ہی سورت لاؤ بلکہ اگر تم سورۃ الکوثر جیسی چھوٹی سی سورت ہی بنا لاؤ تو پھر بھی قابل قبول ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ظرف کے مطابق مظروف عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرۃ محمدیؐ کے مطابق آپؐ کے قلب اطہر اور زبان اقدس کو فصاحت و بلاغت کے تمام لوازمات کمال سے نوازا اور آپؐ کی خلقت میں خطابت کا اعجاز ودیعت فرمایا کیونکہ لالہ کی حنابندی قدرت خداوندی کا اپنا منصب ہے، چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا:

''اے اللہ کے رسولؐ! میں تمام عرب میں گھوما پھرا ہوں۔ ان کے فصیح و بلیغ خطباء کے خطبات کو سنا ہے لیکن آپؐ کی ذات اقدس سے بڑا فصیح و بلیغ خطیب میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ پس آپ کو یہ ادب کس نے سکھایا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے تو میرے رب نے ادب سکھایا ہے اور کیا خوب ادب سکھایا ہے۔''

(ادب العربی: ۳۴/۱، کنز العمال رقم: ۳۲۰۴)

یہ تھے چار ترکیبی عناصر نبوی فصاحت و بلاغت کے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا جس کے فیضان نے زبان نبوت کو پاکیزگی، طہارت اور شائستگی کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کے تمام اعلیٰ اوصاف سے نوازا تھا۔ عرب کے تمام فصحاء اور بلغاء نے رسول اللہ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کی تحسین اور ستائش کی ہے اور سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عربی زبان اور ادب کی تاریخ میں قرآن حکیم کے بعد فصاحت و بلاغت میں رسول اللہ ﷺ کے کلام کا مقام ہے۔ (الادب العربی وتاریخہ: ۳۴) آپ ؐ کا اسلوب خطابت و بلاغت چونکہ فیضان الٰہی کا ثمرہ تھا اس لیے اس میں وحی الٰہی کے اثرات نمایاں تھے۔ آپ ﷺ کے اسلوب خطابت میں تکلف اور تصنع نہ تھا بلکہ سادہ اور سلیس لیکن پرکشش اسلوب لفظی کے ساتھ نازک معانی بیان فرماتے تھے۔ بڑے بڑے شعراء نے بھی فصاحت نبوی ؐ کا اعتراف کیا اور اس بارے میں آپ ؐ کی تعریف و تحسین کی ہے چنانچہ بارگاہ نبوت کے مشہور شاعر سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ؎

لو لم تكن فيه آيات مبينة

كانت بداهة تبنيك بالخبر

''اگر آپ کے پاس واضح نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو آپ کی خطیبانہ ہدایت گوئی تجھے حقیقت حال کی خبر دے دیتی۔'' (عیون الاخبار: ۲۲۴/۱، البیان والتبیین: ۱۰/۱)

اور ایک مصری شاعر احمد شوقی سرکار دوعالم ﷺ کے اثر انگیز اسلوب بیان کا تذکرہ ان شعر میں کرتا ہے ؎

و اذا خطبت فللمنابر هزة

تعرو الندى وللقلوب بكاء

یعنی جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے ہیں تو منبر بھی جھوم اٹھتے ہیں، محفل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور دل رونے لگتے ہیں۔

آپ ؐ کو چونکہ جوامع الکلم عطا کیے گئے تھے، اس وجہ سے آپ ؐ کے اسلوب خطابت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ کے کلام میں الفاظ تھوڑے ہوتے تھے لیکن اس کے معانی میں ایک بحرز خار مضمر ہوتا تھا۔ یہ صفت اور خصوصیت ایک قادر الکلام خطیب میں پائی جاتی ہے اور ہر خطیب کے بس کی یہ بات نہیں ہے لیکن آپ ؐ کے کلام میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ آپ کی خطابت میں تصنع اور تکلف نہیں تھا، باچھیں کھول کر بات کرنا اور گلے سے آواز نکالنا، ان باتوں سے آپ ؐ کو سخت نفرت تھی۔

جاحظ نے لکھا ہے کہ:

"کچھ خطباء باچھیں کھولنے اور ہونٹ لٹکانے میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ جب سرکار دو عالم ﷺ تشریف لائے تو آپ ؐ نے باچھیں کھولنے سے روکتے ہوئے فرمایا: "فصاحت دکھانے کے لیے باچھیں نہ کھولو، مجھے سب سے زیادہ وہ لوگ ناپسند ہیں جو فضول بک بک کرتے ہیں اور بہت منہ پھلا کر باتیں کرتے ہیں۔" (البیان والتبیین: ۱/۱۳)

جہاں بات کو طول دینا اور کسی بات کی تفصیل پیش کرنا ہوتی تو وہاں آپ شرح وبسط سے کام لیتے اور جہاں اختصار کی ضرورت ہوتی وہاں اختصار اور جامعیت سے کام لیتے۔ کلام میں آپ ﷺ نے سوقیانہ اور نامانوس الفاظ کبھی استعمال نہیں فرمائے۔ آپ جب تقریر فرماتے تو بات اس قدر واضح اور عام فہم فرماتے کہ ہر ذہنی سطح کا انسان اس کو سمجھ جاتا اور دوبارہ سننے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ جب بات کرتے تو حکمت و دانش کے موتی دہن مبارک سے گرتے نظر آتے۔ آپ ؐ کا کلام ہر نقص اور عیب سے پاک ہوتا اور جو کچھ فرماتے وہ سننے والوں کے ذہن وقلب میں اترتا چلا جاتا۔ جب کبھی آپ ؐ طویل تقریر فرماتے تو وہ بھی مختصر مگر پرمغز جملوں پر مشتمل ہوتی۔ چنانچہ خطبہ حجۃ الوداع اس کی بین دلیل ہے۔ آپ ؐ کی خطابت میں نہ تو سست روی ہوتی اور نہ تیزی اور جلد بازی۔ بات حق وصداقت پر مبنی ہوتی اور الفاظ کے ہیر پھیر کا آپ ﷺ نے کبھی سہارا نہیں لیا۔ الفاظ ومعانی میں توازن واعتدال ہوتا اور اثر انگیزی اور بلندیٔ مقصد آپ ؐ کی خطابت کی امتیازی خصوصیت ہوتی۔ اس وجہ سے

علماء نے لکھا ہے کہ کلام نبوت سے سہل تر لیکن فصیح ترین کلام اور کسی کا نہ ہوتا تھا اور نہ ہوگا چنانچہ فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین نمونے آپؐ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

جاحظ نے لکھا ہے کہ:

''اگر آپ کلام کو طول دیتے تو اس انداز سے طول دیتے کہ ہر طول دینے والا اس سے عاجز و درماندہ تھا اور جب آپؐ کلام میں اختصار اور ایجاز سے کام لیتے تو اتنا اختصار فرماتے کہ ہر خطیب کے آخری درجہ اختصار کو بھی شکست دے دیتے۔ لکھنے اور شعر کو موزوں پڑھنے کے علاوہ کلام نبوت میں فصاحت و بلاغت کی ہر خوبی اور صفت موجود تھی۔'' (البیان والتبیین: ۴/۴۳)

اسی ضمن میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عام لوگوں کی طرح جلدی جلدی نہیں بولتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بالکل واضح اور صاف ہوتا تھا جس کو سننے والا نہایت آسانی سے حفظ کر سکتا تھا۔ (ترمذی)

بلکہ روایات میں آتا ہے کہ اہم باتوں کو آپؐ تین تین مرتبہ دہراتے تھے بلکہ آپؐ کے الفاظ سننے والے کے ذہن و قلب میں پیوست ہو جاتے اگر کوئی آپؐ کے کلام کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن بھی سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سادہ، بے ساختہ اور تصنع سے یک قلم خالی ہوتا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۲۷۵)

آپؐ نے طویل خطبات بھی دیئے۔ بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی کئی گھنٹے خطبہ دیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی طویل تقریر فرمائی کہ مسلسل کئی نمازیں خطبہ میں وقفہ ڈال کر ادا فرمائیں اور نماز سے فارغ ہوتے ہی سلسلہ کلام کو وہیں سے شروع فرماتے جہاں سے چھوڑا تھا لیکن یہ طویل خطبات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اپنی بات بڑھانے یا طویل کلام پر اپنی قدرت کے اظہار کے لیے نہیں دیئے۔

خطابت میں آواز کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس کے نشیب و فراز سامعین پر مختلف اثرات ڈالتے ہیں۔ سامعین کے لیے آواز کی کھنک کے ساتھ حسن صوت کا ہونا بے حد اثر انگیز ہوتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے زور خطابت کے ساتھ ساتھ حسن صوت سے بھی

نوازا ہوتا ہے چنانچہ لحن داؤدی آج تک عوام وخواص میں مشہور چلا آ رہا ہے۔ جب آپ اپنی پرسوز اور آہنگ آمیز آواز میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مناجات کرتے تو جن وانس، چرند و پرند اور دشت وجبل جھوم اٹھتے۔ (البیان والتبیین: ۲۹۲/۳) اللہ تعالیٰ نے سرکار دوعالم ﷺ کو حسن صورت کے ساتھ حسن صوت کی نعمت عظمیٰ سے بھی نوازا تھا۔ آپؐ کی آواز کی شیرینی اور حلاوت سے اہل ایمان کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی۔

مختصر یہ کہ آپؐ کا اسلوب خطابت فصاحت وبلاغت کے اعلیٰ مدارج پر تھا جو واضح اور عمدہ عبارات پر مشتمل ہوتا تھا۔ زبان میں سلاست بھی تھی تاکہ ہر شخص اس کو سمجھ سکے۔ کلام میں تکلف اور تصنع نہیں تھا۔ آپ کو جوامع الکلم عطا فرمائے گئے تھے اور تمام قبائل عرب کی لغات اور لہجات سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس لیے آپؐ ہر قبیلہ کے لوگوں سے انھی کے لب ولہجہ اور اسلوب بیان میں کلام فرماتے تھے۔ قریش مکہ، انصار مدینہ اور نجد وحجاز کے لوگوں کے ساتھ آپؐ جو انداز تکلم اختیار فرمایا کرتے تھے وہ انداز تکلم اس سے مختلف ہوتا تھا جو آپ یمن حمیر اور قحطانی عربوں کے ساتھ اپنی گفتگو میں اختیار فرماتے۔ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بعض دفعہ اس پر تعجب بھی ہوتا تو آپؐ ان کی حیرت کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے:

''یہ تو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے اور قرآن حکیم بھی تو میری زبان پر ہی نازل کیا گیا ہے۔'' (عظمۃ الرسول: ۲۷۵، علامہ عطیہ الابراشی، الشفا لقاضی عیاض: ۱/۱۷۷)

خطبہ کے دوران جس طرح اور خطباء پر جوش وجذبہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ آپؐ پر بھی طاری ہوتی لیکن ان سے مختلف۔ موقع کی مناسبت سے جب آپؐ جوش میں آتے تو آپؐ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز گرج دار اور بلند ہوتی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور قوت و جبروت کا ذکر ہوتا تو آپؐ کے چہرۂ اقدس پر غصہ کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے۔ جوش خطابت میں بعض دفعہ انگلیاں اٹھ جاتی تھیں، جسم جھومنے لگتا تھا، کبھی مٹھی بند کر لیتے اور کبھی کھول دیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے منبر پر فرمایا کہ خالق ارض وسماء اس زمین وآسمان کو اپنی مٹھی میں لے لے گا پھر ساتھ ہی آپؐ نے اپنی مٹھی کو بند کر لیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ آپؐ کبھی اپنی مٹھی بند کرتے اور کبھی کھولتے، آپؐ دوران خطبہ کبھی دائیں جانب جھکتے اور کبھی بائیں جانب۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

''جبار زمین وآسمان کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور آپ کبھی اپنا ہاتھ کھولتے اور کبھی مٹھی بند کر لیتے اور کبھی دائیں جانب جھکتے اور کبھی بائیں جانب حتی کہ میں نیچے سے منبر کو دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں منبر آپ کو ساتھ لے کر نیچے ہی نہ آ رہے۔'' (مسند احمد بن حنبل: ۶/۴۰۲)

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البیان والتبیین: ۱/۶۹، طبقات ابن سعد: ۱/۹۰، مسلم: ۱/۲۸۴، زاد المعاد: ۱/۴۸، سنن ابن ماجہ: ۲/۲۴۷، سیرۃ النبی: ۱/۲۳۵، اعلام النبوۃ، علامہ الماوردی، احیاء علوم الدین، غزالی: ۲/۲۷۴)

شیخ عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب ''عبقریۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' میں بڑے پتے کی بات فرمائی:

((واتفقت الروايات على تنزيه نطقه من عيوب الحروف ومخارجها وقدرته على ايقاعها في احسن مواقعها.))

''اور تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق اور قوت گویائی حروف اور ان کے مخارج کے عیوب سے یک قلم پاک تھی اور یہ کہ آپ ان حروف کے خوبصورت ترین اور موثر ترین طریقے سے ان کے مواقع پر ادا کرنے پر پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔''

ایک اور دانشور اور ادیب الاستاذ محمود مصطفیٰ فصاحت نبویؐ پر لکھتے ہیں کہ:

''سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام میں اس قسم کے سجع سے اجتناب فرماتے تھے جس سجع کا التزام کاہن لوگ کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں پر غالب آسکیں اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور لوگوں کو بھی متنبہ کیا کہ ان لوگوں سے ہوشیار اور خبردار رہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہایت پاکیزہ الفاظ، واضح اسلوب، خوبصورت اختصار اور بلند اور اعلیٰ معانی پر مشتمل ہوتا تھا۔ آپؐ کے ارشادات اس لائق ہیں کہ ان کے افکار سے فضل وکمال حاصل کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام

قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ (لذالك كان ابلغ كلام عرفه الناس بعد القرآن)

حقیقت یہ ہے کہ الفاظ نبوت ایسے ہیں کہ انھیں ایک ایسے دل نے تشکیل کیا ہے جو اپنے خالق کے جلال و جمال سے بہت لگاؤ رکھتا ہے اور پھر ان الفاظ کو ایک ایسی زبان نے صیقل کیا جس پر قرآن حکیم اپنے حقائق سمیت نازل ہوا تھا۔ یہ الفاظ اگرچہ وحی نہیں لیکن یہ آئے وحی کے راستہ سے ہیں۔ یہ وحی ربانی کی تصدیق ہیں کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىO﴾ (النجم۵۳:۳۔۴)

یہ ایک پختہ انداز کا کلام ہے جس کا کوئی حلقہ بھی ڈھیلا نہیں۔ اس میں کوئی لفظ بھی فالتو اور زائد نہیں ہے۔ آپؐ کا کلام اختصار و ایجاز اور افادیت کے لحاظ سے یوں لگتا ہے جیسے کسی دل کی نبض بول رہی ہے۔ بلندیٔ فکر اور عمدگیٔ الفاظ میں یہ کلام خواطرِ نبوت کا مظہر ہے۔ اگر یہ الفاظ وعظ کے لیے ہوتے تو یوں لگتا جیسے کسی زخمی جگر کی آہیں ہوں، اگر اس میں پنہاں حکمت کو دیکھا جاتا تو یوں لگتا جیسے روح بشریت کی تصویر ہے۔ ان کا رجحان آنسوؤں کی روانی اختیار کرتا ہے اور اگر شدت اختیار کر لے تو خون ٹپک پڑتا ہے۔ قرآن حکیم سے اگر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ زمین کے نام آسمان کا پیغام ہے تو کلام نبوت سے آپ کو پتہ چلے گا کہ اگرچہ زمین کا کلام ہے لیکن اس کا مرتبہ کلام آسمانی کے بعد کا ہے۔

پختہ انداز ادا، شیریں کلام، شان فصاحت و بلاغت اور سلاست اسلوب کی کوئی ایسی صفت نہ ہوگی جو سرکار دو عالم ﷺ کے کلام میں موجود نہ ہو۔ یہ سب اوصاف فطرتِ محمدیؐ میں داخل تھے۔ یہ محنت ومشقت اور ریاضت سے آپؐ کو حاصل نہ ہوئے تھے بلکہ قدرت خداوندی نے آپؐ کو ان اوصاف کے لیے اسباب ووسائل مہیا کر دیئے تھے۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت لسانی نے خود عربی زبان پر بہت اثر ڈالا۔ وضع اور اشتقاق الفاظ، ایجاز و ابداع، اسالیب بیان میں آپؐ کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوسکا۔ آپ ﷺ نے ایسی تراکیب اور محاورات ایجاد فرمائے جن سے عرب پہلے آشنا نہ تھے اور نہ انھوں نے کبھی ان کو استعمال کیا تھا۔ پھر لسان نبوت سے نکلے ہوئے وہ محاورات اور تراکیب ضرب المثل بن گئے۔ جیسے

(مات حتف انفه) ''یعنی وہ اپنی ناک کی موت مرا۔'' یہ محاورہ اس سے قبل عربوں کے ہاں استعمال نہیں ہوتا تھا۔

شیخ مصطفےٰ صادق الرافعی جدید عربی ادب میں قدامت پسند مصری ادباء اور علماء کے سرخیل تھے۔ قدیم اسالیب نگارش کے دفاع میں الرافعی نے بڑے زور دار اور مضبوط دلائل دیئے ہیں اور ان کا عظیم الشان کارنامہ ''اعجاز القرآن'' ہے۔ اس کتاب کی ایک فصل بلاغتِ نبویؐ کے لیے مختص ہے۔ جس میں انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے اسالیب بلاغت کے تمام پہلوؤں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس میں وہ سرکار دو عالم ﷺ کی بلاغت کے پانچ خصائص بیان کرتے ہیں:

- ایک یہ کہ کتاب اللہ کے بعد عربی فصاحت و بلاغت کی تاریخ میں کوئی ایسا خطیب نہیں ہوا جو فصاحت و بلاغت میں آپ ﷺ کا ہم پلہ اور مثل ہو سکے یعنی قرآنی بلاغت کے بعد بلاغت نبویؐ کا ایک بے مثل اور منفرد مقام ہے۔
- دوسری خصوصیت آپ ﷺ کی بلاغت کی یہ ہے کہ کلام نبوت میں ایسی تراکیب موجود ہیں جو قلت الفاظ کے ساتھ کثرت معانی کا رنگ لیے ہوئے ہیں، یعنی چند الفاظ میں خطابت کے وسیع سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
- تیسری خصوصیت کو بلاغت کی اصطلاح میں خلوص سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی کسی کام کا ابہام یا مغالطہ باقی نہیں رہتا۔ الفاظ ومعانی میں ایسی پختگی اور وضاحت ہوتی ہے کہ سامع کو بات کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔
- چوتھی خصوصیت کو قصد واعتدال کہا جاتا ہے یعنی لفظ ومعنی میں ایجاز و اقتصار اور ایسا توازن واعتدال پایا جاتا ہے جسے اقتصار لفظی کہتے ہیں۔
- اور پانچویں خصوصیت کلام نبوت کی استیفاء ہے، جس کا مطلب ہے کہ سامع کے دل میں کوئی تشنگی یا مزید طلب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ الفاظ و معانی اس کی تسلی کر دیتے ہیں اور اس کی تشنگی ختم ہو جاتی ہے۔

ان پانچ خصوصیات کے علاوہ کچھ اور خصوصیات بھی علماء نے لکھی ہیں:

- خطیب کے لیے اچھی اور بلند آواز کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس نعمت سے بھی نوازا تھا۔ آپ ؐ کی ذات میں یہ دونوں صفات بھی جمع تھیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے منیٰ میں جو خطبہ دیا، اسے لوگوں نے اپنے خیموں اور منازل میں سنا اور سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اپنے گھر میں آپ کے قرآن کی قرأت سنی۔

سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مابعث الله نبيا قط الا بعثه حسن الوجه حسن الصوت حتى بعث نبيكم فبعثه حسن الوجه حسن الصوت ، ولم يكن يرجع ولكن كان يمد بعض المدّ .)) (طبقات ابن سعد: ۱/۳۷۶)

"اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا وہ خوبصورت اور اچھی آواز والا تھا یہاں تک کہ تمھارے نبیؐ کو بھی حسین صورت اور حسین آواز دے کر بھیجا۔ آپ ﷺ بات کو لوٹاتے نہیں تھے بلکہ آواز کچھ لمبی کر دیتے تھے۔"

ایک اور روایت میں فرمایا گیا:

((كان صوت رسول الله ﷺ يبلغ حيث لا يبلغ صوت غيره .)) (طبقات ابن سعد: ۲/۱۸۵)

"رسول اللہ ﷺ کی آواز وہاں تک پہنچتی تھی جہاں کسی دوسرے کی آواز نہ پہنچتی تھی۔"

- خطیب اپنی بات کو سمجھانے کے لیے عمدہ اور سہل انداز اختیار کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس طرح گفتگو فرماتے کہ سننے والا آپؐ کی بات کو حفظ کر لیتا۔ آپ ہر بات کو تین مرتبہ دہراتے تاکہ سننے والے کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((ما كان رسول الله ﷺ يسرد كسرد كم ولكن كان يتكلم بكلام بين فصل يحفظه من جلس اليه .))

"رسول اللہ ﷺ کی گفتگو تم لوگوں کی طرح لگاتار اور جلدی جلدی نہیں ہوتی

تھی بلکہ صاف صاف مضمون دوسرے سے ممتاز ہوتا جو پاس بیٹھنے والے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ:

((ویتکلم بجوامع الکلم، کلامه فصل، لا فضول، ولا تقصیر.)) (شمائل ترمذی:۲۰۱)

"آپ ﷺ جامع الفاظ کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا تھا، نہ اس میں فضولیات ہوتی تھیں اور نہ کوتاہیاں۔"

بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ:

"جب آپؐ کلام فرماتے تو اسے تین بار دہراتے تا کہ سننے والوں کو اچھی طرح سمجھ آ جائے۔ آپؐ کی گفتگو جو بھی سنتا یاد کر سکتا تھا۔ آپ ﷺ اس طرح گفتگو فرماتے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔"

(بخاری:۴/۱۶۸، مسلم:۸/۲۹۹)

- ایک خصوصیت آپؐ کے خطبات کی یہ ہے کہ آپؐ خطبات میں اکثر و بیشتر اختصار پسندی سے کام لیتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ ہونے کی دلیل ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۃ ق پڑھتے تھے۔ (مسلم:۳/۱۲، ابوداود: ۱/۶۶۰) مدینہ طیبہ میں تشریف لا کر سب سے پہلا جملہ جو زبان مبارک سے نکلا تھا وہ یہ تھا:

((یا ایها الناس! افشوا السلام، واطعموا الطعام، وصلوا الارحام، وصلوا باللیل والناس نیام، تدخلوا الجنة بسلام.)) (ابن ماجہ:۲/۱۰۸۳، ترمذی:۴/۸۷)

"اے لوگو! سلام کو عام کرو، کھانا کھلایا کرو، صلہ رحمی کرو، اور اس وقت نماز پڑھا کرو جب دیگر لوگ سوتے ہوں، سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

اسی طرح آپؐ دوسرے خطبات میں بھی اختصار سے کام لیتے تھے۔

موضوعات:

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے سرکار دو عالم ﷺ کے بارے میں لکھا ہے:

''اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف اخلاقی معلم ہی نہ تھا اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض جہانگیر اور عالم شاہ شہنشاہ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے شریعت کو حکومت و جہاں بانی سے الگ نہیں رکھا۔ وہ تو یہ سکھانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہے اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے بلکہ سچی حکومت اور اللہ کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خود پیدا کیا ہو۔ پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں ان تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہے۔''

''وہ اللہ کا پیغمبر تھا۔ شریعت کا حامل تھا۔ امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا بانی تھا۔ وہ اگر پتوں اور چھال سے بنی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت وہدایت کا واعظ تھا تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح وطلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا۔ غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے اور اسلام کا نظام دینی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔'' (مسئلہ خلافت:۱۹)

اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق وانشقاق کی تمام تاریکیوں کو یک قلم مٹا دیا اور اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود وابیض اور عرب وعجم کی تمیز نہ تھی۔ اللہ کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ رب العالمین تھا لہٰذا ضروری تھا کہ اس کی راہ میں دعوت دینے والا بھی رحمۃ للعالمین ہو۔

جب آپ ﷺ کی اتنی حیثیتیں تھیں تو آپؐ نے جس خطابت اسلامیہ کی بنیاد رکھی اس کے موضوعات بھی بدل گئے۔ عہد جاہلیت کے بعض موضوعات بالکل متروک ہو گئے اور عہد اسلامی کی بدولت بعض نئے موضوعات متعارف ہوئے۔ اسلامی خطابت کے غالب موضوعات دینی اور سیاسی ہیں۔ آپ ﷺ کے خطبات میں دعوت اسلامی (ابن اثیر: ۲/۲۷) وعظ ارشاد، تقویٰ اور عمل صالح کی دعوت (سیرۃ ابن ہشام: ۴/۵۴، ۳/۱۴۶ اور تحریض علی القتال: ۱/۲۸۰) کے موضوعات بکثرت مرکز گفتگو بنے ہیں۔ آپؐ نے مختلف وفود سے بھی گفتگو کی اور اصلاح ذات البین کی بات بھی کی اور خطاب عام بھی فرمایا: لیکن آپؐ کے خطبات کا عمومی موضوع دینی وسیاسی اور اصلاحی رہا۔ درحقیقت سرکار دوعالم ﷺ کی مختلف حیثیتیں تھیں اور آپؐ کی ہر حیثیت کا اثر آپؐ کے طرز بیان پر پڑتا تھا۔ آپؐ داعی مذہب تھے، ناصح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے۔ اس اختلاف نے آپؐ کی خطابت کے موضوعات اور زور بیان میں نہایت تنوع پیدا کر دیا تھا اور بلاغت کا اقتضاء بھی یہی ہے کہ آپ بحیثیت داعی دین ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں زور خطابت بھی ہوتا تھا اور جوش بھی۔ اس وقت آپؐ کی حیثیت ایک امیر الجیش کی ہوتی۔ آپ نے مختلف مواقع پر جو خطبات ارشاد فرمائے ان سے ایک طرف تو موضوعات کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت واضح ہوتی ہے۔ آپؐ نے ہر موقع پر انتہائی دلنشین گفتگو فرمائی ہے۔

جوامع الکلم

سرکار دو عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اختصار کی خصوصیت بھی عطا فرمائی تھی۔ اختصار کا مطلب یہ ہے کہ آپ گفتگو نہایت سلیقے سے اور نپے تلے الفاظ میں کرتے کہ ذوق سلیم جھوم اٹھتا اور رعنائی خیال کو وجد آ جاتا۔ آپ کی بات چیت اور خطابت میں ایک لفظ بھی زائد نہیں ہوتا تھا اور آپ ﷺ جو کچھ فرماتے قلب سلیم کی گہرائیوں میں آپ کے وہ الفاظ اتر جاتے اور سامعین کے لبوں پر تبسم و مسکراہٹ کے پھول کھل جاتے۔ آپ کی گفتگو کے ہر جملہ پر جامعیت کے چراغ روشن ہوتے اور حکمت و آگہی کے سمندر موجزن ہوتے۔ آپ ﷺ نے اپنی معجزانہ خطابت سے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ رومۃ الکبریٰ کے ایوان قدس کی بنیادیں تعبد، وغلامی کی زنجیریں آپ کی خطابت کی غیر آہنی شمشیر کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔ آپ کے جلال روحانی سے بھری ہوئی ایک آواز جو بوقبیس کی پہاڑی سے بلند ہوئی اس سے گنبد عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا اور انسانی جباری اور الوہیت کے بت سرنگوں ہو گئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ جوامع الکلم بھی عطا فرمائے گئے جیسا کہ حدیث میں ہے:

((اعطیت جوامع الکلم))

''مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے گئے ہیں۔'' (مسلم رقم: ۵۲۳، ترمذی رقم: ۱۵۵۳، مسند احمد بن حنبل رقم: ۹۳۲۶، سنن کبریٰ بیہقی: ۹/۵، صحیح ابن حبان رقم: ۶۴۰۱، ۶۴۰۳، مسند ابی یعلی: ۱۱/۳۷۷)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((بعثت بجوامع الکلم))

''یعنی میں جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔'' (بخاری رقم: ۲۸۱۵، ۶۶۱۱، ۶۸۴۵، مسلم: رقم: ۵۲۳، نسائی رقم: ۳۰۸۷، ۳۰۸۹، مسند احمد رقم: ۷۵۷۵، ۹۸۶۷، صحیح ابن حبان: ۱۴/۲۷۷)

بیہقی، ابویعلی اور دار قطنی میں جو روایت آتی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

((اعطیت جوامع الکلم واختصرلی الکلام اختصارا .))

(مسلم:۱/۹۹،مشکوٰۃ:۵۱۲)

''مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے گئے اور نہایت مختصر کلام مجھے عطا فرمایا گیا۔''

جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے فصاحت و بلاغت اور معانی میں ژرف نگاہی اور نہایت مختصر الفاظ میں عبارات کے محاسن عطا فرمائے گئے۔ قرآن حکیم کی ایک ایک آیت اپنے اندر معانی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے اور انھی معانی کی تفسیر و تشریح چودہ سو سال سے مفسرین امت کرتے چلے آرہے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ؏

ماہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

پھر قرآن حکیم جس طرح اپنے اندر ایک اعجازی شان لیے ہوئے ہے اسی طرح آپ ﷺ بھی مترجم اور مفسر قرآن ہونے کی حیثیت سے اپنے کلام میں اختصار کا اعجاز رکھتے ہیں یعنی حروف و الفاظ کے اعتبار سے تو کلام مختصر لیکن معانی کے لحاظ سے بہت جامع اور وسیع۔ عربی ادب میں اس قسم کے کلام کو ''جوامع الکلم'' کہا جاتا ہے۔ جاحظ نے جوامع الکلم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

((وھو (الکلام) القلیل الجامع لکثیر .))

''یعنی جامع الکلم سے مراد ایسا کلام ہے جس کے الفاظ قلیل ہوں لیکن معانی کثیر ہوں۔'' (البیان والتبیین:ج۴/۲۹)

بعض دوسرے علماء نے جناب ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جوامع الکلم کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ ؐ کا وہ جامع کلام جس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا، جو جامع کلمات اور عجیب و غریب حکمت پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے الفاظ و حروف کی تعداد تو قلیل لیکن ان مختصر الفاظ میں معانی کا بحر زخار مضمر ہوتا ہے۔ (الشفاء:۱/۱۷۳) قاضی عیاض نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ آپ ؐ کے جوامع الکلم سے لوگوں نے اپنے دفاتر انشا کو سجایا تو لوگوں نے اس بارے میں دیوان اور دفاتر تصنیف کر ڈالے۔ (الشفاء:۱/۱۶۷) پھر آپ کے

وہ جوامع الکلم انوکھی حکمت سے بھرے ہوئے تھے۔ (عظمۃ الرسول: ۲۷۷) اور امام غزالی رحمہ اللہ نے آپ ؐ کے جوامع الکلم کے بارے میں لکھا ہے:

''رسول اللہ ﷺ انسانوں میں سب سے زیادہ اختصار اور ایجاز سے کلام فرماتے تھے۔ یہ خصوصیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل علیہ السلام لائے تھے۔ آپ ؐ اختصار کے ساتھ اور جتنی اختصار کے ساتھ جامع بات کرنا چاہتے تھے، کر لیتے تھے۔ آپ ؐ کے کلام میں کوئی فالتو اور فضول لفظ نہیں ہوتا تھا اور نہ اس میں کسی لفظ کی کوئی کمی ہوتی تھی۔'' (احیاء علوم الدین: ۲/۲۷۴)

جوامع الکلم کی چند مثالیں:

ویسے تو آپ ﷺ کی تمام باتیں ہی جوامع الکلم میں لیکن یہاں آپ ؐ کی چند احادیث نقل کر رہے ہیں جن میں مختصر الفاظ میں سمندروں کی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے۔

- ((لاتشرب الخمر، فانها مفتاح كل شر .))

''شراب مت پیو کیونکہ یہ ہر برائی کی کنجی ہے۔'' (ابن ماجہ رقم: ۲۳۷۱، مستدرک حاکم: ۴/۱۶۲)

- ((ارحموا ترحموا))

''رحم کرو تاکہ تم پر بھی رحم کیا جائے۔'' (مسند احمد: ۲/۱۶۵، شعب الایمان بیہقی: ۵/۴۴۹)

- ((الحكمة ضالة المومن))

''حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے۔'' (ترمذی: ۵/۵۱، ابن ماجہ رقم: ۴۱۶۹)

- ((حبك الشئى يعمى ويصم))

''کسی شے کی محبت تجھے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے۔'' (ابوداؤد رقم: ۵۱۳۰، مسند احمد: ۵/۱۹۴)

- ((الحياء كله خير))

''حیا سب کی سب خیر ہے۔'' (مسلم رقم: ۳۷، ابوداؤد: ۴/۲۵۲، مسند احمد: ۴/۴۳۶)

- ((اذا لم تستحى فاصنع ما شئت))

''جب تو حیا نہیں کرتا تو پھر جو تو چاہتا ہے وہ کر۔'' (بخاری: رقم: ۵۷۶۹، ابوداؤد رقم: ۷۹۷)

- ((الجنة تحت اقدام الامهات))

''جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔'' (کنز العمال رقم: ۴۵۴۳۸)

- ((خير الامور اوسطها))

''بہترین کام وہ ہیں جن میں میانہ روی ہو۔'' (جامع الصغیر: ۱/۲۲۴، زرقانی شرح الموطا: ۴/۳۱۶)

- ((الجماعة رحمة والفرقة عذاب))

''جماعت اللہ کی رحمت ہے اور تفرقہ ایک عذاب ہے۔'' (مسند احمد: ۴/۳۷۵)

- ((خير كم خير كم لاهله، وانا خير كم لاهله))

''تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے اہل وعیال اور گھر والوں کے لیے بہتر ہوں۔''

(ترمذی رقم: ۳۸۹۵، ابن ماجہ رقم: ۱۹۷۷)

- ((القناعة مال لا ينفد))

''قناعت ایک ایسی دولت ہے جو فنا نہیں ہوتی۔'' (معجم الاوسط، طبرانی رقم: ۴۶۹۹)

- ((ان من البيان لسحرا))

''بے شک بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔'' (بخاری رقم: ۵۴۳۴، مسلم رقم: ۸۶۹، ترمذی رقم: ۲۰۲۸)

- ((ليس الشديد بالصرعة، انما الشديد الذى يملك نفسه عند الغضب))

''طاقتور وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر کنٹرول رکھے۔'' (مسند احمد: ۴/۲۳۶، ۲۴۰، ۲۴۲، معجم کبیر طبرانی رقم: ۴۹۳، ۲۰۶)

- ((اتق الله فى عسرك ويسرك))

''تنگی اور آسانی میں اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (کنز العمال رقم: ۵۶۲۷)

- ((اسمح يسمح لك))

''سخاوت کر کہ تجھ پر سخاوت ہو۔'' (مسند احمد رقم: ۲۲۳۳، مجمع الزوائد: ۱۰/۱۹۳)

جاحظ نے بھی اپنی کتاب ''البیان والتبیین'' کی دوسری جلد میں ''جوامع الکلم'' کی کچھ مثالیں دی ہیں۔

- ((المرء كثير باخيه))

"آدمی اپنے بھائی کے باعث بہت کچھ بن جاتا ہے۔" (البیان:۲/۱۹)

- ((لا خير فی صحبة من لا يری لك مثل ما تری له))

"ایسے شخص کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں جو تیرے لیے بھی اسی انداز میں نہ سوچے جس انداز میں تو اس کے لیے سوچتا ہے۔"

- ((اليد العليا خير من اليد السفلی ، وابدا بمن تعول))

"اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور سب سے پہلے اسے دو جس کی تم پر ذمہ داری ہے۔" (البیان:۲/۱۹)

- ((الخير معقود فی نواصيها الخير اِلٰی يوم القيامة)) (البیان:۲/۲۰)

"گھوڑوں کی پیشانیوں پر بھلائی کے ہار سجا دیئے گئے ہیں قیامت تک کے لیے۔"

- ((ما قلّ وكفی خير من مما كثر والهی))

"جو تھوڑا ہو لیکن کفایت کرنے والا ہو وہ اس زیادہ سے بہت بہتر ہے جو غافل کر دے۔" (البیان:۲/۲۰)

- ((الخير فی السيف ، والخير مع السيف ، والخير بالسيف))

"بھلائی تلوار میں ہے، بھلائی تلوار کے ساتھ رہتی ہے اور بھلائی تلوار کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔" (البیان:۲/۲۰)

- ((ليس منا من خلق او صلق او شق))

"جو مصیبت میں بال منڈوائے، واویلا کرے یا کپڑے پھاڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" (البیان:۲/۲۰)

- ((لا تزال امتی صالحا امرها ما لم تر الامانة مغنماً والصدقة مغرمًا))

"میری امت کا معاملہ اس وقت تک اچھا رہے گا جب تک وہ امانت کو مال غنیمت اور زکوٰۃ وصدقات کو تاوان تصور نہیں کریں گے۔" (البیان:۲/۲۰)

- ((راس العقل بعد الایمان باللہ مداراۃ الناس))
''اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل ودانش کی بات لوگوں کا دل رکھنا ہے۔'' (البیان:۲/۲۰)
- ((لن یھلك امرؤ بعد مشورۃ))
''مشورہ کر لینے کے بعد کبھی کوئی انسان تباہ نہیں ہوگا۔'' (البیان:۲/۲۰)
- ((رحم اللہ عبدا قال خیرا فغنم او سکت فسلم))
''اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بندے پر ہوئی جو بھلائی کی بات کر کے باغنیمت رہا یا چپ رہ کر سلامت رہا۔'' (البیان:۲/۲۰)
- ((لا یملاء جوف ابن آدم الا التراب))
''انسان کا پیٹ تو صرف خاکِ گور ہی بھرتی ہے۔'' (البیان:۲/۲۱)
- ((لا تجلسوا علی ظهر الطریق ، فان ابیتم فغضوا الابصار ، وردوا السلام ، واھدوا الضال ، واعینوا الضعیف))
''راستوں میں مت بیٹھو، اگر بیٹھنا ہی ہو تو نظریں جھکا کر رکھو، لوگوں کے سلام کے جواب دو، بھٹکے ہوؤں کی راہ نمائی کرو اور کمزور کی مدد کرو۔'' (البیان:۲/۲۱)
- ((ایاکم والمشاراۃ ، فانھا تمیت الغرۃ وتحیي العرۃ))
''باہمی مخاصمت سے بچو کیونکہ اس سے خوبیاں مر جاتی ہیں اور عیوب زندہ ہو جاتے ہیں۔ (البیان:۲/۲۱)
- ((لا ینبغی للصدیق ان یکون لعانا))
''صدیق یعنی دوست کے لیے لعنت کرنے والا ہونا مناسب نہیں۔'' (البیان:۲/۲۲)
- ((ماھلك امرؤ عرف قدرہ)) (البیان:۲/۲۳)
''وہ شخص کبھی تباہ نہ ہوگا جس نے اپنی حیثیت پہچان لی۔''
- ((لو تکاشفتم لما تدافنتم))
''اگر تم کو ایک دوسرے کے عیوب معلوم ہو جایا کریں تو تم ایک دوسرے کی تکفین

وتدفین میں بھی شریک نہ ہوا کرو۔" (البیان:۲/۲۳)

- ((لیس من اخلاق المومن التملّق الافی طلب العلم))
"خوشامد مومن کے اخلاق میں سے نہیں مگر یہ کہ علم کی خاطر ہو۔"
- ((ارحموا عزیزا ذل، ارحموا عالما ضاع بین جهال))
"جو باعزت انسان ذلیل ہو جائے اس پر رحم کرو اور اس عالم پر بھی رحم کرو جو جاہلوں میں رہ کر ضائع ہو جائے۔"
- ((المرء مع من احب)) (الشفاء:۱/۱۷۴)
"بندہ (قیامت کے روز) اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس نے (دنیا میں) محبت کی۔"
- ((المستشار موتمن، وهو بالخیار ما لم یتکلم))
"مشورہ دینے والا امانت دار ہے، جب تک وہ راز منہ سے نہیں نکالتا اسے اپنی بات پر اختیار ہوتا ہے۔" (الشفاء:۱/۱۷۴، البیان:۲/۲۹)
- ((ذوالوجهین لا یکون عند الله وجیها))
"دو چہروں والا (دوغلا) اللہ کے نزدیک کبھی معزز نہیں ہوسکتا۔" (الشفاء:۱/۱۷۵)
- ((احبب حبیبك هونا ما، عسی ان یکون بغیضك یوما ما))
"اپنے محبوب سے قدرے ہلکی محبت کیا کر، ہوسکتا ہے وہ کسی روز تیرا مبغوض بن جائے۔" (الشفاء:۱/۱۷۵)
- ((الظلم ظلمات یوم القیامة))
"ظلم قیامت کی تاریکیوں میں سے ہے۔" (الشفاء:۱/۱۷۵)
- ((ان المومن لیدرك بحسن خلقه درجة الصائم القائم)) (الشفاء:۱/۱۷۵)
"مومن اپنے حسن اخلاق سے روزہ دار اور قائم اللیل کا درجہ حاصل کرسکتا ہے۔"
- ((لا یلدغ المومن من جحر واحد مرتین)) (نقد النثر:۹۴)
"مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔"
- ((ما اوی امرؤ شرا من طلاقة اللسان)) (نقد النثر:۱۱۱)

''زبان کی تیزی سے بڑھ کر انسان کو اور کوئی بری چیز نہیں دی گئی۔''

- ((الایمان قید الفتح)) (العقد الفرید:۳/۴)

''ایمان نے فتح کو مقید کر دیا۔''

- ((خیر الکاسب العامل اذا نصح)) (البیان:۱/۹۹)

''بہترین کمائی کرنے والا وہ مزدور ہے جو نیک نیتی سے محنت کرے۔''

- ((افضل الاعمال عند الله ادومها وان قل)) (البیان:۱/۹۹)

''اللہ کے نزدیک بہترین کام وہ ہے جس میں ہیشگی ہو اگر چہ وہ کام تھوڑا ہی ہو۔''

- ((تعلموا لغة قوم تامنوا شرهم)) (البیان:۱/۹۹)

''جس قوم کی زبان سیکھ لو گے اس کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔''

- ((المومن القوی خیر من المومن الضعیف)) (البیان:۱/۹۹)

''طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔''

- ((من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه)) (البیان:۱/۹۹)

''انسان کے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی اور لغو باتوں کو چھوڑ دے۔''

- ((افضل الصدقة جهد المقل)) (اعلام النبوۃ:۱۵۱)

''بہترین صدقہ کم سے کم کوشش کرنے والے کی کوشش ہے۔''

- ((ترك الشر صدقة)) (البیان:۲/۲۱)

''شر (برائی) کا چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے۔''

- ((السعید من وعظ بغیره)) (اعلام النبوۃ:۱۵۱)

''نیک بخت وہ ہے جو دوسرے سے عبرت حاصل کرے۔''

- ((ان الله یبغض البلیغ الذی یتخلل بلسانه تخلل البقرة))

''اللہ تعالیٰ اس خطیب بلیغ کو ناپسند کرتا ہے جو اپنی زبان کو مروڑ کر گائے کی طرح آواز نکالتے ہیں۔''

اس طرح کے ہزاروں جوامع الکلم احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

مکاتیب سید المرسلین ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے تمام پیغمبر اور رسول خاص قوموں، خاص شہروں اور خاص علاقوں کے لیے نذیر اور بشیر بن کر آئے اور اپنے محدود حلقوں اور علاقوں میں خدائی پیغام سنا کر حق رسالت و نبوت ادا کر کے اس دنیا سے انتقال فرما گئے۔ یہ تمام کواکب نبوت اپنے اپنے زمانہ میں ''وحی الٰہی کی آغوش میں تربیت پا کر'' دنیا کو روشن اور درخشاں بناتے اور اپنی اپنی قوم کو راہ ہدایت دکھاتے رہے لیکن سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت و رسالت کا فیضان کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لیے نہ تھا بلکہ آپ ﷺ کی بعثت ''بعثت عامہ'' تھی۔ اسی وجہ سے اس آفتاب نبوت کے طلوع نے چار دانگ عالم اور ربع مسکون کو درخشاں و تاباں کر دیا۔ آپ ﷺ کی تبلیغ عام ہوئی اور آپ ﷺ کی آغوش رحمت سے کل جہان نے راحت و آرام پایا۔

جس مقدس ہستی کے وجود میں، اس کے ہر ایک قول و فعل میں اور اس کے ہر ایک حرکت و سکون میں امت مرحومہ کے لیے اسوۂ حسنہ ہو اور اس کی مقدس زندگی کا اہم مقصد (تبلیغ) کا حق ادا کرنا ہو اور دور کمال شروع ہی سے بساط عمل پر نہ آجائے بلکہ اس کے لیے مراتب ہوں، درجات ہوں کہ ان کی تکمیل کے بغیر کوئی اس شاہراہ عمل سے گزر ہی نہ سکے کہ جس کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے۔ جب حق تعالیٰ شانہ کی عطاء و نوال اور جود و کرم کی بارش نے سید المرسلین ﷺ کو نبوت و رسالت کے اس مرتبہ علیا پر فائز کیا جس کا تصور بھی انسانی تخیل سے برتر ہے اور تکمیل نفس کے ان مدارج پر پہنچا دیا جس کے حصول سے اولین و آخرین عاجز و حیران ہیں تو حکم ہوا کہ ایک قدم آگے بڑھاؤ اور حق تعالیٰ شانہ کی توحید کا شیریں اور حلاوت آمیز پیغام سب سے پہلے اپنے خاندان اور قرابت والوں کو سناؤ اور انھیں بتاؤ کہ عبادت کی لائق اور پرستش کی سزاوار صرف اور صرف ایک ہی ذات والا صفات ہے۔

انہیں یہ بھی بتاؤ کہ ان بیس ہزار آقاؤں کا غلام ہونا بہتر ہے یا فقط ایک آقا اور مالک کا غلام ہونا۔ اس حکم خداوندی کی تعمیل میں آپؐ نے صفا کی پہاڑی پر ایک ایسی آواز دی جس کی گرج نے بہروں کو شنوا، اندھوں کو بینا اور گونگوں کو گویا کر دیا اور اسی ایک آواز نے اپنوں کو بیگانہ، دوستوں کو دشمن اور موافقوں کو مخالف بنا دیا۔

خدائے قدوس کا یہ منادی اللہ تعالیٰ کی یکتائی کا پیغام دینے کے لیے صفا کی چوٹی پر اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ نہ کوئی یار و مددگار ہے اور نہ کوئی ہمدرد و غم خوار۔ تنہا خدا پر بھروسہ کر کے مکہ میں بسنے والوں کو اور اپنے اہل خاندان کو آواز دیتا ہے اور مکہ کے قبائل کو پکارتا ہے۔ یہ آواز مکہ کے ہر باسی کے کان میں پہنچی بلکہ اس نے قبیلوں اور خاندانوں کو چونکا دیا کیونکہ یہ آواز ایک نہایت محترم شخصیت کی آواز تھی اور قریش کے تمام قبائل اس شخصیت کے نہایت گرویدہ تھے اور اسے ''الصادق'' اور ''الامین'' کے معزز القاب سے پکارتے تھے۔ آواز سنتے ہی تمام قبائل کے لوگ چھوٹے اور بڑے، خواص اور عوام جمع ہو گئے اور اب ہر شخص اس منادی کی ندا کا منتظر تھا۔ آپؐ نے ان سب سے پہلے ایک سوال کیا:

''لوگو! اگر میں کہوں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کے عقب میں ہے، یہاں ایک زبردست لشکر موجود ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم سب لوگ میری اس بات کی تصدیق کرو گے؟''

سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ''تیری بات کبھی غلط نہیں ہوئی اور تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، پھر آج ہم تیری بات کو کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں۔''

ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو گوش ہوش سے سنو۔ اس جہان کے علاوہ ایک اور جہان ہے، وہاں سب کو جانا ہے اور مالک حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ عمل کی کشت زار ہے اور وہ پاداش عمل کا کارزار۔ صرف اللہ کی ذات قابل پرستش ہے۔ خود ساختہ بتوں کو چھوڑو، اور ایک اللہ احد الصمد کو پوجو۔ ذرا غور کرو۔ عمل کی پونجی لٹ رہی ہے مگر تم بے خبر ہو، تم کھوٹے کو کھرا سمجھ رہے ہو۔ صراط مستقیم کی طرف آؤ اور کج روی سے بچو۔ یہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی جس نے سارے مکہ کی زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ سارے ایک دوسرے کا منہ تکنے

لگے، کوئی حیران و پریشان ہے تو کوئی غضبناک۔ اس ایک آواز سے عزیز بگڑ گئے، دوست دشمن بن گئے، یگانے بیگانے ہوگئے۔ آپ ﷺ کے اپنے ہی خاندان بنو ہاشم کا ایک بڈھا ابولہب (عبدالعزیٰ) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا اس اجتماع سے چل دیا:

''محمدؐ! تیرے ہاتھ ٹوٹیں، کیا تو نے آج اسی لیے ہمیں یہاں بلایا تھا۔'' (العیاذ باللہ)

(بخاری: ۲/۷۰۲، مسلم: ۱/۲۰۸، طبری: ۲/۳۱۹، روض الانف: ۲/۱۰۹)

ابولہب آپؐ کے والد ماجد عبداللہ کا بڑا بھائی تھا، عمر رسیدہ اور خاندان کا سرپرست تھا مال و دولت کا مالک بھی تھا۔ لوگوں نے جب اس کو خفا ہوتے دیکھا تو دوسرے لوگ بھی اس کو دیکھ کر چل دیئے لیکن آپؐ کی یہ دعوت بااثر رہی کیونکہ ہر آدمی کے ذہن میں آپؐ کی نبوت اور توحید خداوندی کی دعوت کا سوال گھر کر چکا تھا۔ وہ اپنے گھروں میں جا کر بھی اس بات پر غور و فکر کرتے رہے۔

ابولہب نے اگرچہ آپؐ کی مخالفت میں آواز اٹھائی، لیکن اس مقدس ہستی پر انھوں کی بے گانگی اور عزیزوں کی روگردانی کچھ بھی اثر نہ کر سکی۔ چنانچہ پیغام الٰہی کی یہ آواز فضا میں اسی طرح گونجتی رہی اور پھر چشم فلک نے ایک دن وہ بھی دیکھا کہ انھی دشمنوں کی دشمنی اور انھی عزیزوں کی بیگانگی یگانگت میں تبدیل ہوگئی کیونکہ کذب و صداقت کا معیار ہادی اور مصلح کا قول و عمل بنتا ہے نہ کہ کسی کا اقرار و انکار۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر اپنی عمر کے چالیس سال پیش کیے:

﴿لَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس: ۱۰۔۱۶)

''میں نے اپنی اس (نبوت کی) زندگی سے قبل عمر کا بہت بڑا حصہ تمھارے اندر گزارا ہے، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے۔''

یہی میری صداقت نبوت کی ایک سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی دھوکہ اور فریب کی بات نہیں کی، نہ میں نے کسی سے تعلیم حاصل کی، نہ لکھنا جانتا ہوں نہ پڑھنا، نہ کسی عالم اور مصلح کی ہم نشینی کی۔ پھر یک بہ یک میرا یہ دعویٰ اور اس دعویٰ کی اتنی زبردست دلیل یعنی قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، کیا میری صداقت کی دلیل

نہیں بن سکتی۔

آخر کار آپ کے اعزاء واقارب اور اہل خاندان کو حق کی اس آواز کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا اور کلمۂ توحید کی سربلندیوں نے خود بخود ان کے قلوب میں اپنی راہ پیدا کر لی۔ اب یہ آواز جو کوہ صفا کی چوٹی سے تنہا نکلی تھی، اب تنہا نہ تھی۔ حرم بیت اللہ میں، اللہ تعالیٰ کے حضور ایک پیشانی نہیں جھکتی تھی، اب سینکڑوں پیشانیاں جھکنے لگیں، چنانچہ جذبۂ حق کے اس متلاطم سمندر کو ہزاروں بند لگانے کے باوجود بھی وہ نہ روک سکے۔ توحید خداوندی کا یہ بے پایاں سمندر اور پیغام خداوندی کا یہ آفتاب عالم تاب اب آگے بڑھتا ہے اور وحی الٰہی کی روشنی میں دعوت اسلام نے اب ایک اور کروٹ بدلی۔ حکم ہوا کہ تبلیغ کا دائرہ وسیع کرو اور خاندان، قبیلے اور عزیزوں کی تبلیغ کے بعد اب دائرہ مزید وسیع کرو اور ہدایت کی اس روشنی کو مکہ اور اطراف مکہ میں پھیلاؤ۔

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشوریٰ ۴۲: ۷)

”اسی طرح ہم نے تیری جانب قرآن عربی کی وحی بھیجی تاکہ تو مکہ اور اطراف مکہ والوں کے لیے نذیر بنے۔“

قرآن کے اس حکم کے بعد پھر وہ سب کچھ ہوا جس کو سن کر عقل حیران اور پرواز خیال پریشان ہے۔ اب ایک لگن تھی جو آپؐ کو کبھی عکاظ کے بازار میں لے جاتی تو کبھی ذوالمجاز کے مجمع میں۔ محفل و مجلس میں، کوچہ و بازار میں، خلوت و جلوت میں، ایک ہی ندا اور ایک ہی صدا تھی۔ اللہ احد، اللہ الصمد۔

اب قریش مکہ نے معاندانہ کوششیں اور مجنونانہ کاوشیں شروع کیں جو اعلان حق کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی تھیں لیکن جو بھی آپ ﷺ کے قریب آتا سر نیاز خم کر دیتا اور دل کی گہرائیوں سے توحید خداوندی اور نبوت محمدیؐ کا اقرار کر لیتا۔ ابوجہل، ابولہب اور دیگر سرداران قریش کی کوششیں اور کاوشیں بارآور نہ ہو سکیں۔ ان کی ہر مخالفت کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کہنے والوں نے کیا کچھ نہ کہا، حاسدوں نے وہ کون سی بات اٹھا رکھی جو بغض

وحسد میں نہ کہی جاتی ہو۔ مفسدوں کی مفسدہ پردازی، موذیوں کی ایذا رسانی اور ظلم وجور کا تمام اسلحہ استعمال کیا گیا۔ کبھی کاہن کہا تو کبھی ساحر اور کبھی مجنون کہا تو کبھی شاعر اور کبھی کاذب کہا تو کبھی مفتری۔ (العیاذ باللہ) لیکن حق وصداقت کا یہ چراغ ان کی پھونکوں سے نہ بجھ سکا بلکہ آپؐ کی اس صدا نے مکہ اور اطراف مکہ میں عشق الٰہی کی بنیادیں ایسی استوار کر دیں کہ بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ جیسے حق کوش اور شیدایان توحید کو نہ جلتے ہوئے انگارے اور نہ تپتی ہوئی ریت کے تودے فنا کر سکے۔ احد، احد کا نعرہ جس نے ان کے قلب میں خرمنِ شرک کو جلا کر شمعِ توحید کو روشن کر دیا تھا، ہر لحہ ورد زبان تھا، اور قرآن نے کہا: ''مشرکین ارادہ کرتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافروں کو ناگوار گزرے۔''

بعثت عامہ:

اب وقت آ گیا رسول اللہ ﷺ اپنی بعثت عامہ کا، اعلان فرمائیں، لہٰذا فرمایا:

﴿قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸)

''آپ کہہ دیجئے! میں تمام دنیا کے لوگوں میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

داعی اسلام کی دعوت حق اگر اگلوں کی طرح کسی خاص دائرہ ہی میں محدود ہو کر رہ جاتی تو آپؐ کا رشتۂ نبوت ورسالت کسی خاص قبیلہ یا خاص قوم ہی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ خدا کا آخری پیغام، رشد وہدایت کا آخری سرچشمہ، ابلاغ اور اعلان حق کا بحر بے پایاں، توحید الٰہی کی آخری شمع اس طرح محدود ہو کر رہ جائے کہ اس کی روشنی اور اس کے ابرِ رحمت سے صرف ''ام القریٰ'' اور اس کے اطراف وجوانب کے رہنے والے ہی مستفید ہو سکیں اور باقی گیتی اور کائنات ہستی اس ابر رحمت سے یک قلم محروم رہے۔ نہیں، ہرگز نہیں، وقت آ پہنچا کہ آفتاب نبوت ورسالت کی شعاعیں سارے عالم کو روشن اور کائنات ہستی کو منور کر دیں اور اس جہان فانی کا ایک ایک گوشہ اس کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے انوار وتجلیات کا پرتو عرب وعجم اور دنیا کے دوسرے ملکوں پر یکساں

پڑے اور سارا عالم اس فیضان روحانی سے مال مال ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس بارے میں بالکل درست لکھا:

''قرآن حکیم نے توحید کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو ''سراج منیر'' کہا۔ اس مماثلت اور اشتراک تشبیہ سے مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت بھی اس آفتاب مادی کی طرح ایک آفتاب روحانی ہے۔ جب آفتاب نکلتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت میں کوئی تمیز دور ونزدیک، اعلیٰ وادنیٰ، سیاہ وسفید، باغ ودشت کی نہیں ہوتی۔ اس کی روشنی بلاتمیز مکان ومقام ہر شئے پر چمکتی اور ہر حرارت پذیر وجود کو گرم کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اس آفتاب دعوت الٰہی اور نیر درخشاں سمائے رسالت کی عموم فیض بخشی کا تھا۔ جو گو سعیر سے چلا مگر فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا۔ جس کی کرنوں میں داہنی جانب شریعت الٰہی کی منور کتاب مبین تھی مگر بائیں جانب قیام عدل کی شمشیر آب دار چمک رہی تھی جس کا طلوع کائنات میں ظلمت کی شکست اور روشنی کی دائمی فیروز مندی کا تھا کیونکہ آسمان ہدایت پر شریعت الٰہی کے گو سینکڑوں ستارے نمودار ہوئے تھے لیکن تاریکی کی آخری شکست کے لیے دنیا کو آفتاب ہی کے طلوع ہونے کا امکان تھا۔''

''اس آفتاب توحید نے طلوع ہوتے ہی تفریق وانشقاق کی تمام تاریکیوں کو مٹا دیا۔ اس کی روشنی کی فیضان بخشی میں اسود وابیض اور عرب وعجم کی تمیز نہ تھی۔ اللہ کی ربوبیت کی طرح اس کی رحمت بھی عام تھی۔ وہ ''رب العالمین'' تھا پس ضرور تھا کہ اس کی راہ کی طرف دعوت دینے والا بھی ''رحمۃ للعالمین'' ہو۔

دنیا کا وہ کون سا گوشہ ہے جو کلام ربانی کا محتاج نہیں اور اللہ کے آخری قانون سے بے نیاز ہے۔ شرک وکفر کے بادل کہاں نہیں چھائے؟ جور وستم کی حکومت کس خطہ پر نہیں رہی؟ اور فساد وتخریب کا میدان کارزار کہاں گرم نہیں رہا؟ رسوم بد سے کائنات کا کون سا گوشہ خالی ہے؟ رومۃ الکبریٰ میں اگر ایک طرف تثلیث کا زور ہے تو دوسری جانب شراب خوری، مردم آزاری اور صنف ضعیف اور صنف نازک کی تذلیل وتوہین کا شور ہے۔ حکومت ایران کی

سطوت وجبروت کے زیر سایہ مظالم کی وہ کون سی داستان ہے جو فردا کے لیے باقی رکھی گئی ہو، مزدک کی تعلیم نے عورت کو سر بازار لٹکا کر تجارت کا مال بنا کر کیا کچھ رنگ رلیاں نہیں منائیں؟ اور صنف ضعیف کی قسمت کا وہ کون سا گوشہ ہے جو تحقیر وتذلیل کی ترازو میں نہیں تولا گیا۔ زنا کاری اور شراب خوری تو ہر کہہ ومہ کے لیے ایک بہترین مشغلہ تھا۔ غرضیکہ کائنات کا ہر گوشہ ظلم وعصیان سے بھرا ہوا تھا۔

پھر کیا کسی شخص کے دل میں یہ خیال گزر سکتا ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا ذرہ ذرہ تو اس طرح گمراہ اور بے راہ روی میں مبتلا ہو لیکن اس کی رحمت کی بارش صرف ایک ہی خطہ کو سیراب اور اس کی ہدایت کی مشعل کسی خاص قوم ہی کی راہنمائی کرے ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ اس لیے اس نے اپنے پیغام حق کے پیغام بر محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ اب وہ آپنے تبلیغی دائرہ کو تمام عالم پر حاوی کر دیں اور دنیا میں یہ آواز لگا دیں کہ فلاح دارین اور نجات ابدی کی راہ اگر چاہیے تو میری سنو اور جو کچھ میں کہوں اس کو تسلیم کرو۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق دنیا کو دعوت دی اور چشم فلک اور دنیا نے دیکھا کہ آج عالم ارضی کا چپہ چپہ اس دعوت حق کی آواز سے مست و بے خود ہے اور کائنات رنگ و بو کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نعرۂ توحید بلند نہ ہوا ہو۔

طریق دعوت:

قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل ۱۶: ۱۲۵)

''لوگوں کو دعوت دو اپنے رب کے راستہ کی دانائی اور عمدۃ نصائح کے ساتھ اور مکالمہ کرو اچھے طریق سے۔''

اسلام صرف چند عبادتوں کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مکمل قانون اور ضابطہ حیات ہے جو دین ودنیا اور مذہب وملت کے تمام قوانین کو حاوی اور زندگی اور مابعد زندگی کے ہر گوشہ اور شعبہ کے لیے شمع درخشاں ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو کسی شعبہ زندگی میں دوسروں کا

محتاج نہیں رکھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کو تبلیغ حق وصداقت اور دین کی نشر واشاعت اور دعوت الٰہی کے ضمن میں کسی خاص طریقہ عمل، کسی خاص طریق دعوت کے مستقل نظام اور اصول وقواعد سے بے نیاز محکم اصولوں سے جدا، ایک بے ترتیب اور منتشر اجزائے علم وعمل اور بے نظمی کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔

مذہبی زندگی ہو یا دنیوی حیات، عموماً تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتی۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایک سائل جب اپنی گفتگو شروع کرتا ہے تو شک وریب کی پہلی منزل ہی اس کے سامنے آتی ہے۔ ابھی نہ جرح وقدح کا وقت ہے اور نہ مخالفت وجحود کا، اس لیے چند حق پسند مجیب اور شیدائے حق وصداقت مرشد، اپنا فرض اس طرح ادا کرتا ہے کہ سائل کے سامنے اس کے سوال کا نقص، اس کے تمام گوشوں کی خامیاں اور کمزوریاں اور اس کے شک وشبہ کے تمام اطراف وجوانب کی کمزوریاں، حکمت ودانائی کے ترازو پر وزن کرتا اور اسی کی روشنی میں اپنے دلائل اور براہین کی بنیادیں قائم کرتا ہے۔ گوش حق نیوش نے اگر یارائی کی تو سائل پہلی ہی منزل میں گوہر مقصود پالیتا اور تسکین قلب حاصل کر لیتا ہے اور اگر نفس کی سرکشی یا غفلت اور طبیعت کی کجی نے راہنمائی سے باز رکھا، راہنما کے تسکین دہ جوابات اس کی تشنہ کامی کو سیراب نہ کر سکے، تو اب داعی حق وصداقت دوسری کروٹ بدلتا ہے اور اپنے حکمت آموز دلائل کو عمدہ مثالوں، بہتر نظائر، دل کش اسلوب بیان اور بیش بہا نصائح سے مزین کرتا اور ان کے ذریعے اپنے دلائل کی شمشیر کو آب دار بناتا ہے اور آخر کار متلاشیانِ حق کی ایک بہت بڑی جماعت اس دوسری منزل پر آ کر سر نیاز جھکا دیتی ہے اور شمع حق پر پروانہ وار نثار ہو جاتی ہے، لیکن کیا ضروری ہے کہ عالم انسانی کا ہر فرد پہلی اور دوسری منزل ہی میں راہ راست پر آ جائے۔ آخر نفس کی تباہ کاریاں اور ماحول کی فتنہ انگیزیاں معمولی چیز تو نہیں ہیں؟ طبیعت میں استعد... قبول حق کے باوجود خارجی اثرات غالب آ جاتے ہیں اور سائل کا انکار اور جحود اس منزل... پہنچ جاتا ہے جس کو اصطلاح میں مجادلہ اور مناظرہ کہتے ہیں لیکن راہ مستقیم کے رہبر کی ... زندگی یہ سب کچھ دیکھتی ہے اور خندہ پیشانی کے ساتھ مناظر ومجادل کے مجادلانہ اسلوب ... برداشت کرتی ہے اور ترشی کا جواب نرم خوئی سے، متعصبانہ سختی کا جواب ... تی... سے اور

جہالت کا جواب احسن طریق کے ساتھ دیتی اور آخر کار اس کو صراط مستقیم پر لے آتی ہے یا خود اس کی نگاہ میں اس کو باطل پرست ٹھہرا دیتی ہے۔ یہی وہ طریق دعوت ہے جس کی طرف فطرت سلیم لے جاتی ہے اور یہی وہ طریق مخاطبت ہے جس کو عین مقتضائے فطرت کہا جاتا ہے۔ قانون فطرت کے انھی مراتب کو قرآن حکیم نے آیت مذکورہ بالا میں اپنے معجزانہ انداز میں حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلۂ حسنہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ ان تینوں درجات کی تشریح و توضیح قرآنِ حکیم میں ایک سے زیادہ مقامات پر بیان فرمائی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے اگرچہ مجادلہ کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ''حسنہ'' کی قید لگا دی گویا جدال حسن ہو یعنی مناظرہ کی ضرورت کے وقت مناظرہ ہونا چاہیے لیکن حسن ادا، حسن خطابت اور دلنشین طرز کلام کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ علم الٰہیات میں اثبات مقصد کے لیے وحی الٰہی، علم صحیح اور رشد و ہدایت کی روشنی کے بغیر کبھی کوئی شخص کامیاب و کامران نہیں ہوسکتا اور جو شخص بھی ان اسباب سے خالی ہو کر میدان مجادلہ میں آئے گا، اس پر بجز ''خسران مبین'' کے کبھی راہ حقیقت نہیں کھل سکتی اور اس قسم کے مجادلہ کو جو دلیل و برہان سے جدا اور علم وہدایت کی روشنی سے الگ ہو، کبھی ''مجادلہ حسنہ'' نہیں کہا جا سکتا۔

بادشاہان عالم اور امراء کے نام خطوط:

اسلام کی دعوت اس سے قبل جزیرہ عرب میں پھیل چکی تھی۔ ہجرت کا چھٹا سال ختم ہو رہا تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ حدیبیہ کی صلح سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ میں رونق افروز تھے۔ حسب معمول فدا کاران اسلام اور شیدایان توحید شمع رسالت کے گرد پروانہ وار جمع ہیں کہ یکا یک زبان رسالت نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور میں تمام انسانیت کے لیے رسولؐ بن کر آیا ہوں، اس لیے میرا ارادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام امراء اور سلاطین عالم تک بھی پہنچا دوں تا کہ اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو اور دعوت ربانی سے دنیا کی کوئی جماعت محروم نہ رہے۔ جب آپ نے انھیں خط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خدمت اقدس میں عرض کیا کہ شاہان عجم کا یہ دستور ہے کہ وہ کوئی تحریر جب تک کہ مہر شدہ نہ ہو، مستند نہیں مانتے اور نہ اس کو پڑھتے ہیں۔ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

کے اس قول کی تائید دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس درخواست پر ارشاد ہوا کہ چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جائے جس پر ''محمد رسول اللہ'' لکھا جائے۔ ارشاد قدسی کے مطابق چاندی کی انگوٹھی تیار کی گئی جس کا نگینہ حبشہ کی ساخت اور تراش کا بنایا گیا۔ نگینہ پر اسم مبارک اس طرح نقش تھا کہ محمد ایک سطر میں، رسول دوسری سطر میں اور اللہ تیسری سطر میں۔ یہی وہ مہر نبوت تھی جو دعوت اسلام کے خطوط کے علاوہ مختلف فرامین رسالت پر ثبت ہوتی تھی۔ (بخاری:۲/۸۷۲)

عرب کی ایک چھوٹی سی ریاست مدینہ کی طرف سے دنیا کی سپر طاقتوں اور بادشاہوں کو دعوت اسلام کے خطوط لکھنا جہاں ایک جرأت مندانہ اقدام ہے وہاں ایک حیرت افزا معاملہ بھی ہے کیونکہ ان خطوط میں اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ مبادا ایسی دعوت کی پاداش میں آپ کے ساتھ تمام عرب کو ان بادشاہوں اور سپر طاقتوں میں سے کسی کی رعایا ہو کر رہنا پڑے۔ مطلب یہ کہ ان بادشاہوں کی شوکت اور دبدبہ اور ہیبت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دین حق کی دعوت دینے میں کوئی تامل نہ فرمایا۔ ایک روز آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''دیکھو! تمھارا وجود اور تمھاری ہستی امر بالمعروف کے لیے وقف ہونی چاہیے۔ خدا کی جنت اس شخص پر حرام ہے جو دنیا والوں کے معاملات میں شریک رہتا ہے اور ان کو امور خیر کی تلقین نہیں کرتا۔ جاؤ خدا کے بھروسہ پر دنیا کے بادشاہوں کو اسلام کا یہ پیغام سنا دو۔ اے صحابہؓ! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لیے باعث رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ بھی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حواریوں کی طرح میری نافرمانی پر اتر آؤ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''اے رسالت پناہ! سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کن معنوں میں ان کے خلاف ہو گئے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ابن مریم علیہما السلام نے اپنے حواریوں کے ذریعے یہی پیغام بادشاہوں کو

پہنچانا چاہا۔ ان میں سے جس کو نزدیک کے بادشاہ کے پاس بھیجا اس نے تو خوشی سے تعمیل کر لی۔ لیکن دور بھیجے جانے والوں میں سے بعض کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے فرائض کی بجا آوری کے عمل میں پورا نہ اتر سکے۔''

پھر فرمایا:

''میں تم لوگوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے دنیا کے بادشاہوں اور امراء کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہایت خندہ پیشانی سے اس مقصد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں:

جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپؐ نے مختلف سربراہان مملکت کی طرف بھیجا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

- سیدنا دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ — ہرقل شاہ روم
- سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ — کسریٰ ایران
- سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ — نجاشی شاہ حبشہ (اصحمہ)
- سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ — مقوقس شاہ مصر واسکندریہ
- سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ — شاہان عمان
- سیدنا سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ — رئیس یمامہ
- سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ — رئیس بحرین
- سیدنا شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ — رئیس عمان
- سیدنا مہاجر بن امیہ مخزومی رضی اللہ عنہ — رئیس یمن

ان سفیران رسالت مآب رضوان اللہ علیہم کے بارہ میں روانگی کے متعلق دو روایات ہیں۔ ایک یہ کہ سب سفیر بیک وقت مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے، اور دوسری روایت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر روانہ ہوئے۔

ابن سعد نے طبقات میں اور محدث ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے المصنف میں اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف سلاطین

کے پاس مختلف ملکوں میں دعوت اسلام کے لیے قاصد بنا کر بھیجنا چاہا تو ہر ایک قاصد قدرتاً اس ملک کی زبان بولنے اور سمجھنے لگا جس کی طرف اس کو روانہ کیا جا رہا تھا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معجزنما واقعہ کا خدمت اقدس میں ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((هذا اعظم ما كان من حق الله عليهم فى امر عباده))

لیکن بخاری اور مسلم اور ان کی شروح فتح الباری، عمدۃ القاری اور نووی وغیرہ میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد اور زرقانی نے مواہب میں ان پیغامات کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن اس روایت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بایں ہمہ ابن سعد اور ابن ابی شیبہ کی یہ روایت سند کے اعتبار سے قابل قبول ہے۔ اگرچہ اس پایہ کی نہیں ہے جو ان محدثین کی بیان کردہ شرائط پر پوری اتر سکے۔

لیکن ابن ہشام نے اس واقعہ کی نسبت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے ساتھ کی ہے یعنی جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ اسلام کے لیے حواریوں کو مختلف شہروں میں روانہ کرنا چاہا تو جن کو نزدیک کے شہروں میں بھیجنا چاہا وہ تو جانے پر راضی ہو گئے مگر جن کو مسافت بعیدہ پر جانے کے لیے کہا انھوں نے جانے سے گریز کیا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور آپؑ کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ دور کی مسافت پر جانے والے ان شہروں اور ملکوں کی زبان بولنے لگے جہاں ان کو بھیجا جا رہا تھا۔ بہرحال روایت اپنے صحت و سقم کے اعتبار سے خواہ قابل بحث اور محل نظر ہو لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف ممالک میں ان والا ناموں کی سفارت پر مامور کیا گیا وہ ان ممالک کی زبان بولنے اور سمجھنے پر اتنے ضرور قادر تھے کہ وہ اپنے مافی الضمیر اور مقصد تبلیغ کو بخوبی ادا کر سکیں۔

اب اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جس طرح بات چیت اور روزمرہ کی گفتگو کسی شخصیت کے علم و فضل اور فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہوتی ہے اسی طرح مکاتیب اور رسائل کا اسلوب بیان بھی انسانی شخصیت کے اندرون کا پتہ دیتا ہے کیونکہ گفتگو الفاظ سے مرکب ہوتی ہے اور الفاظ انسان کے اندر سے نکلتے ہیں پھر جس طرح اپنی گفتگو اور خطاب میں آدمی مختلف مواقع پر مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے اسی طرح مکاتیب میں بھی اس کے تخاطب کا

انداز مختلف اور متنوع ہوتا ہے۔ اپنی بات کی تفہیم کے لیے موزوں الفاظ کے ساتھ ساتھ مناسب اسلوب اظہار بھی مطلوب ہوتا ہے۔ الفاظ کی یہی مناسبت اور اسلوب بیان کی یہی موزونیت دراصل ایک انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے جس میں اس کے دل کی گہرائیاں، زبان کی شیرینی اور خفتہ و پنہاں صلاحیتیں جھلکتی نظر آتی ہیں۔

اگر عربی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ﷺ کے مکتوبات اور رسائل میں ایک منفرد اسلوب بیان جھلکتا دکھائی دیتا ہے جسے سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے جو خطوط اور مکاتیب املاء کروائے وہ بھی جوامع الکلم کی طرح فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار ہیں۔ ان کا اسلوب نہایت سادہ اور سلیس لیکن معنی کے حسن میں جمال لفظی کا بھی خیال پیش نظر رہا ہے۔

پھر ایک اور بات جس کا ذکر گذشتہ سطور میں بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ تاریخ انسانی میں چشم فلک نے پہلی بار یہ دیکھا کہ صحراء کے ایک کمبل پوش نے بیک وقت دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں، بادشاہوں اور امراء کو مخاطب کر کے خطوط لکھے اور ان میں انھیں ایک نہایت عجیب انداز میں اسلام کی دعوت دی۔ آپؐ کی یہ دعوت اگرچہ گونا گوں خطرات میں گھری ہوئی تھی اور وہاں کی ساری آبادی اور سارے حکمرانوں کو حلقہ بگوش اسلام نہ بنا سکی لیکن ان خطوط میں آپؐ نے واضح کر دیا کہ "اسلم تسلم" یعنی تمھاری سلامتی اسی میں ہے کہ اسلام کو قبول کرو، دراصل یہ ایک دھمکی بھی ہے لیکن تاریخ اس کی حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہے کہ ان سپر طاقتوں نے آپؐ کی اس دھمکی کو کیسے قبول کر لیا کیونکہ ایک معمولی صحرا نشین کی دنیوی لحاظ سے ان کے ہاں کوئی حیثیت نہ تھی۔ پھر ان بادشاہوں اور حکمرانوں نے آپؐ کے دین اور آپؐ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کے بارے میں جو پیش گوئیاں فرمائیں وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں اور دوسروں کے لیے وہ موعظت وعبرت کا باعث بنیں۔

عربی زبان میں مکتوبات کی اوّلین بنیاد رکھنے کا شرف بھی پیغمبر اسلام ﷺ کو حاصل ہے۔ آپؐ نے مکتوبات کے بارے میں ایک جدید طرز عمل اختیار فرمایا اور اس لحاظ سے آپؐ اس طرز اور اسلوب کے بانی اور موجد تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مکتوب نگاری، اور عربی انشاء پردازی کا جو طریقہ اختیار فرمایا اس پر عرب کے بڑے بڑے ادیب اور فصحاء وبلغاء کوئی

اضافہ نہ کر سکے۔ آپ ﷺ نے خط کا آغاز اللہ کے نام یعنی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے لکھنے سے شروع کیا اور "امابعد" لکھنے کا طریقہ بھی آپ ﷺ ہی نے ایجاد فرمایا۔ آداب اور القاب اور پروٹوکول کے آداب اگرچہ بعد میں وضع ہوئے لیکن آپ ﷺ نے اس کی بنیاد اپنے مکتوبات میں رکھ دی تھی، چنانچہ آپؐ نے شاہ مصر کو جو خط لکھا اس میں اسے "عظیم القبط" کے لقب سے یاد فرمایا اور روم کے بادشاہ کو "عظیم الروم" کے الفاظ سے خطاب فرمایا: اسی طرح کسریٰ ایران کو بھی "عظیم الفرس" کہہ کر مخاطب فرمایا لیکن ہر چھوٹے بڑے فرمان روا حکمران کو "اسلم تسلم" کے الفاظ ضرور لکھے کہ تمھاری سلامتی اسلام لانے ہی میں ہے۔ جن بادشاہوں کا تعلق اہل کتاب سے تھا ان کو کلمۂ توحید پر اکٹھا ہونے کی دعوت دی اور انھیں یہ بھی فرمایا کہ اگر وہ اسلام کی اس دعوت کو قبول کریں گے تو انھیں دگنا اجر ملے گا اور اگر انھوں نے انکار کیا تو اپنی رعایا کے کفر وانکار کے بھی وہی ذمہ دار ہوں گے۔ آپ ﷺ نے اپنے تمام مکتوبات میں سب حکمرانوں کو دعوت اسلام دی لیکن دعوت دینے کا انداز نہایت نرم رکھا پھر اہل کتاب سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں اور آتش پرست فرمانرواؤں کے انداز تخاطب میں فرق رکھا گیا۔ آتش پرست حکمرانوں کے نام مکتوبات میں سخت اور زور دار انداز میں شرک اور کفر کی تحقیر کی جب کہ یہ تحقیر آمیز الفاظ اہل کتاب کے بادشاہوں کے خطوط میں نہیں ہیں۔ نجاشی شاہ حبشہ کو سیدہ مریم اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مرتبہ کے علاوہ توحید کی دعوت دی گئی جس کے نتیجہ میں شاہ حبشہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات میں غیر مسلم لوگوں کو سلام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ غیر مسلموں کو ((سلام علی من اتبع الھدی)) لکھا جائے۔ پھر آپؐ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ "رسول اللہ" یا "عبداللہ ورسولہ" لکھواتے تھے۔

اگر آپؐ کا خط مسلمانوں کے نام ہوتا تو اختتام پر "والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ" لکھواتے۔ مکتوبات میں متعلقہ قبیلے کے لہجے اور مقامی بولی کے الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال فرما لیتے۔ آپؐ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے کی وفات پر ان کو جو خط لکھا تھا وہ اس موضوع پر لکھے جانے والے خطوط کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

غرضیکہ آپ ﷺ کے خطوط ومکتوبات بھی عربی انشاء پردازی کا ایک نہایت اعلیٰ اور اجمل نمونہ ہیں اور آپ ﷺ نے مکتوبات کی جو صنف ایجاد کی وہ اپنے طرز اور اسلوب کے لحاظ سے انوکھی ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے مکاتیب کے نمونہ جات اگلے صفحہ پر دیئے جا رہے ہیں۔

شاہ حبشہ نجاشی کے نام مکتوب گرامی:

حبشہ ایک ملک ہے جس کو ایتھوپیا اور ابی سینیا بھی کہتے ہیں۔ عربی میں حبش کے معنی خلط کے ہیں۔ اہل عرب کے نزدیک یہ ایک مختلط النسب قوم ہے اس لیے اس کا نام حبش رکھ دیا گیا۔ یہ قوم دراصل سامی عرب اور حامی نسل کے ان مختلف قبائل کے مجموعہ سے عالم وجود میں آئی جو کہ سوادِ عرب کے جنوبی حصہ (یمن) کے باشندے تھے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت سے قبل حبشہ میں جا بسے تھے۔ عرب کے یہ سبائی قبائل جن کے اختلاط سے حبشی قوم وجود میں آئی، دو مستقل خاندانوں میں منقسم ہوگئے۔ سباء حبش اور سباء حمیر۔ سبائے حبش کی حکومت قریباً تیسری صدی عیسوی کے آخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ملک حبش میں قائم ہوئی اور اس حکومت کا دارالسلطنت حبشہ کے مشہور صوبہ کے شہر اکسوم میں قرار پایا۔ اہل حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں اور اس شہر کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ (ارض القرآن)

اس حکومت کے حکمرانوں کو اہل عرب نجاشی کے لقب سے پکارتے تھے۔ نجاشی دراصل لفظ ''نجوس'' کا معرب ہے اور نجوس حبشی زبان میں بادشاہ کو کہتے ہیں۔ یہ خاندان پہلے بت پرست تھا۔ شاہانِ روم نے مصر کے ذریعے یہاں عیسائیت کی بنیاد ڈالی اور چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کے ایک بشپ نے یہاں اپنے مشن کا ایک مرکز قائم کیا اور سنہ ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اذنیہ نجاشی حبش نے نصرانیت کو قبول کیا اور اس طرح آہستہ آہستہ تمام حبشہ بت پرستی ترک کر کے عیسائی ہوگیا۔ (معجم البلدان)

اصحمہ نجاشی جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حبشہ کا بادشاہ تھا اسی اذینہ کی اولاد میں سے تھا اور آنے والے تمام واقعات جو سرکار دو عالم ﷺ کے دور میں پیش آئے اسی کے بارے میں ہیں۔

نبوت کے پانچویں سال کے وسط میں مسلمانوں پر جور و ستم کا سلسلہ اپنے پورے شباب پر آ گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مکہ مکرمہ میں رہنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہوگیا۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قریش مکہ جہاں کہیں کسی مسلمان کو پاتے، درندوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے اور اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ جرم نا آشنا ان کی نظر میں میں قبول اسلام کے جرم کی قرار واقعی سزا نہ پالیتا۔ اس دور میں عرب میں معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان و مال کا محافظ ہوتا تھا۔ ان معاہدات کے ذریعے طاقت کا توازن بھی قائم رہتا تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خود اپنے طور پر مختلف قبائل کے ساتھ معاہدات کیے ہوئے تھے۔ ابتداء میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کسی قبیلہ سے معاہدہ نہیں کیا ہوا تھا لیکن ان کی حفاظت کی ذمہ داری ابوطالب نے لے رکھی تھی۔ ابوطالب اس وقت چونکہ بنو ہاشم کے سردار اور سربراہ تھے، اسی بنا پر ایک سربراہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے کئی دوسرے قبائل سے معاہدات کیے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے جس طرح ابوطالب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ کے ذمہ دار تھے، اسی طرح وہ قبائل بھی جن سے ابوطالب کے معاہدات تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے لیکن حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کی اکثریت وہ تھی جن کے کسی سے خود معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبائل کے سربراہ نہیں تھے۔ یہ سربراہوں کے تابع تھے۔ سربراہوں اور شیوخ کے معاہدات کے باعث اگرچہ غیر قبائل کے لوگ ان کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے لیکن خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت ان کے لیے سخت اذیت کا باعث تھی۔

یہ لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن انھیں وہ مقاصد حاصل نہ تھے جن کے لیے انھوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا تھا۔ نہ یہ عبادت کر سکتے تھے اور نہ کھلے بندوں تلاوت قرآن کر سکتے تھے، بلکہ اپنے اسلام تک کا کھلے بندوں اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے اسلام کو انھوں نے پردۂ خفا میں رکھا ہوا تھا اور اگر کسی کو پتہ چل جاتا کہ انھوں نے دعوت اسلام کو قبول کیا ہوا ہے تو ان پر مشقِ ستم جاری ہو جاتی، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد جن میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جیسے متمول اور سربرآوردہ لوگ بھی تھے اور غلام اور لونڈیاں اور

دوسرے نچلے طبقہ کے لوگ بھی تھے، طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کر رہے تھے۔

اگر چہ خود سرکار دوعالم ﷺ بھی قریش مکہ کے جور وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے لیکن آپ ﷺ کو اپنی اذیتوں کا احساس تو نہ تھا البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ساتھیوں کی تکالیف آپؐ کو بے چین کیے ہوئے تھیں اور آپؐ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کی مخلصی کی دعائیں فرماتے، ان کو صبر واستقامت کی تلقین فرماتے اور وہ مظلوم ومقہور لوگ دولت ایمان کی حفاظت کے لیے یہ سب کچھ کئی سالوں سے سہہ رہے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ جبر اور صبر کی آویزش کو ایسے مراحل میں داخل ہوتے دیکھ رہے تھے جہاں انسانی صبر کا پیمانہ چھلک سکتا ہے تاہم جب کافروں کا جور وستم حد سے بڑھ گیا تو ایک روز لسان نبوت سے ان مظلوم مسلمانوں نے یہ لفظ سنے:

''تم اللہ کی زمین میں کہیں چلے جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ تم سب کو عنقریب جمع کر دے گا۔ ان مظلوموں نے پوچھا: کہاں جائیں؟ آپ ﷺ نے حبشہ کے ملک کی طرف اشارہ فرمایا۔'' (زرقانی: ۱/ ۲۷۰، سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۲۲، عیون الاثر: ۱/ ۲۰۹)

سرکار دوعالم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ((ھی ارض صدق)) وہ راستی کی سرزمین ہے۔ وہاں کا حکمران ایسا ہے جس کی قلمرو میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ حبشہ بھی شام کی طرح قریش کی تجارت گاہ تھا۔ جب قریش تجارت کی غرض سے وہاں جاتے تو اس جگہ خوراک اور امن وطمانیت پاتے اور تجارت میں خوب فائدہ حاصل کرتے۔

اس ہجرت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ حبشہ کے باشندے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاکیزہ عادات واخلاق سے متاثر ہوئے اور اسلام کے نیر تاباں کی شعاعیں وہاں دین حق کی کرنیں پھیلانے میں کامیاب ہوئیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ کا حکم پاتے ہی بارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک مختصر سا کارواں فی الفور ماہ رجب سنہ ۵ نبوی میں ہجرت کے لیے آمادۂ سفر ہوگیا۔ راہ خدا میں غریب الوطن ہونے والی اس جماعت میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور آپؓ کی اہلیہ محترمہ سیدہ رقیہ طاہرہ سلام اللہ علیہا بنت رسول اللہ ﷺ بھی تھیں۔

یہ بارہ مرد اور چار عورتیں رات کی تاریکی میں پیدل اور سوار چھپتے چھپاتے مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے

نکلے اور سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ سیدنا لوط علیہ السلام کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اللہ کے راستہ میں ہجرت کی۔

یہ حضرات وہاں نہایت امن وسکون سے اپنی زندگی کے ایام بسر کرنے لگے اور مکہ کے جوروستم کے زخم مندمل ہونے لگے۔ ابھی انھیں وہاں تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ماہ شوال میں انھیں یہ خبر ملی کہ تمام اہل مکہ مسلمان ہوگئے ہیں۔ اس خبر سے انھیں نہایت مسرت ہوئی چنانچہ وہ فوری طور پر مکہ مکرمہ واپس آ گئے لیکن مکہ کے قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ خبر غلط تھی لہٰذا اب وہ نہ واپس جا سکتے تھے اور نہ مکہ میں داخل ہو سکتے تھے لہٰذا اب وہ چھپ چھپا کر اور کسی کی پناہ لے کر مکہ میں داخل ہوئے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ: ۳/۶۶۔۶۷، عیون الاثر: ۱/۲۰۹، سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۲۲)

بعض حضرات نے مہاجرین حبشہ کی واپسی کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وطن سے ہجرت کر کے دور دراز ملک میں قیام اور وہ بھی مستقل اور قیام بھی ایسی حالت میں کہ اعزاء واقرباء چھوٹے، دوست احباب چھوٹے، مال ودولت چھوٹا، وطن چھوٹا اور وہ بھی مکہ مکرمہ جیسا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس مقدس وجود کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کیا، اس کے شرف صحبت سے بھی محروم ہو گئے اور یہ سب کچھ چھوڑنے والے لوگ بھی وہ ہوں جو مکہ مکرمہ میں نادار نہ تھے، صاحب مال ومنال تھے، خاندانی اعتبار سے ذی عزت وذی حشمت تھے۔ ان کا اس بے سروسامانی کے ساتھ ایک نہایت اجنبی ملک میں عرصہ دراز تک قیام خوش گوار ثابت نہ ہوا اور یاد وطن نے بے چین کر کے تین ماہ بعد پھر مکہ پہنچا دیا۔

ہجرۃ حبشہ ثانیہ:

حبشہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی واپسی کے بعد قریش کی ظلم آرائیاں اور ستم رانیاں حد برداشت سے بڑھ گئیں۔ مسلمان جو تین ماہ وہاں رہے نہایت سکھ اور امن سے رہے، لہٰذا شیفتگان حق وصداقت کی درخواست پر سرکار دو عالم ﷺ نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دی لیکن اب کی بار ہجرت کرنا پہلے کی طرح آسان نہ تھا۔ یہ ہجرت اپنے دامن میں زیادہ مشکلات لیے ہوئے تھی کیونکہ اب کی بار قریش مکہ پہلے ہی سے چوکنا

تھے لیکن جیسے بھی ہو سکا، ۸۲ یا ۸۳ مردوں اور اٹھارہ عورتوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ ہجرت فرمائی اور حق تعالیٰ شانہٗ نے نہایت کرم سے ان کے سفر کو آسان بنا دیا اور وہ قریش کی پکڑ میں آنے سے قبل شاہ حبشہ کے پاس پہنچ گئے۔

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دامادِ رسول ﷺ ان نفوس قدسیہ میں شامل تھے جنھوں نے دو مرتبہ حبشہ کی جانب ہجرت فرمائی اور دونوں دفعہ سیدہ رقیہ سلام اللہ علیہا بنت رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ جب یہ دوسری مرتبہ حبشہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم نے قبل ازیں بھی حبشہ کی طرف ہجرت کی اور اب پھر جا رہے ہیں لیکن آپ ﷺ اس مرتبہ بھی ہمارے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم لوگ جس طرح مہاجرین الی اللہ ہو اسی طرح تم نے میری طرف بھی ہجرت کی ہے۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''پھر یہ ہمیں کافی ہے۔''

(سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۲۵، طبقات ابن سعد: ۱/۲۰۷)

حبشہ میں قریش کی سفارت:

حبشہ ہجرت کرنے کے بعد مسلمان نہایت امن وسکون کی زندگی بسر کرنے لگے اور وہ قریش مکہ کے دستِ تطاول وتعدّی سے محفوظ ہو کر ارکان اسلام بجالانے لگے۔ اور شاہ حبشہ نجاشی ان سے مربیانہ اور مشفقانہ سلوک کرنے لگا۔ جب یہ خبر قریش مکہ کو پہنچی تو وہ زخمی سانپ کی طرح پیچ وتاب کھانے لگے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان مہاجرین کو امن وعافیت میں دیکھنے کے روادار نہ تھے، چنانچہ انھوں نے باہمی مشورہ سے ایک سفارت تیار کی جس کے اراکین عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی تھے۔

سفارت پر جانے والوں کو خاص طور پر ہدایت کی گئی کہ بادشاہ کی ملاقات سے قبل تمام مقربین اور مصاحبین کو تحائف اور ہدیے دے کر اپنا ہم خیال بنایا جائے تاکہ وہ پھر تمھاری حمایت کریں چنانچہ یہ سفارت حبشہ پہنچی اور حسب ہدایت انھوں نے مسیحی بطریقوں کو فرداً فرداً تحائف دیے۔ گویا یہ ایک قسم کی رشوت تھی جو انھیں دی گئی۔ یہ تحفے دے کر ہر ایک بطریق کو یہ کہا گیا کہ مکہ میں ایک شخص نے اپنا آبائی دین چھوڑ کر ایک نیا دین ایجاد کیا ہے اور اس نے

بہت سے آدمیوں کو متاثر کر کے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ان میں سے گم کردگان راہ مکہ سے بھاگ کر آپ کے ہاں پناہ گزین ہوئے ہیں۔ وہ تمھارے دین میں بھی نہیں آئے بلکہ ایک نیا دین اختیار کر لیا ہے۔ ہماری قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے ہم کو آپ کے بادشاہ کے پاس ان کی واپسی کے لیے بھیجا ہے۔ کل ہم ان کی نسبت دربارِ شاہی میں ایک عرض داشت پیش کریں گے۔ آپ ہماری تائید کریں اور بادشاہ کو یہ مشورہ دیں کہ وہ ان مفرورین کو بغیر کسی مکالمہ اور گفتگو کے ہمارے سپرد کر دیں۔ تمام بطارقہ نے اس بارے میں ان کی تائید کرنے کا وعدہ کر لیا۔

پادریوں کو رشوت دینے کے بعد یہ لوگ اب نجاشی کے پاس تحائف لے کر پیش ہوئے پھر اپنا مدّعا بیان کیا اور عرض داشت کی کہ ان مفرور لوگوں کو ہمارے ساتھ واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے اس بات کی بھرپور تائید کی لیکن نجاشی نے ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان مہمانوں کو جنھوں نے اتنی دور سے آ کر میری سلطنت میں پناہ لی ہے، بغیر تحقیق اور دریافت احوال کے تمھارے حوالے کر دوں۔ نجاشی ایک عدل پرور اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ ان لوگوں کی بات میں اسے کوئی وزن نظر نہ آیا، وہ اس قصے کو گہرائی سے کھنگالنا چاہتا تھا اور اس کے تمام پہلوؤں کو سننا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ دوسرے روز جب دونوں فریق دربار شاہی میں حاضر ہوئے تو مسلمانوں نے صرف سلام پر اکتفا کیا اور نجاشی کو مقررہ آداب کے مطابق سجدہ نہ کیا۔ اس وقت مصاحبین اور ایک روایت کے مطابق خود بادشاہ نے یہ سوال کیا کہ تم نے بادشاہ سلامت کو سجدہ کیوں نہ کیا؟ سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جن کی عمر اس وقت ۲۶ سال کے قریب تھی نہایت جرأت سے جواب دیا کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے۔ اس نے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کوئی سجدہ نہ کرو۔ ہم خود اس رسولؐ کو بھی اسی طرح سیدھے سادے طریق سے سلام کرتے ہیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے کو اسی طرح سلام کرتے ہیں۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اہل جنت بھی اسی طرح ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ نجاشی نے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ عیسائیت اور بت پرستی کے سوا وہ کون سا دین ہے؟

(البدایہ والنہایہ:۳/۷۳)

اب سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں اور دین اسلام کے ترجمان کی حیثیت سے دربار میں کھڑے ہو کر پہلے سفارت مکہ سے تین سوال کیے۔ ''کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو اپنے آقا سے بھاگ آئے ہیں؟'' عمرو بن عاص نے جواب دیا: ''نہیں یہ لوگ کسی کے غلام نہیں بلکہ آزاد شرفاء ہیں۔'' سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''بتاؤ کیا ہم کسی کو ناحق قتل کر کے آئے ہیں؟'' عمرو بن عاص نے جواب دیا: ''نہیں، آپ لوگوں نے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا:'' تیسرا سوال سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے یہ کیا: ''کیا ہم کسی کا مال لے کر بھاگے ہیں، اگر ایسا ہے تو ہم اس کی ادائیگی کے لیے تیار ہیں۔'' عمرو بن عاص نے جواب دیا: آپؑ کے ذمہ کسی کا ایک حبہ بھی نہیں۔'' ان تین سوالوں سے اہل اسلام کی اخلاقی پوزیشن واضح ہوگئی۔ اب نجاشیؒ نے سفارت کار سے پوچھا: ''پھر کس چیز کا مطالبہ ہے؟'' عمرو بن عاص نے نجاشیؒ کی اس بات کا جواب دیا: ''ہم اور یہ لوگ ایک ہی دین پر قائم تھے۔ ہم تو اسی دین پر قائم رہے البتہ ان لوگوں نے اس دین کو بالکل چھوڑ دیا اور ایک نیا دین اختیار کر لیا۔'' اب اس دین کے بارے میں نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا: ''جو دین تم لوگوں نے اختیار کیا، وہ کیا ہے؟ نجاشی کے اس سوال کا سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا وہ اجمالی طور پر یہ ہے:

''اے بادشاہ! ہم لوگ دنیا کی جاہل ترین قوم تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے اور مردار کھاتے تھے۔ فواحش و عصیان میں ہر وقت غرق رہتے تھے۔ ہم نے محارم کو حلال کر رکھا تھا۔ ہمارے نزدیک حرام کاری کوئی معیوب شئے نہ تھی۔ حقوق انسانیت کا ذرہ برابر پاس نہ تھا۔ قطع رحمی، ہمسایوں کی حق تلفی اور خون ریزی ہمارا شیوہ اور دستور تھا۔ زبردست زیردست کو کھا جاتا تھا۔ ملک کے اندر کوئی آئین، کوئی اصول، کوئی قاعدہ، کوئی قانون اور کوئی دستور نہ تھا اور دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جس کے ہم خوگر نہ تھے۔ ایسی حالت میں رحمت خداوندی ہم پر جلوہ فگن ہوئی اور اس نے ہم میں سے ایسی برگزیدہ ہستی کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر مبعوث

فرمایا جس کا حسب ونسب، فضل وشرف، صدق وامانت، عفاف ودیانت، تقویٰ و طہارت دوست ودشمن سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اس رسولؐ اور پیغمبرؐ نے ہم کو توحید الٰہی اور معرفت ربانی کا سبق دیا اور شرک سے بچنے کی دعوت دی اور ہدایت فرمائی کہ ہمیشہ راست بازی سے کام لیں۔ غیبت اور عیب جوئی سے بچیں، ایفائے عہد کریں۔ اس نے ہمیں اکل حلال، امانت کی ادائیگی، صلہ رحمی اور ہمسایہ کے حقوق کی ادائیگی کا پابند فرمایا۔ گناہوں سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ خون ریزی اور دختر کشی سے باز رہنے اور فواحش ومنکرات کے ترک کرنے کا حکم دیا۔ یتیم کا مال کھانے اور عفت مآب خواتین پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ بے کسوں، بے سہارا لوگوں، یتیموں اور بیواؤں کی امداد اور ہمسایوں کو راحت وآرام پہنچانے کا حکم دیا۔ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہم پر فرض قرار دی۔ ہم لوگ اس یگانۂ روزگار ہستیؐ پر قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے ایمان لائے اور اس کی ہر بات کی تصدیق کی اور تائید کی۔ ہم کفر وشرک کو یک قلم ترک کر کے بدعملیوں اور بدکرداریوں سے دست بردار ہوگئے اور پاکیزگی، طہارت اور لطافت کو اپنا شعار بنایا۔ جس شئے کو اس یگانۂ روزگار ہستیؐ نے حلال بتایا ہم نے اسے حلال سمجھا اور جس کو حرام بتایا اس سے اجتناب کیا۔"

سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا:

"صرف اور صرف اس وجہ سے ہماری قوم نے ہم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، ستایا اور دھمکایا تا کہ ہم گذشتہ فواحش ومنکرات میں پھر مبتلا ہو جائیں۔ ان بے حیائیوں کو پھر اختیار کرلیں، خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت چھوڑ کر از سرنو پتھر کی مورتیوں کو پوجنا شروع کر دیں۔ ہم مکارم اخلاق کو ترک کر کے گذشتہ برائیوں میں پھر سے مبتلا ہو جائیں۔ ان لوگوں سے ہم نے ڈھیروں دکھ اٹھایا۔ آخر جب ان کے ظلم اور ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور جب ہم ان کے مظالم سے تنگ آگئے اور اپنے دین پر چلنا اور ایک خدا کی عبادت کرنا ہمارے لیے دشوار ہوگیا اور مکہ کی سرزمین اپنی وسعت کے باوجود ہم پر تنگ کر دی گئی تو ہم

بصد مجبوری اپنے وطن کی پیاری سرزمین کو چھوڑ کر آپ کی عمل داری میں چلے آئے، اس امید پر کہ آپ ظلم نہ کریں گے اور آپ کی ہمسائیگی کو ہم نے سب پر ترجیح دی۔

جب سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے دین اسلام کی یہ باتیں اور اپنے پر کیے گئے مظالم کی یہ داستان نجاشی کو بھرے دربار میں سنائی اور مسلمانوں نے دیکھا اور نجاشی کے تیور بتا رہے تھے کہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں اس کے دل کے بند دروازے پر دستک دے رہی ہیں، اتنے میں انھوں نے نجاشی کے منہ سے یہ سنا کہ ''تمھارے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام بھی اترا ہے۔ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں، برابر نازل ہو رہا ہے۔'' نجاشی نے کہا: ''اچھا، اس میں سے کچھ پڑھ کر سناؤ۔''

سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ پورا شاہی دربار، عمائدین اور پادریوں سے بھرا پڑا تھا۔ قرآن حکیم کے الفاظ کی جاذبیت اور بادشاہ اور دربار میں موجود تمام حاضرین کی ہمہ تن توجہ نے ان کے دلوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ ابھی چند آیات ہی آپ نے پڑھی تھیں کہ خود نجاشی اور تمام درباریوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے ابلنے لگے۔ بادشاہ کی تو روتے روتے داڑھی تر ہوگئی۔ پادری بھی اتنا روئے کہ ان کے مصاحف تر ہو گئے۔

سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جب تلاوت ختم کی تو بادشاہ کہنے لگا: ''بخدا! یہ کلام جو تم نے پڑھ کر سنایا اور وہ کلام جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے، دونوں ایک ہی شمعِ فیض کے پرتو ہیں۔

اب بادشاہ نے حکم دیا کہ ''قریش کے ان سفارت کاروں کے تمام ہدیئے اور تحائف واپس کر دیئے جائیں اور ان سے کہہ دیں کہ یہاں سے چلے جائیں، میں ان مظلوموں کو کسی صورت تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ (تاریخ الاسلام، ذہبی: ۱۸۴/۴۔۱۹۱، مسند احمد: ۲۰۱/۱، سیرۃ ابن ہشام: ۳۳۴/۱۔۳۳۸، مجمع الزوائد: ۲۷/۶، البدایہ والنہایہ: ۷۰/۳۔۷۲)

قریش کے یہ دونوں سفیر جب بادشاہ کے دربار سے بے نیل مرام باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے یہ کہا کہ کل بادشاہ کے سامنے ایسی بات کہوں گا جس سے وہ ان لوگوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ عبداللہ بن ربیعہ مخزومی نے کہا کہ ہرگز ایسا نہ کرنا، آخر ان لوگوں سے ہماری قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، اگرچہ یہ دینی طور پر ہمارے مخالفین ہیں لیکن عمرو بن عاص نے

اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

دوسرے روز عمرو بن عاص نے دوبارہ دربار شاہی میں باریابی حاصل کر کے گزارش کی:

''جہاں پناہ! ان لوگوں سے ذرا یہ بھی تو دریافت فرمایا جائے کہ سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ ہے؟ کیونکہ یہ ان کے بارے میں بہت ہی سخت بات کہتے ہیں۔ یہ لوگ ان کا درجہ گھٹاتے ہیں اور ان کی شان میں بے رُخی سے کام لیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کو بلا کر میری اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

نجاشیؒ نے یہ بات سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پھر دربار میں بلایا۔ جب مہاجرینِ حبشہ دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے ان دونوں سفیروں کی موجودگی میں اُن سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم لوگ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اور تمھارا ان کے بارے میں دینی عقیدہ کیا ہے؟ اب پھر سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ دربار شاہی میں اٹھے اور فرمایا:

''اے بادشاہ! ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، کلمۃ اللہ اور اس کے برگزیدہ بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا مریم عذرا علیہا السلام پر القاء کیا اور وہ ان کے بطن سے تولد ہوئے۔''

یہ سننا تھا کہ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: ''تم نے عیسیٰ علیہ السلام کی جو تعریف کی ہے، واللہ! سیدنا مسیح علیہ السلام تنکا بھر بھی اس سے زیادہ نہیں۔'' اس پر دربار میں حاضر پادری چین بہ جبیں ہوئے لیکن وہ بادشاہ کے سامنے بے بس تھے۔ اس نے پادریوں کو صاف کہہ دیا کہ تم کتنا ہی ناک بھوں چڑھاؤ لیکن حقیقت یہی ہے جو مسلمانوں نے بیان کی اور مسلمانوں سے کہا کہ تم میرے ہاں بالکل امن وسکون سے رہو، میں ایک سونے کا پہاڑ لے کر بھی تم کو ستانا اور تنگ کرنا پسند نہیں کرتا اور حکم دیا کہ ان قریشی سفیروں کے تمام ہدیے اور تحائف واپس کر دیے جائیں، مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ بخدا! خدا نے میرا ملک اور میری سلطنت بغیر رشوت کے مجھ کو دلائی لہٰذا میں تم سے رشوت لے کر ان لوگوں کو کسی صورت تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔ دربار ختم ہوا تو مسلمان خوشی اور مسرت کے ساتھ اور قریشی سفیر نہایت ندامت اور ذلت کے ساتھ نجاشیؒ کے دربار سے باہر نکلے۔

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو اس دور میں حبشہ میں موجود تھیں، فرماتی ہیں کہ اس کے بعد وہ دونوں سفیر اپنے ہدیے اور تحائف لے کر اور بہت بے آبرو ہو کر حبشہ سے نکلے اور ہم نجاشی کے پاس ایک اچھے ملک میں ایک اچھے پڑوسی کے زیر سایہ اپنی زندگی کے دن گزارنے لگے۔

نجاشی نے تحائف اور ہدیئے واپس کرتے وقت جو یہ کہا تھا کہ اللہ نے جب مجھ کو یہ حکومت بخشی تھی تو اس پر مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی تھی جو میں آج اس حکومت کے اختیار پر رشوت کا معاملہ کروں، اس کے پس منظر کے بارے میں سہیلی نے ''روض الانف'' میں لکھا ہے کہ نجاشی کے باپ کی اصحمہ کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی اور اصحمہ کے چچا کے کئی لڑکے تھے۔ اہل حبشہ نے ایک روز باہم بیٹھ کر یہ مشورہ کیا کہ اگر نجاشی اصحمہ کے والد کا انتقال ہو جائے تو اصحمہ کے علاوہ اس کی اور کوئی اولاد نہیں پس اگر اصحمہ کا بھی انتقال ہو جائے تو یہ مملکت ہمارے ہاتھ سے نکل کر کسی دوسرے بادشاہ کے قبضہ میں چلی جائے گی لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اصحمہ اور اس کے والد کو قتل کر دینا چاہیے تاکہ یہ سلطنت اصحمہ کے چچا اور اس کی اولاد میں منتقل ہو جائے اور اس طرح ایک غیر محدود زمانہ تک اس حکومت کا سلسلہ اسی خاندان میں باقی رہے۔ اس مشورہ کے بعد اہل حبش نے اصحمہ کے باپ کو قتل کر ڈالا اور اس کے بعد پہلے مشورہ کے مطابق نیز اس خوف سے کہ اصحمہ اپنے والد کے قتل کا ہم سے انتقام نہ لے، اصحمہ کے قتل کے ارادہ سے اس کے چچا کے پاس جو تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، آئے اور اصحمہ کو قتل کر دینے کو کہا۔ یہ سن کر اصحمہ کا چچا نہایت غمگین ہو کر کہنے لگا: ''اللہ تم لوگوں کو رسوا کرے، ابھی اس کے باپ کو قتل کر چکے ہو، اب اس کے قتل کا ارادہ ہے، یہ ہرگز نہ ہوگا۔'' اراکین سلطنت نے پھر اصرار کیا۔ آخر یہ قرار پایا کہ قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے غلام بنا کر فروخت کر دیا جائے۔ اصحمہ اس قرار کے مطابق ایک تاجر کے ہاتھ چھ سو درہم میں فروخت کر دیئے گئے۔ اصحمہ کو تاجر نے کشتی پر سوار کر کے لنگر اٹھا دیا۔ ابھی شام ہی ہونے پائی تھی کہ تمام افق میں بادل چھا گئے اور کشتی کو ایک جگہ ٹھہر جانا پڑا۔ اتفاقاً اصحمہ کا چچا خوشگوار موسم دیکھ کر باہر نکلا اور ابر کو دیکھنے لگا۔ یکا یک بجلی کوندی، گرجی اور اصحمہ کے چچا پر گری۔ یہ دیکھ کر تمام اراکین پریشان ہو گئے اور فوراً اصحمہ کے چچا زاد بھائیوں کے پاس دوڑے گئے تاکہ وہ باپ کی جگہ حکومت

سنبھال لیں لیکن انھوں نے دیکھا کہ بدقسمتی سے ان میں سے ایک بھی اس قابل نہیں کہ سلطنت کے باردوش سے سبک دوش ہو سکے۔ تب وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ بعض نے مشورہ دیا کہ اصحمہ باوجود نوعمر ہونے کے سن طفولیت ہی سے نہایت زیرک وفہیم ہے۔ اگر اب بھی مملکت کی خیر چاہتے ہو تو اسی کو تلاش کر کے لاؤ۔ سب نے عالم حیرت میں اس مشورہ کو پسند کیا اور فوراً دوسری کشتی اس کی تلاش میں روانہ کی۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر تاجر کی کشتی کو جا پکڑا اور زبردستی اصحمہ کو لے آئے۔ تمام اراکین نے اصحمہ کا استقبال کیا اور تاج پوشی کی رسم ادا کر کے متفقہ طور پر اسے اپنا بادشاہ مان لیا۔

تاجر نے اراکین سے فریاد کی کہ میرا چھ سو درہم تو واپس کر دیں لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ مجبور ہو کر تاجر اصحمہ کے دربار میں آیا اور فریاد کی۔ اصحمہ نے دعویٰ سن کر اراکین سے کہا کہ تاجر کا دعویٰ صحیح اور درست ہے۔ یا تم اس کے غلام (اصحمہ) کو اس کے حوالے کر دو یا پھر اس کا زرِ ثمن واپس کر دو۔ تب اراکین نے نجاشی کے بدلہ میں تاجر کا زرِ ثمن واپس کر دیا۔

اسی کی طرف نجاشی نے اشارہ کیا تھا کہ خدا نے ملک بخشی میں مجھ سے رشوت نہیں لی تھی اور نہ اس نے میرے جائز حق کے بارے میں اشخاص کی خواہشات کی پروا کی۔ آج میں کس لیے اس حکومت واختیار پر رشوت کا معاملہ کروں اور حق وانصاف کے مقابلہ میں قریش کی خواہشات کی تکمیل کروں اور حق وانصاف کے مقابلے میں قریش کی خاطر ظلم وعدوان اختیار کروں۔ (رَوض الانف: ۱/۲۷۰)

عمرو بن عاص کو حبشہ میں اپنی سفارت کی ناکامی پر اس قدر ندامت ہوئی کہ واپس آ کر وہ خانہ نشین ہو گئے اور گھر سے باہر نکلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اشراف قریش نے آدمی بھیج کر جب ان سے باہر نہ نکلنے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ شاہ حبشہ اصحمہ کا گمان ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں (گویا ان کے دل میں آپ ﷺ کی نبوت کا بیج جڑ پکڑ گیا تھا)۔ (البدایہ والنہایہ: ۳/۱۶۷)

ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ قریش کی سفارت کی ناکام واپسی کے تھوڑے دنوں بعد حبشہ پر دشمن نے چڑھائی کر دی۔ یہ بادشاہ اصحمہ مسلمانوں کا محسن تھا۔ اس وجہ سے صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم اس خبر کو سن کر نہایت مغموم ہوئے اور شاہ حبشہ کی فتح ونصرت کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ باہم مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ایک شخص اس بات کے لیے متعین کیا جائے کہ وہ جنگ کے نتیجہ کی برابر ہم لوگوں کو خبر پہنچاتا رہے اور اگر ضرورت ہو تو ہم بھی اس کی امداد کے لیے نکلیں۔ سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کیا۔ یہ اگرچہ نوعمر تھے لیکن نہایت جرّی اور بہادر تھے۔ جنگ کا میدان دریائے نیل کے پار تھا۔ سب کو اس نوجوان کی جرأت پر تعجب ہوا مگر ان کے اصرار پر بالاتفاق ان کی سفارت منظور ہوئی اور سب مسلمانوں نے مل کر نجاشی کی فتح اور دشمن کی ہزیمت وہلاکت کی دعائیں مانگیں۔ سیدنا زبیر مشک کے سہارے تیرتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچے اور چند روز بعد نجاشی کی فتح ونصرت کی بشارت لے کر واپس آ گئے۔ مسلمانوں نے نجاشی کی کامیابی پر شادمانی کا اظہار کیا اور نجاشی کی خدمت میں تہنیت فتح ونصرت پیش کی۔

(دلائل النبوۃ بیہقی: ۲/۲۷، ابن ہشام: ۱/ ۸۷، دلائل النبوۃ لابی نعیم: ۱/۸۱)

نجاشی کو دعوتِ اسلام:

محرم سنہ ۷ ہجری کا زمانہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے قاصد سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ راہ سفر طے کر کے حبشہ پہنچے اور نجاشی کے بعض مقربین کے واسطہ سے دربار میں اذن باریابی حاصل کیا۔ اسلامی آداب بجالا کر سیدنا عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے اصحمہ شاہ حبش کے سامنے پہلے تو اس طرح خطاب کیا:

''اے بادشاہ! میرے ذمے حق کی تبلیغ ہے اور آپؐ کے ذمے حق کی سماعت۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ گذشتہ دنوں سے ہم لوگوں پر آپ کی شفقت ومحبت کا یہ حال ہے کہ گویا آپ اور ہم ایک ہی ہیں اور ہم کو بھی آپ پر اس قدر اعتبار ہے کہ ہم آپ کو کسی طرح اپنی جماعت سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ ہم نے جس نیکی اور بھلائی کی امید آپ سے کی اس میں ہم کامیاب ہوئے اور جس خطرہ کا بھی اندیشہ کیا ہمیشہ اس سے بے خوف اور مامون رہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش ہماری طرف سے آپ پر حجت قطعی ہے یعنی جس قدرت کے کرشمہ ساز ہاتھوں

نے سیدنا آدم علیہ السلام کو بغیر والدین کے مٹی سے پیدا کر دیا اسی نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے بطن مادر سے پیدا کیا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (آل عمران ۳:۵۹) ''اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی مثال کی طرح ہے، آدم علیہ السلام کو اس نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر حکم دیا تو وہ عالم وجود میں آ گئے۔''

''ہمارے اور آپ کے مابین انجیل وہ شاہد ہے جس کی شہادت کبھی مردود نہیں ہو سکتی اور وہ حاکم ہے جس سے ظلم کا امکان نہیں۔ اس نبی ﷺ کی پیروی میں خیر و برکت کا ورود اور فضیلت و بزرگی کا حصول ہے۔''

''اے بادشاہ! اگر آپ نے محمد ﷺ کا اتباع نہ کیا تو اس نبی امی ﷺ کا انکار آپ کے لیے اس طرح باعث وبال ہوگا جس طرح یہود کے حق میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار وبال ثابت ہوا۔ میری طرح رسول اکرم ﷺ کی جانب سے بعض دیگر اشخاص مختلف بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے لیے قاصد بن کر گئے ہیں مگر سرکار دوعالم ﷺ کو جو امید آپ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہے دوسروں سے ایسی امید نہیں ہے اور جس بات کا ان سے اندیشہ ہے آپ سے اس کے بارے میں پورا اطمینان ہے کہ آپ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان گذشتہ طاعات اور آئندہ کے اجر و ثواب کا خیال رکھیں گے۔''

جونہی سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر ختم کی تو ان کی اس جرأت آمیز نصیحت کی داد دیتے ہوئے نجاشی نے حسب ذیل جوابی تقریر کی:

''عمرو! بخدا! میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہی برگزیدہ نبی اور رسول ہیں جن کی آمد کا اہل کتاب انتظار کر رہے ہیں۔ بے شک سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ایک حمار عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دینا اسی طرح ٹھیک ہے جیسا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے راکب جمل محمد ﷺ کی بشارت دی ہے۔ دونوں میں سرِ مُو فرق نہیں اور اس بارے میں میرے لیے مشاہدہ اور خبر دونوں برابر ہیں یعنی اگرچہ

میں نے جمال جہاں آراء سے اپنی آنکھیں منور نہیں کیں لیکن حالات سن کر مجھ کو ان کے نبیؐ ہونے کا یقین ہے۔ مگر اہل حبشہ میں میرے معین و مددگار بہت کم ہیں، اس لیے مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنی قوم میں اپنے کافی مددگار اور ان کے دلوں میں نرمی پیدا کرلوں۔"

نجاشی اصحمہ یہ تقریر کر کے خاموش ہوگیا اور عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے نامۂ مبارک ہاتھ میں لے کر تعظیماً آنکھوں سے لگایا اور مزید شرف و اعزاز کی خاطر تخت شاہی سے اتر آیا اور ترجمان کو بلا کر نامہ مبارک کو پڑھنے کا حکم دیا۔

وہ مکتوب گرامی جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھا وہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے اور زرقانی اور اسد الغابہ وغیرہ نے اس کو نقل کیا ہے۔

نقل نامہ مبارک بنام اصحمہ نجاشی حبشہ:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى النَّجَاشِيِ الْاَصْحَمِ مَلِكِ الْحَبْشَةِ، سَلِّمْ اَنْتَ! فَاِنِّى اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ، وَاَشْهَدُ اَنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ رُوْحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ الْبَتُوْلِ الطَّيِّبَةِ الْحَصِيْنَةِ، فَحَمِلَتْ بِعِيْسٰى، حَمَلَتْهُ مِنْ رُوْحِهٖ وَنَفْخِهٖ، كَمَا خَلَقَ آدَمَ بِيَدِهٖ وَنَفْخِهٖ، وَاِنِّىْ اَدْعُوْكَ اِلَى اللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَالْمُوَالَاةِ عَلٰى طَاعَتِهٖ وَاَنْ تَتَّبِعَنِىْ وَتُؤْمِنَ بِالَّذِىْ جَآءَ نِىْ فَاِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَقَدْ بَعَثْتُ اِلَيْكَ اِبْنَ عَمِّىْ جَعْفَرًا وَ نَفَرًا مَعَهٗ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، فَاِذَا جَآءَكَ فَاَقْرِهِمْ وَدَعِ التَّجَبُّرَ وَاِنِّىْ اَدْعُوْكَ وَجُنُوْدَكَ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، وَقَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ فَاقْبَلُوْا نُصْحِىْ، وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى.)) (اسد الغابہ:۱/۲،الزرقانی:۳/۳۹۳،طبری:۳/۸۹،اعجاز القرآن:ص۱۱۳،جمہرۃ رسائل العرب:۱/۳۶،صبح الاعشیٰ:۶/۳۷۹)

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط ہے اللہ کے رسول محمد ﷺ کی جانب سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام۔تم پر سلامتی ہو۔میں تجھ کو اس خدا کی حمد سناتا ہوں جو معبودیت میں یکتا ہے،اس جہان کا مالک ہے۔ برگزیدہ ہے،سلام یعنی سرچشمۂ سلامتی ہے، امان دینے والا ہے، پناہ میں لینے والا ہے،نگہبان ہے اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے مریم بتول کو عطا کیا تھا۔ وہ مریم (سلام اللہ علیہا) جو پاکیزہ، عفت مآب اور پاک دامن تھیں۔ چنانچہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو پیٹ میں لیے پھریں۔ یہ حمل انھیں اللہ کی روح اور پھونک سے ہوا جس طرح کہ آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے تخلیق فرمایا تھا اور ان کے جسد میں روح پھونکی تھی۔ میں تجھے اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی اطاعت پر دوستی اور مودّت کی دعوت دیتا ہوں تاکہ تو میری اتباع اور پیروی کرے اور جو کچھ مجھ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آئے، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسولؐ اور پیامبرؐ ہوں۔ میں اپنے چچا زاد بھائی جعفر (رضی اللہ عنہ) کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ جب وہ تیرے پاس آئیں تو ان کی مہمان نوازی کرنا، تکبر نہ کرنا، میں تجھے اور تیرے لشکر کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا ہے اور تیری خیر خواہی کا کام کر دیا ہے، اس لیے میری نصیحت قبول کر لو اور اسلام ہو اس پر جو راہ ہدایت کی پیروی کرے۔''

اصحمہ نامہ مبارک کو سنتا جاتا تھا اور متاثر ہوتا جاتا تھا۔ جونہی مکتوب کا مضمون ختم ہوا تو اس نے فرطِ شوق سے نامہ مبارک کو بوسہ دے کر اپنے سر پر رکھ لیا اور سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو دربار میں بلا کر اسلام کے بارے میں گفتگو کی اور گفتگو کے بعد ان کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور آپ ﷺ کے نامہ مبارک کے جواب میں حسب ذیل خط آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے بیٹے اور ایک وفد کے ہمراہ دربار نبوت میں بھیجا۔ اس خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔ اصل خط ''سیرۃ حلبیہ'' وغیرہ میں منقول ہے:

''اصحمہ نجاشی کی جانب سے محمد رسول اللہ ﷺ کے نام، سلامتی ہو آپؐ پر اور اللہ کی رحمت اور برکت اے اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبیؐ! وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہے جس نے مجھے اسلام کا راستہ دکھایا اور میری راہ نمائی کی۔

امابعد! اے اللہ کے نبیؐ آپؐ کے مکتوب گرامی کی زیارت کا شرف مجھ کو حاصل ہوا۔ آپؐ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے زمین و آسمان کے رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ ہم نے ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جو آپؐ نے ہم تک پہنچائیں۔ آپؐ کے چچا کے بیٹے اور ان کے رفقاء ہمارے مقرّب ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔ میں آپؐ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوگیا اور آپؐ کے چچیرے بھائی کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین کے لیے بیعت کر لی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا اور اے اللہ کے نبیؐ میں آپؐ کی خدمت میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں، اگر آپؐ کا حکم ہوگا تو میں خود بھی حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔''

السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! (سیرۃ حلبیہ: ۲/۳۷۰)

سیرۃ کی کتابوں میں ہے کہ اصحمہ نے اپنے بیٹے ارہا کے ساتھ ساٹھ افراد پر مشتمل ایک وفد کے ہمراہ یہ خط بارگاہ نبوت میں حاضری کے لیے روانہ کیا لیکن بدقسمتی سے وہ تمام کشتیاں جن میں ارہا بھی سوار تھا طوفانی تھپیڑوں کی زد میں آ گئیں اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا لیکن سیدنا عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کی کشتی صحیح وسلامت رہی اور انھوں نے سب حالات بخیر وخوبی گوش گزار کیے۔ نیز اصحمہ کے مسلمان ہونے کا مژدہ سنایا۔ اصحمہ کے قبول اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اہل حبشہ کا اکثر و بیشتر حصہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔

سہیلی نے ''روض الانف'' میں لکھا ہے کہ نجاشی جب سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوکر حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا تو آہستہ آہستہ یہ خبر اہل حبش میں پھیل گئی۔ حبشہ کے باشندوں کو یہ خبر سخت ناگوار گزری اور انھوں نے نجاشی کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی اور اس سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ نجاشی نے جب اہل ملک کے یہ تیور دیکھے تو سب سے پہلے

سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انھیں کہا کہ میں نے تمھارے لیے کشتیوں کا ایک بیڑا بنوایا ہے۔ معاملہ بہت نازک ہے۔ نہ معلوم قوم میرے ساتھ کس حد تک مخالفت کرے۔ اس لیے تم تمام مہاجرین کو ان کشتیوں پر سوار کر کے موقع کے منتظر رہو، اگر اللہ نے مجھ کو کامیاب کر دیا تب تم امن وامان سے پھر حبشہ میں قیام کرنا اور اگر خدانخواستہ معاملے نے دوسری صورت اختیار کر لی تو تم فوراً یہاں سے بھاگ جانا۔ اصحمہ مسلمانوں کا یہ انتظام کر کے اپنی حفاظت کی طرف متوجہ ہوا اور ایک عجیب حیلہ وہ کام میں لایا۔ اس نے ایک پرچے پر یہ الفاظ لکھے:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسولؐ ہیں، نیز گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام خدا کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں اور اس کی روح اور کلمہ ہیں جس کو خدا نے مریم پر القاء کیا۔''

یہ لکھ کر اس نے اس کو اپنی پوستین کے نیچے سینہ کے پاس چھپا لیا اور پھر اپنا دربار منعقد کیا۔ تمام اہل حبش کو صف در صف کھڑا کیا اور پھر ان کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ سوالات کیے۔ آخر میں اصحمہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا اور کہا کہ جو کچھ اس پرچہ میں لکھا ہے اس سے زیادہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اور کوئی تعلیم نہیں دی۔

اہل حبش نے اس جملہ سے اپنی تائید سمجھ کر نجاشی مخالف مظاہرہ کو ترک کر دیا۔ یہ گویا نجاشی کی ایک تائید غیبی تھی۔ ابن سعد نے طبقات میں روایت نقل کی ہے کہ اصحمہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامۂ مبارک کو ہاتھی دانت کے ڈبہ میں بند کر کے نہایت احتیاط اور تعظیم سے محفوظ کر دیا تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک یہ مبارک تحفہ مملکت حبش میں محفوظ ہے دشمن کا ہاتھ اس مملکت تک نہیں پہنچے گا۔

دربار رسالت سے اصحمہ کے نام دوسرا مکتوب:

سیدنا عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو حبشہ سے واپس آئے ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ بارگاہ رسالت سے دوبارہ ان کو حبشہ جانے کا حکم ہوا۔ اس مرتبہ سفارت کا مقصد یہ تھا کہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ اور ساتھی مہاجرین کو مدینہ منورہ واپس لایا جائے اور ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کرنے کی تحریک کی جائے۔

اس سلسلہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے اصحمہ کے نام ایک نامہ مبارک ارسال فرمایا جس میں اصحمہ کے قبول اسلام پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ہر دو امور مذکورہ بالا کے بارے میں تحریر فرمایا۔ اس نامہ مبارک کا مختصر مضمون درج ذیل ہے:

((بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امابعد فکانك من الرقة علینا منا فکانا من الرقة علینا منا فکانا من الثقة بك منك لان لا نرجوا منك خیرا الا نلناہ، ولا نخاف منك الا امناہ وباللہ التوفیق))

''شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ امابعد! تو نے ہمارے ساتھ حسن سلوک برتا اور ہم کو تجھ پر اعتماد ہے، اس لیے کہ ہم نے تجھ سے جس چیز کی امید کی وہ پوری ہوئی اور جس بات کا خوف کیا اس سے محفوظ ومصئون رہے۔ اور توفیق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

اصحاب السیر نے لکھا ہے کہ اس نامۂ مبارک کی تحریک کا شرف سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا۔ خط کا مضمون تمام ہو جانے کے بعد آپؐ نے اپنی مہر اس پر ثبت فرما دی اور سیدنا عمرو بن امیہ آپؐ کا نامہ مبارک لے کر برّی اور بحری سفر طے کرتے ہوئے دوبارہ حبشہ پہنچے۔ اصحمہ نے انھیں نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اپنا مہمان بنایا اور ان کی ہر قسم کی خاطر ومدارات کی۔ سنہ ۹ ہجری میں اصحمہ کا انتقال ہوگیا تو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج خدا کے ایک نیک بندے اصحمہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ تم سب کھڑے ہو اور اپنے بھائی پر نماز جنازہ پڑھو۔ پس ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف بندی کی اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

ملک الروم، ہرقل کے نام مکتوب گرامی:

سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں دو سپر پاورز تھیں۔ ایک کسریٰ کی ایرانی حکومت اور دوسری روم کی حکومت جس کا سربراہ ہرقل تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ۶ ہجری میں قیصر روم کی طرف سفیر بنا کر بھیجا اور انھیں ہرقل کے نام ایک خط دیا۔ قیصر روم اس زمانہ میں فارس پر اپنی فتح یابی کا شکر بجالانے کے لیے حمص سے ایلیا (بیت

المقدس) پیدل آیا ہوا تھا کیونکہ فارسیوں نے خسرو پرویز کو قتل کرنے کے بعد رومیوں سے ان کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کی شرط پر صلح کر لی اور وہ صلیب بھی انھیں واپس کر دی جس کے بارے میں عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس پر سیدنا مسیح علیہ السلام کو پھانسی دی گئی تھی۔ قیصر روم نے صلیب کو اس کی اصل جگہ پر نصب کرنے اور اللہ تعالیٰ کا اس فتح پر شکر بجا لانے کی غرض سے ٦ ہجری میں بیت المقدس کا سفر کیا۔ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اسی سال بیت المقدس پہنچے اور بصریٰ کے رئیس کے توسط سے قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ اس کو پیش کیا۔ (بخاری: ١/٤)

روم یعنی ہرقل کی حکومت وہ باجبروت حکومت تھی جس کے زیر اقتدار نہ صرف یورپ تھا بلکہ تمام شام اور بلاد عرب وعجم کے بھی بعض حصے تھے۔ قوانین وضوابط اور نظام حکومت کے اعتبار سے روم کو وہ بلند مرتبہ حاصل تھا کہ یورپ کی موجودہ متمدن حکومتیں آج تک رومن لاء کی اساس کو وحی الٰہی کی طرح سمجھتی ہیں اور اپنے قوانین کا جزو بنائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح عجم وفارس کی حکومت بھی درفش کاویانی کے زیر سایہ اپنی وسعت اور حدود مملکت کے اعتبار سے نہ صرف ایران پر قابض تھی بلکہ ایک طرف ہندوستان کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی تو دوسری جانب عراق عجم سے بھی آگے تک اس کا دائرہ وسیع تھا۔ ہوس ملک گیری کی وہ آویزش جو اکثر دو طاقتوں کو لڑا کر پر امن رعایا کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا کرتی ہے یہاں بھی موجود تھی۔ اس لیے چھٹی صدی عیسوی کی ابتداء سے قریباً ٢٥ سال تک ان دونوں سپر پاورز کے مابین ہنگامہ آرائی رہی۔ ابتدائی پندرہ سال تک قسمت کا پانسہ رومیوں کے خلاف رہا اور ہر محاذ پر فتح وظفر کسریٰ ایران کے قدم چومتی رہی اور خسرو پرویز شاہ ایران نے دامن فرات سے وادی نیل تک اور ساحل باسفورس تک سب تاخت وتاراج کر دیا۔ آرمینیہ، شام، مصر، ایشیائے کوچک یہ تمام مشرقی حصے روم کے اقتدار سے نکل کر ایران کے مقبوضات میں داخل ہو چکے تھے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ خود رومی حکومت کے پایہ تخت قسطنطنیہ کا ایرانی محاصرہ کیے ہوئے تھے اور روم کا بادشاہ ہرقل قسطنطنیہ سے فرار ہونے کے لیے پوری تیاری کر چکا تھا۔ یہ عیسائیت اور مجوسیت کی کش مکش تھی۔ مسلمانوں کو اس کش مکش سے قدرتاً ایک خاص

دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ رومی جو کہ عیسائی تھے، ایرانیوں کے مقابلہ میں جو کہ مجوسی اور مشرک تھے، غالب رہیں، لیکن رومیوں کی پیہم شکستوں اور ایران کی مسلسل فتح وکامرانی سے مسلمان کچھ دل شکستہ ہورہے تھے کہ ایک روز لسان نبوت سے قرآنی وحی کی یہ بشارت مسلمانوں نے سنی:

''رومی اقرب زمین میں مغلوب ہوگئے اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند سال ہی میں غالب ہوجائیں گے۔ فیصلہ قبل اور بعد اللہ کے لیے ہی ہے۔ اس وقت مسلمان خوش ہوجائیں گے۔'' (روم:۱۔۴)

قرآنِ حکیم کی اس بشارت کے بعد ہی پندرہ سال کی پیہم شکستوں اور پایہ تخت کا محاصرہ ہو جانے کے باوجود سنہ ۶۱۶ء میں جنگ نے دوسری کروٹ بدلی اور ہوا کا ایسا رخ پلٹا کہ ایرانیوں کو شکست پر شکست ہونی شروع ہوئی۔ ان حالات میں ایرانیوں پر رومیوں کا غلبہ ناممکنات میں سے سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک غیر مسلم دانشور اور مؤرخ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ کوئی بھی پیش گوئی اتنی بعید از وقوع نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کررہے تھے۔ لیکن یہ پیش گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی جو تمام وسائل اور ذرائع کی تنہا مالک ہے اور تمام انسانوں کے دل اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ چنانچہ ادھر اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتے نے ایک نبی کی زبان سے یہ خبر دی ادھر ہرقل قیصر روم کے حالات میں ایک انقلاب آنا شروع ہوگیا۔ گبن لکھتا ہے:

''تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں۔ اپنے طویل دورِ حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں یہ بادشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی رعایا کے مصائب کا ایک بے حس اور نامرد تماشائی ہے، لیکن صبح وشام کا بے رونق کہر دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کے لیے چھٹ جاتا ہے یہی حال ہرقل کا ہوا۔ محل کا آرے ڈلیس (Arcadius) ''یعنی رومی سلطنت کا بادشاہ'' بکا یک میدان جنگ کا سیزر (Caesor) (جولیس سیزر عظیم رومی کمانڈر اور سیاست دان)

بن گیا اور روم کی عزت چھ جرأت مندانہ مہموں کے ذریعے دوبارہ حاصل کر لی گئی۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی اسباب نہیں تھے بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا۔ اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر دیں حتیٰ کہ اپنی بھانجی مارٹینا کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔''

(گبن، زوال وعروج سلطنت رومہ، انگریزی: ۵/۴/۷۴-۷۷)

آخر ۶۲۲ سے ۶۲۵ عیسوی میں رومیوں نے پے در پے حملے کر کے ایران کی افواج کا بھرکس نکال دیا اور رومی افواج نے نہ صرف اپنا علاقہ واپس لے لیا بلکہ ایرانی قلم رو میں بھی گھس گئیں اور میسوپوٹامیا تک پہنچ گئیں۔ قیصر روم نے وہ تمام مقبوضات جو ایرانیوں نے ان سے چھین لیے تھے واپس لے لیے اور ۶۲۴ء میں شام کا وہ تمام علاقہ جس کو چند سال قبل ایرانیوں نے تباہ و برباد کر کے عرب سلاطین میں سے اس غسانی خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا جس نے صدیوں سے حکومت روم کے زیر اقتدار رومن سلطنت کے استحکام وترقی میں بیش از بیش حصہ لیا تھا، ایک عظیم الشان جنگ کے بعد ایرانیوں سے واپس لے لیا اور یہی وہ جنگ تھی جس نے حکومت ایران کے حوصلے پست کر دیے اور کامیابی کا سہرا رومیوں کے سر باندھا۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ رومی شہنشاہ اب خود ایرانی شہنشاہیت کے قلب پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پر دسمبر ۶۲۷ء میں ہوئی۔ اس طرح قرآن حکیم نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کی جو پیش گوئی کی تھی، وہ مکمل طور پر پوری ہوگئی۔

اس زمانہ میں روم کی حدود یہ تھیں: شمال مشرق میں ترکستان اور سلطنت روس، جنوب میں شام اور اسکندریہ، مغرب میں بحیرۂ روم اور حکومت اندلس۔

رومیوں کے نسب کے بارے میں مورخین کو اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب سیدنا ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ روم بن سماحیق بن برتیان بن علقان بن عیص بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ بعض کہتے

ہیں کہ رومیل بن اصفر بن نصر بن عیص بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ بہرصورت ان کو ''بنی الاصفر'' ان کے نسب کی وجہ سے نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے رنگ و روپ پر چونکہ سفیدی کے غلبہ سے زردی جھلکتی ہے، اس لیے اہل عرب ان کو ''بنی الاصفر'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ (معجم البلدان)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ہرقل نے یہ منت مانی تھی کہ اگر خدائے بزرگ و برتر نے اس جنگ میں مجھے فتح و نصرت سے نوازا تو میں پاپیادہ بیت المقدس کی زیارت کروں گا۔ چنانچہ وہ فتح و کامرانی کے بعد اپنی نذر پوری کرنے کے لیے قسطنطنیہ سے پا پیادہ بیت المقدس روانہ ہوا۔ جہاں وہ قدم رکھتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔ اسی طرح وہ حمص تک پہنچا اور وہاں کچھ روز قیام کیا۔ ۶ ہجری اور ایک روایت کے مطابق ۷ ہجری میں سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لے کر روانہ ہوئے۔ راستہ میں انھیں معلوم ہوا کہ حاکم بصریٰ اس وقت بصریٰ میں موجود نہیں ہے۔ حمص میں وہ ایک عرصہ سے اس لیے مقیم ہے کہ زیارت بیت المقدس اور رسد رسانی کا انتظام کرے، چنانچہ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ حمص روانہ ہو گئے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ابن سکن کی کتاب ''صحابہ'' سے نقل کیا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے بعد فوراً ہی عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو بھی روانہ کر دیا تاکہ وہ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ کی اعانت کریں، اس لیے کہ عدی مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھے اور شامی درباروں کے آداب و طریق سے بخوبی واقف و آشنا تھے۔

ابن ناطور حاکم بیت المقدس کا بیان ہے کہ ابھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد راستہ ہی میں تھے کہ ایک روز صبح کو ہرقل نہایت پریشان حالت میں بسترِ استراحت سے اٹھا۔ دربار شاہی کے مصاحبوں میں سے ایک مصاحب نے عرض کیا کہ آج نصیب دشمنان طبیعت زیادہ نحیف اور مضمحل نظر آتی ہے۔ نہ معلوم حضور والا کو کیا پریشانی لاحق ہے؟ ہرقل نے کہا کہ رات کو میں نے ستاروں کو دیکھا تو ایک نیا ستارہ طلوع ہوا۔ نجوم و کہانت کے ذریعے جب میں نے غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ امت کے سردار کی ولادت کسی ایسی سرزمین میں ہوئی ہے جس

کے باشندے ختنہ کراتے ہیں اور اس کی بادشاہت تمام عالم پر چھا گئی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس دور میں کس قوم میں ختنہ کی رسم ہے۔ اہل دربار نے عرض کیا کہ یہود کے علاوہ کسی اور قوم میں ختنہ کا دستور نہیں ہے۔ آپ اس قدر ملول اور رنجیدہ نہ ہوں۔ اپنی تمام قلم رو میں حکم دیجیے کہ کوئی یہودی بچہ زندہ باقی نہ رہے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد حمص سے حاکم بصریٰ نے ایک عربی شخص کو بیت المقدس کے دربار شاہی میں بھیجا۔ یہ شخص سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت اور آپؐ کے حالات زندگی اور دعوت الٰہی کے واقعات سناتا تھا۔

جب یہ شخص ہرقل کی خدمت میں پیش ہوا اور بعثت نبویؐ کا ذکر کیا تو ہرقل نے حکم دیا کہ اس شخص کو علیحدہ لے جا کر دیکھا جائے کہ یہ مختون ہے یا نہیں۔ جب ہرقل کو اطلاع دی گئی کہ یہ شخص مختون ہے تو ہرقل نے اس شخص سے دریافت کیا کہ کیا یہ رسم تمام عرب میں جاری ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں، تمام عرب ختنہ کراتے ہیں۔ ہرقل نے یہ سن کر کہا: بے شک تو جس شخص کی نبوتِ کامل کا مژدہ سناتا ہے وہی دنیا کا سردار ہے جو تمام عالم پر غالب آئے گا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ عربی شخص عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ہے جس کو سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی معاونت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ حافظ رحمہ اللہ کا قیاس درست اور صحیح ہو اور چونکہ عدی رضی اللہ عنہ شام کے علاقوں سے بہت زیادہ واقف تھے اس لیے سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ سے پہلے ہی وہ حمص پہنچ گئے ہوں اور حارث شاہ بصریٰ نے فوراً ہی ان کو بیت المقدس روانہ کر دیا ہو اور یہ شبہ پیدا کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ہرقل کے ایک سوال پر اس کے مصاحبین نے یہ کہا تھا کہ اس زمانہ میں ختنہ کی رسم یہود کے علاوہ کسی قوم میں نہیں پائی جاتی اور عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بقول حافظ ابھی تک نصرانی تھے تو ان کا مختون ہونا کیسے باور ہو؟ وہ اس لیے کہ عدی رضی اللہ عنہ اگرچہ عیسائی تھے لیکن عربی نژاد ہونے کے باعث عرب کا دستور ان میں بھی پایا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

ہرقل انھی حالات میں بیت المقدس میں مقیم تھا کہ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم ﷺ کا نامہ مبارک لے کر حمص پہنچے اور حارث غسانی کو والا نامہ سپرد کیا۔ حارث نے نامہ مبارک کو اور اس کے ساتھ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قیصر کے دربار میں بیت المقدس بھیج

دیا۔ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس پہنچے تو اہل دربار نے ان کو دربار میں داخل ہونے کے طور طریقے سمجھائے اور انھیں بتایا کہ جب تم قیصر کے سامنے پہنچو تو تخت کے سامنے سجدہ کرنا، اس لیے کہ اس دربار کا یہی دستور ہے۔ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا دین اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کے سوا اور کسی کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں ہرگز ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ اہل دربار نے کہا کہ اچھا اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو جب تم دربار میں پہنچو تو خود اپنے ہاتھ سے اس نامہ کو قیصر کے سامنے رکھ دینا اس لیے کہ تخت شاہی پر نامہ رکھ دینے کے بعد کسی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کو ہاتھ لگائے۔ صرف قیصر ہی اس کو اپنے ہاتھ سے اٹھا سکتا ہے۔

امام سہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ قیصر روم کو پیش کرنے سے قبل حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے ایک مختصر سی تقریر فرمائی کہ:

''اے قیصر! جس ہستی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے وہ سب سے بلند وبالا اور اعلیٰ وارفع ہے، لہٰذا میں جو کچھ آپ کے سامنے عرض کروں اس کو نہایت متواضع ہو کر سنیں اور نہایت غور وفکر اور اخلاص سے اس کا جواب دیں، اگر آپ اس کو متواضع ہو کر نہ سنیں گے تو اس کو بخوبی سمجھ نہ سکیں گے اور اگر جواب میں اخلاص نہ ہوگا تو وہ جواب درست اور عادلانہ نہ ہوگا۔''

''یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نماز پڑھا کرتے تھے جس کے سامنے وہ اپنی جبین نیاز جھکاتے تھے اور جس نے انھیں بطن مادر میں بنایا اور جس ذات نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا میں اس ذات ستودہ صفات کی طرف آپ کو بلاتا ہوں۔ پھر اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دعوت دیتا ہوں جس کی سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام نے بشارت دی ہے اور آپ کو اس کی بخوبی خبر ہے، اگر آپ اس دعوت کو قبول کریں گے تو یہ آپ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کے لیے بہتر ہوگی اور اگر قبول نہ کریں گے تو آپ کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہوگا، ورنہ آخرت تو تمھارے ہاتھ سے جاتی رہے گی

اور دنیا میں دوسرے لوگ آپ کے شریک ہوں گے اور اس بات کو بھی بخوبی جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ جو منکرین کو پامال اور تباہ و برباد کر دیتا ہے، اپنی نعمتوں کو بدلتا رہتا ہے۔"

قیصر روم سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور اس نے ان کے ہاتھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ لے کر سر اور آنکھوں پر رکھا اور اسے چوما پھر اسے کھول کر پڑھا اور کہا: "میں سوچ کر اس کا جواب دوں گا۔" (روض الانف:۲/۳۵۵)

ہرقل نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ عرب کے جو لوگ میرے ملک میں آئے ہوئے ہیں ان کو میرے سامنے حاضر کرو۔ میں ان سے اس نبیؐ کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے ابوسفیان بن حرب قریش کی جماعت کے ساتھ معاہدۂ حدیبیہ کے تحت اس عرصہ میں تجارت کے لیے ملک شام گئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بیت المقدس (ایلیا) میں قیصر روم کے پاس حاضر ہوئے۔ ہرقل نے انھیں اپنے دربار میں بلایا۔ یہ حضرات اس وقت غزہ میں مقیم تھے۔ ان کو ہرقل کے آدمی غزہ سے لے کر آئے۔ دربار میں اساطین سلطنت، بڑے بڑے پادری اور راہبان موجود تھے۔ ان سب کی موجودگی میں ہرقل نے ان لوگوں سے ترجمان کے ذریعے پوچھا کہ تم میں سے اس مدعی نبوتؐ کا حسب ونسب کے لحاظ سے سب سے زیادہ قریبی شخص کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا: "میں ہوں۔" ہرقل نے کہا: "تم میرے قریب آؤ۔ دوسرے ساتھیوں کو ان کے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ان پیچھے بیٹھنے والوں سے کہا کہ میں اس شخص سے اس مدعی نبوتؐ کے بارے میں کچھ سوالات کروں گا، اگر یہ جھوٹ بولے تو تم لوگ اس کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر مجھ کو جھوٹ بولنے کی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یقیناً جھوٹ بولتا۔ بعد ازاں اس نے ان سے مختلف سوالات کیے جن کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے متعدد ابواب میں نقل کیا ہے۔ وہ سوالات پوچھنے کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ تم اس شخص (ابوسفیان) سے کہو کہ میں نے تم سے اس شخص کا نسب پوچھا تو تم نے بتایا کہ وہ اونچے نسب کا ہے اور دستور یہی ہے کہ نبی اپنی قوم میں اونچے حسب ونسب والا ہوتا ہے۔

پھر میں نے پوچھا کہ کیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی تھی؟ تم نے بتایا کہ نہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر یہ بات اس سے قبل کسی اور نے کہی ہوتی تو میں یہ کہتا کہ یہ شخص ایک ایسی بات کی نقالی کر رہا ہے جو اس سے قبل کہی جا چکی ہے۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ اس کے آباء واجداد میں سے کوئی بادشاہ تو نہیں گزرا؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ شخص اپنے باپ دادا کی گئی ہوئی سلطنت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پھر میں نے تم سے پوچھا کہ جو بات اس نے کہی ہے اسے کہنے سے پہلے تم نے اسے کسی معاملہ میں جھوٹا تو نہیں پایا؟ تم نے جواب دیا کہ نہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ نہ باندھے اور اللہ پر جھوٹ باندھے۔

پھر میں نے دریافت کیا کہ اس کی پیروی اور اتباع بڑے بڑے لوگ کر رہے ہیں یا کمزور اور ضعیف لوگ؟ تو تم نے بتایا کہ اس کی پیروی کرنے والے اکثر کمزور اور ضعفاء ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کی اتباع کرنے والے اکثر وبیشتر غرباء اور ضعفاء ہی ہوتے ہیں۔

پھر میں نے پوچھا کہ اس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص ناراض اور برگشتہ ہوکر مرتد بھی ہو جاتا ہے تو تم نے بتایا کہ نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی بشاشت اور حلاوت جب دلوں میں سرایت کر جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ نکلتی نہیں۔

پھر میں نے پوچھا کہ وہ بدعہدی بھی کرتا ہے؟ تو تمھارا جواب یہ تھا کہ نہیں اور بے شک نبی اور رسول ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ کبھی بدعہدی اور پیمان شکنی نہیں کرتے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ کبھی تم نے اس سے جنگ بھی کی ہے اور جنگ کا نتیجہ کیا نکلا؟ تو تمھارا جواب یہ تھا کہ کبھی وہ غالب ہوا اور کبھی ہم۔ بے شک انبیاء کے ساتھ ابتداً اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہوتا ہے لیکن انجام کار غلبہ اور فتح انھی کو حاصل ہوتی ہے۔

پھر میں نے یہ دریافت کیا کہ وہ کن کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور کسی کو اس کی ذات وصفات میں شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیتا ہے۔ بت پرستی سے روکتا ہے، نماز اور زکوٰۃ، سچائی اور پرہیزگاری اور عفت وپاکدامنی

وغیرہ کا حکم دیتا ہے۔

جو کچھ تم نے بتایا اگر وہ سب صحیح اور درست ہے تو یہ شخص بہت جلد میرے ان دونوں قدموں کی جگہ کا مالک ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن میرا یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں سے ہوگا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ اس کے حضور پہنچ سکوں گا تو اس سے ضرور ملاقات کرتا اور اگر اس کے پاس ہوتا تو اس کے دونوں پاؤں دھوتا۔

پھر ہرقل نے سرکار دو عالم ﷺ والا نامہ منگوا کر پڑھا۔ جب پڑھ چکا تو ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔

نامہ مبارک بنام ہرقل قیصر روم:

((" بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ ، سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ ، ﴿وَيَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران ۳:۶۴)

وَذَكَرَ أَبُو عبيد القاسم بْنُ سَلَامٍ الْهَرَوِيُّ أَنَّ كِتَابَ النَّبِيِّ ﷺ إِلَى هِرَقْلَ قَيْصَرِ الروم كَانَ فِيْهِ مَا نَصُّهُ.

"مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِلَى صَاحِبِ الرُّوْمِ: إِنِّيْ أَدْعُوْكَ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَسْلَمْتَ فَلَكَ مَا لِلْمُسْلِمِيْنَ وَعَلَيْكَ مَا عَلَيْهِمْ ، وَإِنْ لَمْ تَدْخُلْ فِي الْإِسْلَامِ فَأَعْطِ الْجِزْيَةَ ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُوْلُ: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبۃ:۲۹)

وَاِلَّا فَلَا تَحُلْ بَيْنَ الْفَلَاحِيْنَ وَبَيْنَ الْاِسْلَامِ اَنْ يَدْخُلُوْا فِيْهِ اَوْ يُعْطُوْا الْجِزْيَةَ .))

(کتاب الاموال: ۱۶۷) (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بخاری: ۱/۴، مسلم: ۵/ ۱۵۶، طبری: ۳/ ۸۷، ابن اثیر: ۲/ ۸۱، سیرۃ حلبیہ: ۲/ ۳۶۶، زرقانی: ۳/ ۳۸۴، الاغانی: ۶/ ۹۳، صبح الاعشیٰ: ۶/ ۳۷۶)

''اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے ہرقل عظیم روم کی طرف۔ اس پر سلام ہو جو راہ ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لے تمام آفات سے محفوظ و مصئون رہے گا۔ اسلام لے آ، اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اگر تو نے انکار کیا اور اسلام قبول کرنے سے اعراض برتا تو پھر تمام رعایا کا گناہ اور وبال بھی تیری گردن پر ہوگا۔ اے اہل کتاب! آؤ اس کلمہ کی طرف جو تمھارے اور ہمارے درمیان برابر ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم ایک دوسرے کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائیں اور اگر تم کو اس سے انکار ہے تو تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔''

ابوعبید قاسم بن سلام ہروی نے ذکر کیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ہرقل قیصر روم کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ لکھا تھا:

''محمد اللہ کے رسولؐ کی جانب سے صاحب روم کے نام۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ پس اگر تو نے دعوت اسلام کو قبول کر لیا تو تیرے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو اہل اسلام کے ہیں اور اگر تو دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوا تو تو جزیہ ادا کر کیونکہ ارشاد خداوندی ہے: ''ان لوگوں سے جہاد کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان چیزوں کو حرام نہیں جانتے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام کی ہیں، وہ دین حق کی تابعداری اور اطاعت نہیں کرتے اور ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ

ماتحت ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، بصورت دیگر کسانوں اور اسلام کے درمیان رکاوٹ نہ بن کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوں یا جزیہ دیں۔''

خط پڑھا گیا لیکن سب سے پہلے تو قیصر کا بھائی نیاق برہم ہوا کیونکہ اہل عجم کا یہ دستور تھا کہ وہ جب امراء، حکام یا بادشاہ کو خط لکھتے تو حاکم یا بادشاہ کے نام سے خط کو شروع کرتے اور اپنا نام آخر میں لکھتے، لیکن آپ ﷺ نے اپنے نامۂ مبارک میں اپنا نام پہلے لکھا اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں۔ اس پر قیصر کا بھائی نیاق سخت غصہ میں آیا۔ وہ غیظ وغضب میں کہنے لگا۔ اس عربی نے بادشاہ کی سخت توہین کی ہے۔ ہرقل شہنشاہ روم کے نام خط لکھا جائے اور شروع اپنے نام سے ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ نامۂ مبارک کو چاک کر دے لیکن قیصر روم نے اس کا یہ رویہ دیکھ کر سختی سے اسے روکا اور کہنے لگا کہ اس میں توہین کی کیا بات ہے؟ اس نے مجھے سلطان روم ہی تو لکھا ہے۔ واقعہ کے خلاف تو انھوں نے کوئی بات نہیں کی پھر تمھارا یہ غیظ وغضب کیسا؟ قیصر نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس شان کی تحریر اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی۔

قیصر اور ابوسفیان کی گفتگو نے دربار کے امراء، پادریوں، راہبوں اور بطریقوں کو سخت برہم کر دیا تھا۔ اب نامہ مبارک کو سن کر وہ اور زیادہ برافروختہ ہو گئے۔ پھر بادشاہ کے بھائی نیاق کی حمایت بھی ان کو حاصل تھی۔ یہ دیکھ کر قیصر نے ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو دربار سے اٹھا دیا۔ ابوسفیان جب دربار سے اٹھے تو باہر آنے کے بعد ابوسفیان نے ساتھیوں سے کہا کہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ابوکبشہ ❶ (یعنی محمد ﷺ) کے بیٹے کا معاملہ بڑا زور پکڑ گیا ہے۔ اب تو اس سے بنو اصغر (رومیوں) کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ

❶ (علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو ابن ابی کبشہ متعدد وجوہ سے کہا جاتا تھا۔ (۱) ابوکبشہ ایک شخص عرب میں گزرا ہے جو عرب کے مشرکانہ عقائد کا سخت مخالف تھا۔ (۲) ابوکبشہ آپ ﷺ کی والدہ کے رشتہ میں آپ کے کسی نانا کی کنیت تھی۔ (۳) ابوکبشہ حلیمہ سعدیہؓ کے شوہر حارث کی کنیت تھی۔ (۴) بعض کا خیال ہے کہ ابو کبشہ عرب میں ایک شخص گزرا ہے جو ستارہ شعریٰ کی پرستش کا موجد تھا۔ عرب آپ ﷺ کو اس لیے ابوکبشہ کہتے تھے کہ اہل عرب کے نزدیک آپ بھی ایک نئے مذہب کے موجد تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوکبشہ آپ ﷺ کے ننھیالی رشتہ میں کسی جد کا نام ہے۔ عرب کا دستور ہے کہ جب کسی کی توہین کرتے ہیں تو اس کی اس کے غیر معروف جد کی طرف نسبت کرتے ہیں۔)

اس کے بعد مجھے پورا یقین ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کا دین تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اسلام کی توفیق عطا فرما دی۔ (بخاری: ۱/ ۳۰)

اسی سلسلہ میں سیرۃ حلبیہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا کہ قیصر کے دل میں نبی اکرم ﷺ کی صداقت جاگزین ہوتی جاتی ہے تو مجھ سے خاموش نہ رہا گیا اور میں نے عرض کیا: "اے بادشاہ! آپ کو معلوم نہیں یہ شخص ایسی عجیب وغریب باتیں کہتا ہے کہ عقل بھی اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس کی ان عجیب باتوں میں سے ایک بات سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ جب وہ مکہ میں تھا تو اس نے ایک روز اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میرے خدا نے مجھ کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں تک سیر کرائی ہے اور مسلمان اس واقعہ کو اسراء اور معراج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قیصر ابھی خاموش تھا کہ ناطور حاکم بیت المقدس نے عرض کیا: "جہاں پناہ! ایک واقعہ اسی زمانے میں مجھ پر بھی گزرا ہے جس سے میں ہمیشہ متعجب رہتا تھا اور ابوسفیان کی اس بات نے تو مجھ کو اور بھی زیادہ تعجب میں ڈال دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ رات کے وقت اپنی نگرانی میں ہیکل کے دروازے بند کرا دیا کرتا تھا کہ ایک رات کو غالباً وہی رات تھی جس کا ذکر ابوسفیان کرتا ہے، معمول کے مطابق میں ہیکل کے دروازے بند کرانے لگا تو تمام دروازے بغیر کسی خاص کوشش کے بند ہوگئے لیکن ایک دروازہ بند نہ ہو سکا۔ میں نے اس معاملہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور اسی طرح دروازہ کھلا رہنے دیا۔ صبح جب ہیکل میں حاضری کے لیے داخل ہونے لگا تو اس دروازہ کے قریب ہی کسی چوپایہ کے قدموں اور سموں کے نشان نظر آئے اور سامنے پتھر کے نزدیک بھی ایسے نشان موجود تھے کہ جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس پتھر کے نزدیک کوئی جانور باندھا گیا ہے۔

رومیہ میں ہرقل کا ایک بہت بڑا مقرب اور مذہبی عالم (پاپا) رہتا تھا۔ قیصر نے اس کے نام خط لکھا جس میں اس معاملہ کے بارے میں تصدیق چاہی۔ قیصر بیت المقدس سے حمص آ گیا اور اس وقت تک اسی جگہ مقیم رہا جب تک کہ اس کا جواب قیصر کے پاس نہ آ گیا۔

طبری نے بروایت اسحٰق روایت کیا ہے کہ جب سرکار دو عالم ﷺ کا نامہ مبارک پڑھا جا چکا

تو ہرقل نے سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سے خلوت میں یہ کہا کہ مجھے یقین کلی ہے کہ جس شخصیت کی جانب سے تم خط لے کر آئے ہو، وہ اللہ کے سچے رسولؐ ہیں لیکن جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو میری قوم اس معاملہ میں سخت برہم ہے، وہ ہرگز میری پیروی نہ کرے گی البتہ تم شہر رومیہ جاؤ۔ وہاں کا حاکم مذہبی حیثیت سے اسقف اعظم (پاپا) کا درجہ رکھتا ہے، قوم پر اس کا مذہبی اثر بہت زیادہ ہے، وہ اگر اس رسولؐ کی رسالت کی تصدیق کر دے گا تو پھر مجھ کو بھی ان کے سمجھانے کا موقع مل سکے گا۔ تم خود رومیہ جاؤ اور ضغاطر حاکم رومیہ کے پاس میرا خط لے جاؤ اور فوراً اس کا جواب لے کر واپس آؤ۔

بخاری اور طبری میں اگر چہ اجمال اور تفصیل کا فرق ہے لیکن نفس واقعہ میں اتفاق ہے۔

غرض سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ رومیہ پہنچے اور ضغاطر کو قیصر کا خط دیا۔ ضغاطر نے قیصر کو جواب میں لکھا کہ بے شک نبی منتظر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال درست ہے اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ طبری کے الفاظ ہیں:

((صاحبك واللہ نبی مرسل تعرفه بصفة ونجده فی کتبنا باسمه)) (طبری:۳/۸۹)

"(دحیہ!) تمھارا صاحب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک نبی مرسل ہے، ہم ان کی صفات سے بخوبی آشنا ہیں، اور ان کے نام کا تذکرہ آسمانی کتابوں میں پاتے ہیں۔"

قیصر کے پاس جب ضغاطر کا پیغام پہنچا تو اس نے ارکان اور اعیان حکومت کو شاہی محل میں اکٹھا کیا اور حکم دیا کہ محل کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد اہل دربار سے کہا: "اے اہل روم! اگر تم رشد و ہدایت اور فلاح و نجاح ابدی کے طالب ہو اور چاہتے ہو کہ تمھارا ملک اسی طرح محفوظ رہے تو عرب کے اس نبیؐ کی پیروی کرو اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔

قیصر نے گفتگو ختم کی ہی تھی کہ چاروں طرف سے شور و غوغا شروع ہو گیا اور حاضرین نے قیصر کی اس گفتگو کے خلاف اپنی نفرت اور حقارت کا کافی مظاہرہ کیا اور نہ صرف یہ بلکہ دربار سے غیظ و غضب میں اٹھ کر دروازوں کی طرف بڑھے لیکن دیکھا کہ دروازے بند تھے۔

ادھر قیصر نے جب ان کا یہ رنگ دیکھا تو اس کو واپس بلایا اور کہنے لگا کہ بے وقوفو! میں نے تم سے یہ ساری باتیں تمھیں آزمانے کے لیے کی تھیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے مذہب میں کس قدر ثابت قدم اور پختہ ہو۔ اہل دربار نے قیصر کی جب یہ گفتگو سنی تو بہت خوش ہوئے اور اظہار مسرت میں قیصر کی تخت بوسی کی اور اس کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ قیصر کے دل میں اگرچہ اسلام کی صداقت گھر کر چکی تھی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ نبی کریم ﷺ وہی نبی منتظر ہیں جن کی بعثت کی بشارت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی لیکن تخت و تاج اور اقتدار دنیوی کی تاریکی اس روشنی پر غالب آ گئی، اس طرح قیصر روم کے قلب کی روشنی کفر کی ظلمت میں تبدیل ہوگئی۔

طبری کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ضغاطر کے پاس قیصر کا پیغام لے کر پہنچے تو اس نے صاف لفظوں میں سرکار دو عالم ﷺ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کی اور پھر کلیسا میں جا کر عبادت کے وقت ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے یہ تقریر کی:

((یا معشر الروم! انه قد جاء نا کتاب من احمد یدعونا فیه الی اللّٰه عزوجل انی اشهد ان لا اله الا اللّٰه وان احمد عبده ورسوله)) ...... الخ

"اے اہل روم! ہمارے پاس عرب کے پیغمبر احمد (ﷺ) کا خط آیا ہے۔ اس نے ہم کو اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور احمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"

ضغاطر کی اس تقریر کو سن کر تمام رومی سخت برہم اور غصہ میں آ گئے اور اپنے اس مقبول ترین اور ہر دل عزیز اسقف اعظم کو اتنا زدوکوب کیا کہ وہ بیچارا جان بحق ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ واقعہ دیکھا تو فوراً وہاں سے روانہ ہو کر حمص آ گئے اور قیصر روم کو ضغاطر رومیہ کا خط سپرد کر کے تمام واقعہ سنایا۔ قیصر نے جب یہ واقعہ سنا تو بہت مایوس ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے شاہی محل میں ارکان اور اعیان سلطنت کو جمع کر کے وہ گفتگو کی جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔

ضغاطر کے نام دعوت اسلام:

ابن سعد نے طبقات میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ کو قیصر روم کے پاس خط دے کر بھیجا تو ساتھ ہی رومیہ کے مشہور عیسائی اسقف اعظم ''ضغاطر'' کے نام بھی اسلام کی دعوت کا ایک نامہ مبارک لکھ کر دیا اور سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ وہ رومیہ جا کر یہ خط ضغاطر کو پہنچا دیں۔ ابن سعد نے نامہ مبارک کے الفاظ یوں نقل کیے ہیں:

((بسم الله الرحمن الرحيم . سلام على من آمن انا على اثر ذالك ، فان عيسٰى بن مريم روح الله وكلمته ، القاها الى مريم الزكية ، وانى أومن بالله وما انزل الينا وما انزل الى ابراهيم واسماعيل واسحق ويعقوب والاسباط ، وما اوتى موسٰى وعيسٰى وما اوتى النبيّون من ربهم لا نفرق بين احد منهم ونحن له مسلمون . والسلام على من اتبع الهُدٰى .))

(طبقات ابن سعد: ۱۸۹/۳)

''شروع اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔ سلام اس پر جو اللہ پر ایمان لایا، میں اسی عقیدہ پر ہوں کہ سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جو اللہ نے اس پاک دامن اور عفت مآب مریم پر القاء کیا اور میں اللہ پر اور اس کی ان کتابوں اور احکام پر ایمان رکھتا ہوں جو ہم پر نازل ہوئیں اور ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئیں، اور ان پر بھی میرا ایمان ہے جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو ان کے رب کی جانب سے دی گئیں۔ ہم ایمان واعتقاد میں کسی ایک نبی کے تسلیم کرنے میں بھی باہمی فرق نہیں کرتے اور ہم تو مسلمان ہیں۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔''

ابن سعد اور طبری کی روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جب قیصر روم کو یہ معلوم ہوا کہ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ ضغاطر کے پاس رومیہ بھی جانے والے ہیں تو

اس نے ان کو اپنا بھی ایک خط دے دیا اور ان سے یہ کہہ دیا کہ وہ واپسی پر ادھر سے ہو کر جائیں تاکہ مجھ کو معلوم ہو جائے کہ ضغاطر کی اس مدعیٔ نبوتؐ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ قیصر ابھی حمص ہی میں مقیم تھا کہ سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ جواب لے کر واپس آ گئے اور اسقف اعظم ضغاطر کا تصدیق نبوت کرنا اور اس کے باعث اس کا شہید ہو جانا، یہ تمام واقعہ قیصر سے بیان کیا۔

سلطنت روم کا زوال:

جب سلطنت روم نے دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو لسان نبوت سے ایک روز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ الفاظ سنے:

((اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده))

"جب قیصر ہلاک ہوگا تو اس کے بعد پھر کوئی قیصر نہ ہوگا۔"

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ خلافت فاروقی میں قیصر کی زندگی ہی میں روم پر اسلامی شوکت واقتدار کا قیام اور رومی حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور قیصر نے جس سلطنت کی خاطر دعوت اسلام کو قبول نہیں کیا تھا وہ بہت جلد اسلامی اقتدار کے زیر نگیں آ گئی، چنانچہ اس سلسلہ میں علی بن بران حلبی رحمہ اللہ نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ:

((لو تفطن هرقل لقوله ﷺ في الكتاب اليه "اسلم تسلم" وحمل الجزاء على عمومه في الدنيا والآخرة تسلم واسلم من كل ما يخافه ولكن التوفيق بيد الله .)) (سیرۃ حلبیہ: ۲/ ۲۶۹)

"اگر ہرقل نبی اکرم ﷺ کے نامہ مبارک کے جملہ (اسلم تسلم) "اسلام لے آ محفوظ رہے گا" کی حقیقت کو سمجھ لیتا اور اس سلامتی کی بشارت کو دنیا اور آخرت دونوں کے حق میں یقین کر لیتا تو ضرور مسلمان ہو جاتا اور دنیا کی ہر قسم کی ذلت اور رسوائی اور زوال حکومت سے جس کا اس کو خوف تھا، محفوظ ہو جاتا لیکن اصل توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

ہرقل قیصر روم باوجود اس بات کے کہ دل سے سمجھتا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں لیکن دنیوی فوائد اور اقتدار کی خاطر وہ آپ ﷺ پر ایمان نہ لایا لیکن سفیر نبوت سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی مال اور مختلف پارچہ جات سے تواضع کی اور سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ جب وہ تمام تحائف لے کر واپس ہوئے تو قبیلۂ جذام کے کچھ لوگوں نے ان پر ڈاکہ ڈال کر سب کچھ لوٹ لیا۔ سیدنا دحیہ رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد سیدھے بارگاہ رسالت میں پہنچے اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پانچ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک دستہ حسمی روانہ فرمایا۔ انھوں نے قبیلۂ جذام پر شب خون مار کر ان کی خاصی تعداد کو قتل کر دیا اور ان کے چوپایوں اور عورتوں کو ہانک لائے۔ چوپایوں میں ایک ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں تھیں اور قیدیوں میں ایک سو عورتیں اور بچے تھے۔ بعد میں آپ نے اس قبیلہ کے سردار زید بن رفاعہ کے احتجاج اور فریاد پر ان کا احتجاج قبول فرماتے ہوئے تمام مال غنیمت اور قیدی واپس کر دے۔ (زاد المعاد لابن قیم: ۲/۱۲۲)

قیصر روم ہرقل اپنے پادریوں اور رؤساء سے ڈر کر مسلمان نہ ہوا کیونکہ اسے خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں مجھے اقتدار سے محروم نہ کر دیا جائے اور میری حکومت نہ چھین لی جائے لیکن اس نے سرکار دو عالم ﷺ کے والا نامہ اور آپ ﷺ کے ایلچی دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کا بڑا اعزاز اور احترام کیا۔ حضور ﷺ کا یہ خط قیصر روم نے سونے کے ایک ڈبہ میں نہایت عزت و احترام سے رکھا اور پھر اس کی نسل میں یہ خط نسلاً بعد نسلٍ چلتا آیا۔ وہ اس خط کی بہت حفاظت کرتے تھے کیونکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک یہ خط ہمارے پاس محفوظ رہے گا ہماری سلطنت باقی رہے گی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری: ۱/۳۴، البدایہ والنہایہ: ۲/۲۶۲۔۲۶۸، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح: ۱/۹۴ وغیرہ)

کسریٰ شاہ ایران کے نام مکتوب گرامی:

ایران (فارس) کی حکومت کی وسعت چھٹی صدی عیسوی کے شروع میں اس قدر زیادہ تھی کہ ایک جانب برصغیر پاک و ہند تک اس کا رقبہ تھا تو دوسری جانب عراق عجم، شام اور روم کے قلب تک اس کی حدود وسیع ہوگئی تھیں اور درفش کاویانی نہ صرف فارس بلکہ روم کے اکثر

علاقوں پر بھی لہرا رہا تھا، لیکن ۶۱۶ء میں یکا یک ہوا نے رخ بدلا اور رومیوں نے زبردست قربانی کے بعد ۶۲۴ء تک اپنے تمام علاقہ جات ایرانیوں سے واپس لے لیے، تاہم حکومت فارس کی شان وشوکت اور اس کی ہیبت اور دبدبہ ایشیا اور یورپ دونوں پر قائم تھا اور ایران کی حکومت ایشیا کی عظیم الشان طاقت سمجھی جاتی تھی اور عرب کے اکثر قطعات بحرین، عمان اور یمن وغیرہ ابھی تک اسی کے زیر نگین تھے اور جس طرح اس حکومت کا اقتدار تھا اسی طرح کج کلاہِ ایران خسرو پرویز کے دور میں شاہِ ایران کے دربار کی شان بھی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ آداب شاہی کے طریق، درباریوں کے درباری لباس، شاہی باڈی گارڈ کی پُر ہیبت سجاوٹ کی مجموعی حیثیت بڑے بڑے جری اور بہادر انسانوں کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا کرتی تھی۔

اسی دور میں یعنی ۶۲۹ء بہ مطابق ۷ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو اس نامہ مبارک کی سفارت کا شرف بخشا جس میں آپؐ نے کسریٰ فارس خسرو پرویز کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپؐ نے سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس نامہ مبارک کو بحرین لے جائیں اور حاکم بحرین کے توسط سے خسرو پرویز تک اس کو پہنچا دیں۔ سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ حسب ہدایت بحرین پہنچے اور حاکم بحرین منذر کے توسط سے کسریٰ ایران کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ خسرو پرویز بڑے جاہ وجلال اور ہیبت ودبدبہ کے ساتھ دربار کر رہا تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے سفیر سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے سرکار دو عالم ﷺ کا نامہ مبارک اس کے سامنے رکھ دیا۔ خسرو پرویز نے ترجمان کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس نے سرکار دو عالم ﷺ کے نامہ مبارک کو پڑھ کر سنایا۔ نامہ مبارک کے الفاظ یہ تھے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِسَ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، فَاِنِّيْ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً لِاُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ اَسْلِمْ تَسْلَمْ ، فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ .))

(زرقانی:۳/ ۳۸۹،طبری:۳/۹۰،ابن اثیر:۲/۸۱،اعجاز القرآن باقلانی:۱۱۳،سیرۃ حلبیہ:۲/ ۲۹۸،صبح الاعشی:۶/ ۳۷۷،طبقات ابن سعد:۳/۲۲۴،البدایہ والنہایہ:۴/ ۲۶۸)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جونہی یہ خط کسریٰ ایران خسرو پرویز کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے غصہ میں آ کر اس خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ خط اس نے تکبر کی وجہ سے پھاڑا کیونکہ اقتدار اور تکبر دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اس نے متکبرانہ لہجہ میں کہا کہ میری رعایا میں سے ایک حقیر غلام اپنا نام مجھ سے پہلے لکھتا ہے اور مجھے اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ ((أیکتب الی ھذا وھو عبدی))''رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی اس حرکت کا پتہ چلا تو آپؐ نے فرمایا:''اس نے میرا خط نہیں پھاڑا بلکہ اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کیا ہے۔ ((مامزق کتابی ولٰکن مزق ملکه))

جونہی خسرو پرویز نے آپ ﷺ کے نامہ مبارک کو طیش اور تکبر سے پھاڑا تو سیدنا عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ اسی وقت دربار سے رخصت ہو کر مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر تمام واقعہ آپ ﷺ کے گوش گزار کر دیا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح اس نے میرے خط کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے حق تعالیٰ شانہ جلد ہی اسی طرح اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ بخاری میں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((بعث بکتابه الی کسری ، فلما قرا کسریٰ مزقه ، فدعا علیهم رسول الله ﷺ ان یمزقوا کل ممزق .))

''رسول اللہ ﷺ کسریٰ کے پاس نامہ مبارک ارسال فرمایا۔ کسریٰ نے اس کو پڑھا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان کے لیے بددعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں کے اقتدار کو بھی اسی طرح پراگندہ کر دیا۔''

سہیلی نے ''روض الانف'' میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جب سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ پایہ تخت ایران (مدائن) میں داخل ہوئے اور کسریٰ ایران کے دربار میں پہنچے اور

کسریٰ نے نامہ مبارک کے شروع کے الفاظ پر ناراضگی کا اظہار کیا تو سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اہل دربار کے سامنے تقریر کی کہ:

''اے اہل فارس! عرصۂ دراز سے تمھاری زندگی ایسی جہالت کے اندھیروں میں گزری ہے کہ تمھارے پاس کوئی الہامی کتاب ہے اور نہ کوئی نبی تم میں مبعوث ہوا۔ جس حکومت پر تم کو ناز اور فخر وغرور ہے وہ اللہ تعالیٰ کی زمین کا ایک مختصر حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس زمین میں اس سے کہیں بڑی بڑی حکومتیں ہیں اور رہ چکی ہیں اور اے بادشاہ! تجھ سے پہلے بہت سے بادشاہ ہوگزرے ہیں، ان میں سے جس نے آخرت کو منتہائے مقصود سمجھا وہ دنیا سے اپنا حصہ لے کر بامراد گیا اور جس نے دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا اس نے آخرت کے حصہ کو ضائع کر دیا، حصول دنیا کی سعی میں ہر شخص سرگرداں اور مختلف الخیال ہے لیکن آخرت کا انصاف سب کے لیے یکساں ہے۔ افسوس میں جس پیغام کو تیرے پاس لے کر آیا ہوں تو نے اس کو حقارت ونفرت سے دیکھا حالانکہ تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ پیغام ایسی جگہ سے آیا ہے جس کا خوف تیرے قلب پر ظاہر ہے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ حق کی یہ آواز تیری تحقیر سے دب نہیں سکتی اور تیرا جھٹلانا تجھ کو اس اعلان حق کی زد سے نکال نہیں سکتا اور ''واقعہ ذی قار'' اس کی ایک واضح شہادت ہے۔''

خسرو پرویز یوں تو پہلے ہی سے غضبناک ہورہا تھا سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کی اس بے باکانہ اور دلیرانہ تقریر کو سن کر آپے سے باہر ہوگیا اور غصہ میں آ کر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا اور سیدنا عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: ''چہ خوش، مجھ کو عرب پر غالب آنے میں ادنیٰ سا بھی خطرہ نہیں، میں بلاشرکت غیرے اس پر قابض ہوسکتا ہوں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ فرعون کس طرح بنی اسرائیل کا مالک بنا۔ تم بنی اسرائیل سے بہتر نہیں ہو اور میں فرعون سے بہتر ہوں۔ پھر میرے تم پر غالب آنے اور تم کو غلام بنا لینے میں کیا چیز مانع ہے۔ رہا میری حکومت کا معاملہ، سو یہ میں جانتا ہی ہوں کہ اس پر کتوں کی طرح تمھارے دانت ہیں اور تم چاہتے ہو

کہ اس سے اپنا پیٹ بھرو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور ذی قار کا واقعہ شام کا واقعہ ہے۔ یہ ایران ہے شام نہیں ہے۔

خسرو پرویز کا غصہ اب بھی فرو نہ ہوا اور اس نے صوبہ یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ سرزمین عرب میں ایک شخص مدعی نبوت ہے۔ تم فوری طور پر دو آدمیوں کو حجاز روانہ کرو تا کہ وہ اس سے بازپرس کریں کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسی گستاخی کیوں اور کس لیے کی؟ بعض روایات میں ہے کہ اس نے باذان کو لکھا کہ دو مضبوط، قوی اور توانا آدمی بھیجو تا کہ وہ مدعی نبوت کو گرفتار کر کے میرے حضور پیش کریں۔ باذان نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے میر منشی بابویہ اور خرخسرہ کو اس سفارت پر حجاز روانہ کر دیا۔ جب یہ دونوں طائف پہنچے تو قریش کے چند اشخاص سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود ہے۔ طائف کے قریش نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کس لیے اس مدعی نبوت کو دریافت کرتے ہیں؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم اس مدعی نبوت سے اس کی اس جرأت کا کہ اس نے فارس کے شہنشاہ کے دربار میں گستاخانہ خط لکھا ہے جواب طلب کرنے جا رہے ہیں۔ قریشیوں نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ فارس کا شہنشاہ اس کے درپے آزار ہے۔ اب ہم کو اس سے جنگ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

سرکار دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں رونق افروز تھے کہ بابویہ اور خرخسرہ مدینہ طیبہ پہنچے اور سرکار دو عالم ﷺ کے سادہ مگر پرعظمت دربار میں حاضر ہوئے۔ آپؐ کی بارگاہ کا جو اثر ان دونوں پر پڑا وہ دنیا کے پرہیبت درباروں سے بھی زیادہ متاثر کن تھا۔

بابویہ نے باذان کا خط پیش کیا۔ آپؐ نے خط کا مضمون معلوم کر کے ارشاد فرمایا کہ ابھی تم یہاں قیام کرو، سوچ کر اس خط کا جواب دیا جائے گا۔ ان دونوں نے پندرہ روز آپؐ کے ہاں قیام کیا۔ بعض ارباب سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں سفارت کاروں کو دیکھ کر طبع مبارک مکدر ہوگئی۔ بابویہ اور اس کا ساتھی ایرانی رسم ورواج اور وہاں کے دستور کے مطابق داڑھی

منڈائے اور مونچھوں کو متکبرانہ انداز میں بل دیئے ہوئے تھے۔ آپؐ نے ان دونوں کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ متکبرانہ انداز کی تعلیم تم نے کہاں سے حاصل کی؟ بابویہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! ہمارے بادشاہ کا یہی طرز ہے اور ہم سب اسی کو محبوب رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے مالک (اللہ) نے تو ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ باوقار زندگی اختیار کریں، داڑھی بڑھائیں اور مونچھیں ترشوائیں، مغرور شخص اللہ کو پسند نہیں۔

پندرہ روز کے بعد آپؐ نے ان دونوں کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ جس دنیوی جاہ و جلال کے دربار سے تم میرے پاس آئے ہو، قسمت نے اس کا پانسہ پلٹ دیا اور تمھارے بادشاہ ''خسرو پرویز'' کو خود اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ یہ ۱۰ جمادی اولالیٰ ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ جاؤ تم کو اس بارے میں جلدی معلوم ہو جائے گا۔ بابویہ نے جب یہ سنا تو کہنے لگا کہ آپؐ کہیں ہمیں دھوکا تو نہیں دے رہے؟ اگر ایسا ہے تو یاد رکھیں کہ ہمارا بادشاہ بڑی شان وشوکت کا مالک ہے۔ آپؐ اس طرح اس کی قلمرو سے جان بچا کر نہیں بھاگ سکتے۔ سرکار دوعالم ﷺ نے زیرلب تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''نہیں، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب صحیح ہے، تم کو خود اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ جب تم یہ جانتے ہو کہ میں اس کی قلمرو سے بھاگ نہیں سکتا تو پھر تم کو کیا خوف؟''

جب ان دونوں سفارت کاروں نے سرور دو عالم ﷺ کی اس بات کے بارے میں تکذیب کی اور انھوں نے کہا: ''کیا آپؐ کی یہ بات ہم اپنے بادشاہ کو لکھ دیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، لکھ دو اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ میرا دین اور میری حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جہاں تک کسریٰ پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے اس جگہ جا کر رکے گی کہ جہاں سے آگے اونٹ اور گھوڑے کے قدم جا ہی نہیں سکتے۔'' آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ ''اپنے بادشاہ کو یہ بھی لکھ دینا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو جو کچھ تمھارے زیر اقتدار اور زیرِ حکومت ہے، وہ سب میں تمھیں دے دوں گا۔''

غرض کہ جب نبی اکرم ﷺ نے باذان کے سفیروں کو واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تو خرخسرہ کو ایک سنہری پارچہ (پٹکا) مرحمت فرمایا۔ یہ پٹکا سلطان مصر مقوقس نے

آپ ؐ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر بھیجا تھا اور بابویہ کو بھی اسی طرح کچھ عنایت فرما کر سفارت کاروں کو عزت واحترام کے ساتھ واپس فرمایا۔

یمن عرب کے سرسبز وشاداب صوبوں میں سے ایک صوبہ ہے۔ یمن کے معنی عربی میں ''بابرکت'' کے ہیں۔ اس علاقہ کی سرسبزی اور شادابی کی وجہ سے اہل عرب اس کو یمن کہتے ہیں۔ یہاں عمالقہ، اہل معین، عاد اور حمیر کی مشہور سلطنتیں قائم رہ چکی ہیں، اور وقتاً فوقتاً روم، فارس اور حبشہ کی حکومتیں اس پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ یمن کی حدود یہ ہیں: مشرق میں عمان وبحرین، مغرب میں بحر احمر، شمال میں حجاز، نجد اور یمامہ اور جنوب میں بحر عرب۔ قدیم زمانہ میں ہندوستان، فارس، مصر اور عراق کی باہم تجارت اہل یمن ہی کے توسط ہی سے ہوا کرتی تھی۔ عروج اسلام سے پہلے اہل حبشہ کو شکست دے کر فارس نے اس پر قبضہ کر لیا اور ۷ ہجری میں جب کہ خسرو پرویز کو اسلام کا پیغام بھیجا گیا۔ اہل فارس ہی اس پر قابض تھے اور یہ فارس کا ایک صوبہ تھا اور باذان اس کا حکمران تھا۔ باذان کے پاس جب بابویہ اور خرخسرہ پہنچے تو انھوں نے بارگاہ نبوت کے تمام حالات جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، بیان کیے اور جو پیش گوئی اور جواب سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، وہ بھی باذان سے بیان کیا، باذان نے جب نبوت کا پیغام سنا تو وہ کہنے لگا کہ جو کچھ تم لوگوں نے بیان کیا ہے اور جو پیغام تم لے کر آئے ہو اگر یہ سب صحیح اور درست ہے تو وہ شخص یقیناً خدا کا رسول اور نبی ہے۔

ادھر باذان کے یہ دونوں سفارت کار بارگاہ رسالت سے پیغام لے کر واپس آئے اور دوسری طرف شیرویہ کا پیغام باذان کے پاس پہنچا کہ خسرو پرویز کو قتل کر دیا گیا ہے اور رعایا کو اس کے ظلم و جور اور تعدی سے نجات مل گئی ہے اور اب میں تخت شاہی پر بیٹھا ہوں۔ تم کو اسی طرح حکومت کا وفادار رہنا چاہیے جیسا کہ اب تک تم رہے ہو اور عرب کے جس شخص کے بارے میں خسرو پرویز نے باز پرس کا حکم دیا تھا، اب اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ باذان ان تمام حالات وواقعات کو دیکھنے اور سننے کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت کا قائل ہو گیا، لہٰذا ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ باقی اہل یمن

۱۰ ہجری میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زرقانی ۳/۳۴۲، البدایۃ والنہایۃ ۴/ ۲۶۸، ۲۷۲، محاضرات خضری ۱/ ۱۴۷، فتح الباری ۸/ ۱۲۷، طبری ۳/ ۹۰)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیرویہ اپنے باپ خسرو پرویز کی بیوی شیریں پر عاشق تھا، لیکن شیریں کسی طرح شیرویہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتی تھی۔ شیرویہ نے یہ سمجھا کہ شاید خسرو کے قتل کر دینے کے بعد یہ مسئلہ حل ہو جائے، اس لیے اس نے اس کو قتل کر دیا۔ شیریں کو جب خسرو کے قتل کا حال معلوم ہوا تو اس نے زہر کھا کر اپنا کام تمام کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد شیرویہ ایک روز شاہی دواخانہ پہنچا اور کسی زہریلی دوا کو انوشدارو سمجھ کر کھا گیا۔ ہر چند علاج معالجہ ہوا لیکن شیرویہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد خسرو کی بیٹی بُوران تخت نشین ہوئی مگر وہ بھی کچھ زیادہ مدت تک حکومت نہ کر سکی۔ غرض خسرو پرویز کے بعد تخت فارس پر کسی حکمران کو اطمینان سے حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اور حکومت فارس کے اقتدار کا آفتاب گہن میں آ گیا۔ آخر ۱۴ ہجری میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں لشکر اسلام فارس میں داخل ہوا اور اس کے اقتدار کو جو کہ ''یزدگرد'' کے نام سے آخری سانس لے رہا تھا، ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور ''درفشِ کاویانی'' کی جگہ تمام قلمرو میں ''پرچم اسلامی'' لہرانے لگا اور اس طرح سرکار دو عالم ﷺ کی بشارت حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

((اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده، اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده، والذي نفسي بيده لتنفقن كنوزهما في سبيل الله))

نامۂ مبارک بنام عزیز مصر مقوقس:

مصر براعظم افریقہ کے شمالی حصہ کا وہ زرخیز ملک ہے جس کی زرخیزی اور اقتدار کے غرور میں فرعون نے خدا اور رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل یہ روم کی سلطنت کے ماتحت سمجھا جاتا تھا اور وہاں کے حکمران اور فرمانروا رومی حکومت کے باج گزار تھے۔ مصر کا حدود اربعہ یہ ہے: شمال میں بحر روم، جنوب میں سوڈان، مشرق میں بحر قلزم اور مغرب میں ریگستان صحارئی۔

مصر میں سب سے پہلی آباد قوم مصر بن حام بن نوح علیہ السلام تھی اور یہی لوگ یہاں برسر

حکومت تھے، لیکن زمانہ کی تاریخِ عروج وزوال نے یہاں بھی اپنا اثر دکھایا اور حام بن نوح علیہ السلام کی نسل میں سے عملیق بن لاذ کی اولاد نے عروج حاصل کیا۔ عملیق کی اولاد ہی کو عمالقہ کہا جاتا ہے۔ عمالقہ جسمانی لحاظ سے بھی بہادر اور قوی الجثہ تھے اور شام اور اطراف شام اور عرب وعجم کے بعض حصوں یعنی عراق اور اطراف عراق پر نہایت شان وشوکت اور سطوت وعظمت کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔ عمالقہ نے ولید بن دوسوز کی زیر قیادت مصر پر چڑھائی کی۔ ولید نہایت ذہین اور صاحب فراست شخص تھا۔ مصر کو فتح کرنے کے بعد یہی عمالقہ فراعنۂ مصر کہلائے۔ قرآن حکیم نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں عزیز مصر کا ذکر کیا ہے، وہ اسی فرعون اکبر ولید کا بیٹا ''ریان'' تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جس فرعون کا ذکر آتا ہے اس کا نام ولید بن معصب بتایا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون عمالقہ میں سے تھا یا مصر کی قدیم قوم قبط میں سے؟ اس میں اختلاف ہے۔ البتہ یوسف علیہ السلام کے دور کا فرعون عمالقہ میں سے تھا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دور کا فرعون قبطی تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وصیت فرمائی تھی کہ ''جب تم مصر فتح کرلو تو اہل قبط سے اچھا سلوک کرنا اس لیے کہ ہمارا (اہل عرب) کا ان کے ساتھ ننھیالی رشتہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہ قبطی شہزادی تھیں۔ (معجم البلدان)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہمایوں میں مصر میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک رومی جو مصر کو نوآبادی سمجھ کر آباد ہوئے تھے۔ یہ تجارت اور زمینداری بھی کرتے تھے اور سرکاری عہدوں پر بھی مامور تھے اور فوج کا ایک بڑا حصہ بھی انھی پر مشتمل تھا۔ قبطی جو مصر کے اصل باشندے تھے اور فراعنہ کے عہد حکومت میں صدیوں تک پیغمبروں کی اولاد (بنی اسرائیل) کو غلام بنائے رہے اور اس وقت بھی قیصر روم کی زیر سیادت حکمران اور فرمانروا سمجھے جاتے تھے، ان کا بادشاہ مقوقس بھی قبطی تھا، یہ اگرچہ قبطی النسل تھا لیکن رومۃ الکبریٰ کے سلاطین کی عیسائیت کا اثر چونکہ مصر میں بھی سرایت کر گیا تھا، اس وجہ سے مقوقس عیسائی تھا اور اپنے مذہب کا ایک بہت بڑا عالم تھا اس زمانہ میں مصر کا دارالحکومت اسکندریہ تھا۔

شاہ مصر مقوقس بھی ان چھ فرمانرواؤں میں سے تھا جن کو ۷ ہجری میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

خطوط کے ذریعے دعوت اسلام دی۔ مصر کی سفارت کا شرف سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بخشا گیا۔ حاطب بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ سیرۃ حلبیہ میں سیدنا حاطب کی اس سفارت کاری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدۂ حدیبیہ سے فراغت کے بعد ایک روز ارشاد فرمایا: کہ لوگو! تم میں سے کون ہے جو میرا مکتوب مصر کے بادشاہ تک پہنچا دے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم حاصل کرے؟ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ لسان نبوت سے یہ بشارت سن کر فوراً آگے بڑھے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خدا تم کو برکت عطا فرمائے۔''

غرض کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر ایک طویل مسافت طے کر کے اسکندریہ پہنچے اور یہاں انھوں نے بادشاہ کے کسی مقرب کی تلاش شروع کر دی جو ان کو بادشاہ تک پہنچا دے۔ آخر مقوقس کے ہاں ایک حاجب خاص کے ذریعے رسائی ہوئی۔

علامہ سیوطی نے اپنی کتاب ''حسن المحاضرہ'' (تاریخ مصر) میں لکھا ہے کہ جب حاطب رضی اللہ عنہ اسکندریہ پہنچے تو مقوقس دریائے نیل میں کشتی پر سوار سیر میں مشغول تھا۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے دعوت اسلام کے کام میں تاخیر مناسب نہ سمجھی اور ایک کشتی کرایہ پر لے کر مقوقس کے پاس پہنچے اور انھیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا۔ حاطب رضی اللہ عنہ سے مقوقس نے ایک دلچسپ سوال کیا کہ ''اگر آپؐ کا نبی سچا ہے تو اس نے اپنے اللہ سے ان لوگوں کے بارے بددعا کیوں نہیں کی جنھوں نے اس کو مکہ سے نکال دیا تھا؟ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ نے اس کا مسکت جواب یہ دیا ہے کہ جب یہودیوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر ہلاک کر دیا تھا تو انھوں نے ان یہودیوں کی ہلاکت کی دعا کیوں نہیں کی؟ مقوقس اس جواب سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ تو خود بھی دانا ہے اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانا اور حکیم ہے۔ اب ترجمان کو بلایا گیا اور اس سے نامہ مبارک کو پڑھنے کے لیے کہا گیا، جو یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِلَى الْمَقَوْقَسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ إِثْمُ الْقِبْطِ وَ ﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران ۳:۶۴)

مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى صَاحِبِ مِصْرَ ، اَمَّابَعْدُ: فَاِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنِیْ رَسُوْلًا وَاَنْزَلَ عَلَیَّ قُرْآنًا وَاَمَرَنِیْ بِالْاِعْذَارِ وَالْاِنْذَارِ وَمُقَالَةِ الْكُفَّارِ حَتّٰى يَدِيْنُوْا بِدِيْنِيْ وَيَدْخُلَ النَّاسُ فِيْ مِلَّتِيْ ، وَقَدْ دَعَوْتُكَ اِلَى الْاِقْرَارِ بِوَحْدَانِيَّتِهٖ فَاِنْ فَعَلْتَ سَعِدْتَّ وَاِنْ اَبَيْتَ شَقَيْتَ وَالسَّلَامُ))

''اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط ہے محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے قبطیوں کے بادشاہ مقوقس عظیم قبط کے نام۔ سلام ہو اُن پر جو راہ حق یعنی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لے سالم ومحفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تمھیں دگنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اسلام قبول نہ کیا تو قبطیوں کی گمراہی کا وبال بھی تجھی پر ہوگا اور اے اہل کتاب! آ ؤ اس کلمہ کی جانب جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا اور کسی کی پرستش اور عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ آپس میں ہم ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب تسلیم کریں۔ اور اگر تم اس سے اعراض کا روّیہ اختیار کرو گے تو گواہ رہنا کہ ہم مسلم یعنی ماننے والے ہیں۔'' (سہیلی الروض الانف: ۲/۳۵۲، سیرۃ حلبیہ: ۲/۲۷۱، الزرقانی: ۳/۳۹۷، حسن المحاضرۃ: ۱/۴۲، المقریزی: ۱/۲۹، صبح الأعشی: ۶/۳۷۸، ۴۶۷، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/۳۸)

صبح الاعشیٰ کے مصنف نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا مقوقس کے نام یہ خط سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قلم سے لکھا گیا تھا اور اس میں آپؐ نے لکھا تھا کہ:

''محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے یہ خط صاحب مصر (مقوقس) کے نام۔ تمھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر قرآن حکیم نازل کیا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں حجت پوری کر دوں اور لوگوں کو متنبہ کر دوں اور کافروں سے جہاد کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ میرا دین قبول کر لیں اور میرے دین میں لوگ شامل ہو جائیں۔ میں نے تمھیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی دعوت دی ہے۔ پس اگر تم نے یہ بات قبول اور تسلیم کر لی تو سعادت مند بن جاؤ گے اور اگر انکار کیا تو شقاوت و بدبختی تمھارا مقدر ہوگی۔''

والسلام!

مقوقس نے جب یہ خط ترجمان سے سنا تو حکم دیا کہ اس خط کو ہاتھی دانت کی دو تختیوں کے درمیان رکھ کر سرکاری خزانہ میں محفوظ و مصئون رکھو اور سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم چند روز ابھی یہاں آرام کرو، بعد میں اس خط کا جواب دیا جائے گا، چنانچہ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ چند روز شاہی مہمان بن کر نہایت اعزاز واحترام کے ساتھ مصر میں مقیم رہے۔ چند روز کے بعد مقوقس نے ان کو دربار میں بلایا اور آپ ﷺ کے نامہ مبارک کا جواب لکھوا کر ان کے سپرد کیا۔ اس خط میں شاہ مصر مقوقس نے لکھا:

''یہ خط محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے نام ہے قبطیوں کے بادشاہ مقوقس کی طرف سے ہے۔ بعد حمد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس میں جو کچھ آپ ﷺ نے تحریر فرمایا ہے اور جس شئے کی طرف آپؐ نے دعوت دی ہے، اس کو میں نے بخوبی سمجھ لیا۔ بے شک میں یہ جانتا ہوں کہ ایک نبی ابھی آنے باقی ہیں، لیکن میرا خیال یہ تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوں گے۔ میں نے آپؐ کے قاصد اور پیامبر کی بے حد خاطر و مدارات کی ہے اور آپؐ کی خدمت میں دو لڑکیاں روانہ کرتا ہوں۔ قبطیوں میں ان کی بہت زیادہ عزت ہے اور آپؐ کے لیے کپڑا اور

سواری کے لیے خچر بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر سلامتی نازل فرمائے۔“

سیرۃ کی بعض کتابوں میں ہے کہ مقوقس نے آپ ؐ کی خدمت میں تین لڑکیاں قیصر، سیرین اور ماریہ اور ایک غلام مابور، ایک خچر، ایک گھوڑا اور ایک گدھا، ہزار مثقال سونا اور بیس (۲۰) قیمتی پارچات بھیجے۔ جس میں سے قیصر ابوجہم عبدی رضی اللہ عنہ کو اور سیرین سیدنا حسان بن بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائیں لیکن مستند اور بیشتر روایات میں دو لڑکیوں ہی کا ذکر ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زاد المعاد، سیرۃ حلبیہ وغیرہ)

سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ دونوں کنیزوں ماریہ اور سیرین اور خچر دلدل اور پارچات کو لے کر بصد اعزاز مصر سے روانہ ہوئے اور عزیز مصر مقوقس باوجود اس اقرار کے بھی ایمان کی سعادت سے محروم رہا۔ ماریہ اور سیرین دونوں راستہ ہی میں مسلمان ہو چکی تھیں۔ جب حاطب یہ تمام تحائف اور جواب خط لے کر دربار قدسی میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایا کو قبول فرمایا اور مقوقس کا خط سن کر ارشاد فرمایا کہ بدنصیب کو ملکی ہوا و ہوس نے اسلام سے محروم رکھا اور یہ نہ سمجھا کہ سلطنت ناپائیدار شے ہے۔ سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا حرم نبوی میں داخل ہو گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ انھی کے بطن سے تولد ہوئے اور سیرین سیدنا حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کو مرحمت ہوئیں۔ ماریہ اور سیرین دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ مصر میں لکھا ہے کہ جب عزیز مصر مقوقس کے پاس نامہ مبارک پہنچا اور اس کو خط کا مضمون معلوم ہوا تو اس نے نامہ مبارک کو سینے سے لگا لیا، اور کہنے لگا: ”بے شک یہی وقت ہے کہ نبیٔ منتظر ظاہر ہو۔ ہم کو تورات اور انجیل سے ان کی صفات و حالات معلوم ہیں۔ وہ پیغمبر دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع نہ کرے گا۔ وہ صدقہ کا مال نہ کھائے گا اور ہدیہ قبول کرے گا۔ اس کے ہم جلیس مساکین اور غرباء ہوں گے اور مہر نبوت اس کے شانوں کے درمیان ہوگی۔

زوال مصر:

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں دوبارہ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ کو عزیز مصر مقوقس کے پاس مصر بھیجا۔ سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ

اس مرتبہ مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ مصر کے لیے بھیجے گئے تھے کہ رومی سلطنت کا یہ باجگزار ملک بھی شام کے حمص کی طرح اسلامی حکومت کی بالا دستی اور اقتدار کو قبول کر لے کیونکہ رومیوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے دور ہی سے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی اور دو مرتبہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کو ان کے مقابلہ کے لیے تبوک وغیرہ کا سفر پیش آ چکا تھا، سیدنا حاطب رضی اللہ عنہ مصر کے بعض بلاد شرقیہ سے معاہدہ کر کے واپس آ گئے۔ اس کے بعد عہد فاروقی میں سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر کی فتح میں مشغول ہوئے۔ جب یہ مصر کے مختلف علاقوں کو فتح کرتے ہوئے فسطاط کے میدان میں پہنچے اور وہاں کے مشہور قلعہ کی فصیلوں کے قریب پہنچ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نہایت جانبازی کے ساتھ فصیل پر چڑھ گئے تو عیسائی یہ سمجھے کہ مسلمان لشکر قلعہ کے اندر آ گیا ہے۔ یہ سمجھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے قلعہ کے اندر جا کر دروازہ کھول دیا اور اسلامی لشکر اندر داخل ہو گیا۔ مقوقس نے یہ دیکھ کر صلح کر لی۔ صلح نامہ اگرچہ تمام مصر کے لیے لکھا گیا تھا لیکن قیصر روم کو جب اس بارے میں پتہ چلا تو وہ سخت برہم ہوا اور کہنے لگا کہ اگر قبطی نامرد ہو گئے ہیں تو رومی تو نامرد نہیں ہیں۔ ہم اس صلح کو منظور نہیں کرتے۔ مقوقس نے بادل نخواستہ اس جنگ کو جاری رکھا، لیکن مسلمانوں کے اسکندریہ تک پہنچ جانے پر ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ جزیہ دے کر صلح کرنا چاہتا تھا لیکن قیصر کے خوف سے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ تاہم ایک مدت معینہ تک التواء جنگ کی تحریک کی جس کو سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے منظور نہ کیا۔ مقوقس نے ایک روز تمام شہریوں کو حکم دیا کہ ہتھیار سجا کر شہر کی فصیل کی دیواروں پر اس کی نمائش کریں۔ اس حکم کی تعمیل عورتوں اور بچوں تک نے کی۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہا کہ ہم تمھارا مطلب سمجھ گئے ہیں لیکن مسلمان مجاہدین اس نمائش سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ قیصر کی ٹڈی دل فوج جب ان کے سیلاب کو نہ روک سکی تو تمھاری حیثیت کیا ہے۔ مقوقس نے یہ سن کر کہا کہ عمرو رضی اللہ عنہ سچ کہتے ہیں کہ انھی عربوں نے ہمارے بادشاہ قیصر کو قسطنطنیہ تک پہنچا دیا۔ رومی یہ بات سن کر نہایت غضبناک ہوئے لیکن مقوقس جنگ سے بیزار تھا۔ اس لیے اس نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر معاہدہ کر لیا کہ بوقت کامیابی

مجھ سے اور میری قوم سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ سیدنا عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس کو منظور کر لیا۔ اس پر مقوقس نے اندرونی طور پر مسلمانوں کو کافی امداد پہنچائی۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''سیرۃ عمرؓ بن خطاب۔''

نامہ مبارک بنام حارث بن ابی شمر غسانی شاہ دمشق:

شام ایک نہایت زرخیز ملک ہے۔ اس کے شمال میں ترکی، جنوب میں عرب، مشرق میں عراق اور مغرب میں بحر روم ہے۔ بیت المقدس، فلسطین، بصریٰ اور دمشق اس کے مشہور شہر ہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر میں یہاں عربی نسل کا ایک خاندان سکونت پذیر تھا جس کو آل غسان یا آل جفنہ کہتے تھے۔ اس خاندان کی حکومت شام پر تقریباً پانچ سو سال رہی ہے۔ بصریٰ اس حکومت کا دارالسلطنت تھا لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہمایوں میں اس حکومت کے چند حصے ہو گئے تھے اور ایک حصہ پر غسانی خاندان کے بادشاہ حکمرانی کرتے تھے۔ حاکم بصریٰ، بصریٰ میں، حارث بن ابی شمر دمشق میں اور جبلہ بن ایہم شام کے تیسرے حصے پر حکمران تھا۔

۶۱۶ء سے ۶۲۴ء تک جب کہ رومی حکومت ایرانیوں سے اپنے مقبوضہ مقامات واپس لے رہی تھی غسانیوں میں ایک بہادر، جری اور باہمت بادشاہ حارث بن ابی شمر ہوا ہے جس نے رومی سلطنت کے اقتدار کے لیے بہت بڑی جدوجہد کی۔ اس سے قبل بھی قیصر روم کی حکومت کا اقتدار انھی غسانیوں کا مرہون منت رہا ہے۔ اس وجہ سے رومی حکومت کی زیر سیادت شام کے ملک کی حکم برداری بڑی شان وشوکت کے ساتھ انھی کے ہاتھوں میں تھی۔
جس دور میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو قیصر روم کے پاس روانہ فرمایا تھا اسی دور میں یعنی ۷ ہجری میں سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کو حارث بن ابی شمر کے پاس دعوت اسلام کا مکتوب گرامی دے کر بھیجا۔ حارث کا دارالسلطنت دمشق تھا اور وہ خود دمشق کے مشہور علاقہ ''غوطہ'' میں رہتا تھا۔ سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر روانہ ہوئے تو ان کو راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ حارث اس وقت اگرچہ دمشق میں مقیم ہے لیکن قیصر ایرانیوں سے اپنے مقبوضات واگزار کروانے کے بعد فتح کی خوشی میں حمص سے ہوتا

ہوا بیت المقدس جا رہا ہے اس لیے حارث اس کی رسد وغیرہ کے انتظامات میں مصروف ہے۔

سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ یہ سن کر دمشق پہنچے اور وہاں چند روز مقیم قیام فرمایا تا کہ حارث کو قیصر کے رسد وغیرہ کے انتظامات، سے فرصت ہو تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی اس تک پہنچایا جائے۔ دمشق میں قیام کے دوران سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کی ملاقات حارث کے ایک حاجب سے ہوگئی۔ یہ شخص رومی تھا اور اس کا نام ''مری'' تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے ان سے دمشق آنے کی وجہ پوچھی۔ سیدنا شجاع رضی اللہ عنہ نے اپنے آنے کی غرض وغایت کو تفصیل سے بیان کیا۔ مری نے کہا کہ ابھی چند روز تک اور قیام کرو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ مناسب وقت پر میں آپؓ کو حارث کے سامنے پیش کر دوں گا اور تم اسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچا دینا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ حارث اگر چہ قیصر روم کی زیر سیادت حکمران تھا لیکن عربی نژاد ہونے کے، باعث اور اپنے شکوہ اور دبدبہ کے باعث مستقل فرمانروا تھا۔ اس وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف مستقل خط اور مستقل سفارت روانہ فرمائی۔

شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مری کے ساتھ کثرت ملاقات کے باعث میری بے تکلفی سی ہوگئی تھی، اس لیے اس نے ایک روز مجھ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات اور آپؐ کی دعوت اسلام کی حقیقت تفصیل سے سنی۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی سن کر اس پر ایک رقت سی طاری ہوگئی اور وہ کہنے لگا کہ جو کچھ آپؐ نے بیان کیا ہے آنے والے پیغمبرؐ کے یہی حالات انجیل میں پائے جاتے ہیں۔ تمھارے منہ سے نبی منتظرؐ کے یہ حالات سن کر میں ان پر ایمان لاتا ہوں اور اس کے تمام احکام کی صدق دل سے تصدیق کرتا ہوں: اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده و رسوله، پھر کہنے لگا کہ تم میرے اسلام لانے کا واقعہ کسی شخص سے بیان نہ کرنا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر حارث کو اس بات کا پتہ چل گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے قتل کرا دے حالانکہ وہ میری بہت عزت وتکریم کرتا ہے، اور مجھ کو اس کے مزاج میں بہت دخل ہے لیکن پھر بھی وہ بادشاہ ہے اور بادشاہوں کے مزاج کا کوئی علم نہیں ہوتا کہ کب تبدیل ہو جائے۔ ایک روز حارث نے بہت شان وشکوہ کے ساتھ دمشق میں اپنا دربار کیا۔ اس موقع کو مناسب جان کر اس وقت حاجب مری نے اس

سے میرا تذکرہ کیا۔ حارث نے مجھے دربار میں بلایا اور میں نے اس کو سرکار دو عالم ﷺ کا مکتوب گرامی دیا۔ اس نے اسی وقت ترجمان کو بلایا اور اسے خط پڑھ کر سنانے کا حکم دیا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے اس نامہ مبارک میں لکھا تھا:

نامہ مبارک بنام حارث بن ابی شمر:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى الْحَارِثِ بْنِ اَبِىْ شَمِرٍ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَصَدَّقَ وَاِنِّىْ اَدْعُوْكَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، يَبْقَ لَكَ مُلْكَ .)) (سیرۃ حلبیہ: ۲/ ۳۷۶، زرقانی: ۳/ ۴۰۸، طبری: ۳/ ۸۸)

''شروع اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے یہ خط حارث بن ابی شمر کے نام۔ اس پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے، اللہ پر ایمان لائے اور تصدیق کرے، میں تجھے دعوت دیتا ہوں کہ تو اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لا، تیری حکمرانی باقی رہے گی۔''

جونہی حارث نے سرکار دو عالم ﷺ کا یہ نامہ مبارک سنا تو اسے پھینک دیا اور کہنے لگا: ''کون ہے جو مجھ سے میری حکمرانی چھینے۔ کس کی مجال جو میرے ملک کی طرف نگاہ بھی اٹھائے۔ میں خود اس شخص کا مقابلہ کروں گا۔ اگر یمن میں جا کر چھپا تو اس کو علی الاعلان گرفتار کر کے لاؤں گا۔ اقتدار میں ایسے الفاظ منہ سے اکثر و بیشتر نکل جاتے ہیں کیونکہ اقتدار کا نشہ سہ آتشہ ہوتا ہے۔ حارث نے اسی غیظ وغضب میں کہ گھوڑوں کی نعل بندی کرو اور مجھ سے (سیدنا شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ سے) کہنے لگا کہ جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ تمام قصہ اپنے نبیؐ کو سنا دینا۔ اس نے اسی وقت قیصر روم کو ایک خط لکھا جس میں اس تمام واقعہ کا ذکر کر کے نبی کریم ﷺ سے جنگ کی اجازت طلب کی۔ قیصر کا جواب آیا کہ فی الحال اس ارادہ کو ترک کر دو اور میرے بیت المقدس میں قیام کے انتظامات کی مصروفیت میں مصروف رہو۔ قیصر کا جواب آنے پر حارث نے مجھ کو بلایا اور پوچھا کہ واپسی کا کب تک ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ کل ارادہ ہے۔ حارث نے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کو سو (۱۰۰) مثقال سونا دے کر یہاں سے رخصت

کر دو۔ حارث دربار سے رخصت ہو کر جب اپنی قیام گاہ پر آیا تو اس کے حاجب مری نے اصرار کیا کہ میرے مکان پر چلو۔ میں اس کے ساتھ اس کے مکان پر گیا تو اس نے مجھ کو کچھ پارچات اور زادراہ دیا اور کہنے لگا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا۔ میں اس سے حمص سے رخصت ہو کر مدینہ طیبہ بارگاہ نبوت میں پہنچا اور تمام واقعات سرکار دو عالم ﷺ کے گوش گزار کیے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مری نے جو کچھ کہا سچ کہا اور وہ مومن صادق ہے اور حارث عنقریب دیکھ لے گا کہ جس حکومت اور سلطنت کے غرور پر اس نے اللہ کے دین کو رد کیا ہے، وہ باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ زوال پذیر ہونے والی ہے۔

حارث اگرچہ اس وقت مسلمانوں کے مقابلہ سے وقتی طور پر باز آ گیا لیکن فتح کے بعد ہی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر غسانیوں نے قیصر روم کی سیادت میں مسلمانوں سے جنگ کا ارادہ کیا اور غزوۂ موتہ اور غزوۂ تبوک کے واقعات اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ آخر کار ۱۴ ہجری میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فوجوں نے شام پر پیہم حملہ کر کے چند ہی ماہ میں غسانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ جب کہ حارث ۸ ہجری میں نامراد ہو کر مرا، اور وہ حکومت جس کے غرور پر اس نے وہ کلمات مسلمان سفارت کار کو کہے تھے ۱۴ ہجری میں ختم ہوگئی لیکن ۱۰ ہجری میں غسانی بادشاہ تو نہیں البتہ بہت سے اہل غسان آپ ﷺ کی بارگاہ نبوت حاضر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہوگئے۔

نامہ مبارک بنام منذر بن ساویٰ حاکم بحرین:

موجودہ دور میں جس علاقہ کو بحرین کہتے ہیں سرکار دو عالم ﷺ کے عہد ہمایوں میں صرف اس علاقہ کو بحرین نہیں کہتے تھے۔ اس دور میں بحرین عرب کے پانچ قطعوں میں سے ایک قطعہ تھا۔ اس کے مشہور صوبوں میں سے ایک صوبہ بحرین تھا اور اس کا دوسرا نام ''الاحساء'' تھا۔ بحرین ساحل پر واقع تھا اور اس کا حدود اربعہ کچھ یوں تھا: شمال میں عراق، جنوب میں عمان، مشرق میں خلیج فارس اور مغرب میں یمامہ۔ یہ جگہ موتیوں کی کان تھی جہاں ہزاروں کشتیاں اور غواص موتی نکالتے رہتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں بحرین ایرانی حکومت کے زیر اقتدار تھا اور آل منذر جو حیرہ اور اطراف عراق پر ایرانیوں کی جانب سے

حکمران تھے یہاں تک کے حاکم اور گورنر بھی تھے۔ قرامطہ جو اسلام کے دعویٰ کے باوجود مجوسیت کے اکثر عقائد کو شامل کر کے ملحدانہ عقائد کے پیروکار تھے اور جن کا فتنہ تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ان کی حکومت کا مرکز یہی ''بحرین'' تھا۔

۸ ہجری میں جب سرکار دو عالم ﷺ جعرانہ ❶ سے واپس تشریف لائے تو اس وقت آپؐ نے بحرین کے حاکم کے پاس پیغامِ اسلام بھیجا۔ اس وقت بحرین کا گورنر منذر بن ساویٰ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مبارک سفارت پر سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا اور ان کی معیت کے لیے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بھی انتخاب فرمایا۔ سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نامہ مبارک لے کر بحرین پہنچے اور آپؐ کا نامہ مبارک منذر بن ساویٰ کے حوالہ کیا۔ منذر نے نامہ مبارک کو پڑھنے کے لیے ترجمان کو بلایا اور اس نے وہ نامہ مبارک پڑھ کر سنایا۔ منذر بن ساویٰ آپ ﷺ کے مکتوب گرامی کا مضمون سن کر بے حد خوش ہوا اور آپ ﷺ کے سفارت کار سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو نہایت احترام اور عزت کے ساتھ اپنا مہمان رکھا۔

آپ ﷺ کے مکتوب گرامی کا متن حسب ذیل ہے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى الْمُنْذِرِ بْنِ سَاوىٰ (الْعَبَدِي صَاحِبِ الْبَحْرَيْنِ) سَلِّمْ اَنْتَ، فَاِنِّيْ اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوْ، اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا، فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ،

---

❶ جعرانہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے جہاں سرکار دو عالم ﷺ نے غزوہ حنین اور قیدیوں کو رکھا ہوا تھا اور پھر وہیں سے مال غنیمت کی تقسیم کی۔ مال غنیمت بہت زیادہ تھا لہٰذا آپؐ نے قریشی اور غیر قریشی روساء کو سو سو اونٹ دیے۔ کچھ لوگوں کو پچاس اور کچھ چالیس چالیس اونٹ دیے۔ مکہ وغیرہ کے جو لوگ جدید الاسلام تھے، ان کو تالیف قلب کے لیے کچھ زیادہ مال دیا، اس پر کچھ انصاری نوجوانوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ آپ ﷺ کو پتہ چلا تو آپؐ نے انصار کے لوگوں کو بلا کر فرمایا: ''اے گروہ انصار! کیا یہ تمھیں پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو لے کر گھر لوٹو۔ اے گروہ انصار! اگر ہجرت نہ ہوتی میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ یہ سن کر انصار چیخ اٹھے اور یک زبان ہو کر بولے: ''ہم کو صرف رسول اللہ ﷺ درکار ہیں۔'' (بخاری ۲/ ۲۶۰، عیون الاثر: ۲/۲۶۱)۔

لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهِ، فَمَنْ اَحَبَّ ذٰلِكَ مِنَ الْمَجُوْسِ فَاِنَّهُ آمِنٌ وَمَنْ اَبٰى فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ.

فَأَسْلَمَ الْمُنْذِرُ وَكَتَبَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَقُوْلُ: اَمَّابَعْدُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! فَاِنِّي قَرَأْتُ كِتَابَكَ عَلٰى اَهْلِ الْبَحْرَيْنِ فَمِنْهُمْ مَنْ اَحَبَّ الْاِسْلَامَ وَاَعْجَبَهُ وَدَخَلَ فِيْهِ وَمِنْهُمْ مَنْ كَرِهَهُ، وَبِاَرْضِيْ مَجُوْسٌ وَيَهُوْدُ فَاَحْدِثْ لِيْ فِيْ ذٰلِكَ اَمْرَكَ.))

''شروع کرتا ہوں اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے منذر بن ساویٰ کے نام، تو اسلام قبول کر لے۔ میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اس کے بعد بات یہ ہے کہ جس شخص نے ہماری طرح نماز ادا کی، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلمان ہے، اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کا تحفظ حاصل ہوگیا۔ سو مجوسیوں میں سے جو اس بات کو پسند کرے تو اسے امان حاصل ہے اور جو اسے ناپسند کرے تو اسے جزیہ دینا ہوگا۔

چنانچہ منذر نے اسلام قبول کر لیا اور سرور کائنات ﷺ کو جواب میں لکھا:

''امابعد! اے اللہ کے رسولؐ! میں نے آپؐ کا مکتوب گرامی بحرین کے لوگوں کو پڑھ کر سنا دیا۔ چنانچہ بعض نے تو اسلام کو پسند کر لیا اور مسلمان ہو گئے اور بعض نے اسے پسند نہیں کیا۔ میرے علاقہ میں یہودی اور مجوسی بھی ہیں لہٰذا آپؐ تحریر فرمائیں کہ ان کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کریں۔'' (زرقانی: ۳/۳۰۲، الاصابہ: ۶/۱۵۹، اسد الغابۃ، ۴/۴۱۷، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/۴۱، سیرۃ حلبیہ: ۲/۲۷۴، کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۱۵۶، فتوح البلدان: ص ۸۸ وغیرہ)

اس خط کی برکت سے منذر بن ساویٰ اور اس کی قوم کا بیشتر حصہ مسلمان ہوگیا اور وہ سرکار دو عالم ﷺ کے دین اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ دوسی رضی اللہ عنہ منذر کا خط لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور وہ خط پیش کیا۔ آپؐ

نے اس کو برکت کی دعا دی اور اس کو اس کے خط کے جواب میں پھر یہ خط لکھا:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى الْمُنْذِرِ بْنِ سَاوىٰ سَلَامٌ عَلَيْكَ فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ، اَمَّابَعْدُ: فَاِنِّیْ اُذَكِّرُكَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ ، فَاِنَّهٗ مَنْ يَنْصَحُ فَاِنَّمَا يَنْصَحُ لِنَفْسِهٖ ، وَاِنَّهٗ مَنْ يُطِيْعُ رُسُلِیْ وَيَتَّبِعُ اَمْرَهُمْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ ، وَمَنْ نَّصَحَ لَهُمْ فَقَدْ نَصَحَ لِیْ ، وَاِنَّ رُسُلِیْ قَدْ اَثْنَوْا عَلَيْكَ خَيْرًا ، وَاِنِّیْ قَدْ شَفَعْتُكَ فِیْ قَوْمِكَ فَاتْرُكْ لِلْمُسْلِمِيْنَ مَا اَسْلَمُوْا عَلَيْهِ وَعَفَوْتُ عَنْ اَهْلِ الذُّنُوْبِ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ ، وَاِنَّكَ مَهْمَا تُصْلِحْ فَلَنْ نَعْزِلَكَ عَنْ عَمَلِكَ وَمَنْ اَقَامَ عَلٰی يَهُوْدِيَّتِهٖ اَوْ مَجُوْسِيَّتِهٖ فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ .))

’’شروع اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔ یہ خط محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے منذر بن ساویٰ کے نام ہے۔ تجھ پر سلام ہو۔ سو میں تیرے سامنے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود اور الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں، بعدازیں میں تجھے اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں۔ پس جو خیر خواہی کرے گا تو وہ اپنے لیے خیر خواہی کرے گا۔ جس نے میرے قاصدوں کی اطاعت کی اور ان کے احکام کی پیروی کی تو اس نے گویا میری اطاعت کی۔ جس نے ان کی خیر خواہی کی اس نے میری بھلائی چاہی۔ میرے قاصدوں نے تمھارا نہایت اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ میں نے تجھے تمھاری قوم کا شفیع بنا دیا ہے۔ جو لوگ مسلمان ہوگئے ہیں ان کی اِملاک ان کے پاس رہنے دو۔ میں نے خطا کاروں کو معاف کر دیا ہے، اس لیے ان کی معذرت قبول کر لو۔ جب تک تو اصلاح پر عمل پیرا رہے گا ہم تجھے معزول نہیں کریں گے۔ جو یہودیت اور مجوسیت پر قائم رہنا چاہے اس پر جزیہ ہے۔ ابن

سعد اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہ نے لکھا ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: ''بعد حمد وصلوٰۃ میرے قاصدوں نے تمھارے طرز عمل اور وطیرہ کی بہت تعریف کی جس طریقہ کو تم پسند کرو مجھ کو وہی طریقہ پسند ہے اور میں تم کو تمھاری حکومت پر اسی طرح قائم رکھتا ہوں اور تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا خیر خواہ رہ۔'' والسلام!

اس کے علاوہ ایک نامۂ مبارک اور بھی آپ ؐ نے منذر بن ساویٰ نام بھیجا تھا جس میں جزیہ وصدقات کی طلبی کا ذکر تھا۔ اس نامہ کو بھی سیدنا علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے۔ اس کا مضمون کچھ اس طرح ہے:

((امـا بـعـد انـى قد بعثت اليك قدامة واباهريرة فارفع اليهما اجتمع عندك من جزية ارضك ، والسلام .))

''بعد حمد وصلوٰۃ! میں تمھارے پاس قدامہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کو بھیجتا ہوں۔ جو جزیہ تم کو وصول ہو چکا ہو ان کے حوالہ کر دو۔'' والسلام!

چونکہ سیدنا علاء حضرمی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے نامہ مبارک کی سفارت کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کے تحصیل دار بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔ اس وجہ سے وہ منذر ہی کے پاس مقیم تھے۔ وصول یابی کے دور میں سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا قدامہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور ایک خط منذر اور ایک خط علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کے نام تحریر فرمایا۔ سیدنا علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کے خط میں بھی زکوٰۃ، صدقات اور جزیہ کے جلد بھیجنے کے متعلق احکام تھے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ان ہرسہ نامہائے مبارک کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا تھا۔ (طبقات ابن سعد)

رسول اللہ ﷺ نے منذر کے خط کا جو جواب دیا تھا اس کو حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاذ'' میں جلد دوم صفحہ ۶۱ پر نقل کیا ہے اور زرقانی نے بھی اپنی کتاب ۳/۳۵۱ پر وہی خط نقل فرمایا ہے۔ یہ خط ماضی قریب میں دستیاب ہوا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم (فرانس) نے اس کا فوٹو شائع کیا۔

امام سہیلی رحمہ اللہ نے منذر کا جو جواب نقل کیا ہے وہ یہ ہے:

''میں جس دین پر ہوں میں نے اس میں بہت غور وخوض کیا تو اس کو صرف دنیا

کے لیے پایا نہ کہ آخرت کے لیے اور جب آپ ﷺ کے پیش کردہ دین پر غور وخوض کیا تو اسے دین ودنیا دونوں کے لیے مفید پایا لہٰذا اس دین کو قبول کرنے میں مجھے کیا چیز مانع ہے کہ جس کے قبول کرنے میں زندگی کی تمنائیں اور امنگیں اور موت کی راحت اور سکون ہو؟ اب تک میں اس شخص کی حالت پر نہایت تعجب کرتا تھا جو اس دین اسلام کو قبول کرے لیکن اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو اس دین برحق کو رد کرتا ہے۔"

(روض الانف: ۲/ ۳۵۶، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح: ۱/ ۱۱۳)

نامۂ مبارک بنام جبلہ بن ایہم غسانی حاکم شام:

گزشتہ سطور میں غسان قبیلہ کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ غسانی حکومت کا ایک بادشاہ جبلہ بن ایہم بھی ہوا ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں ایک روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جبلہ بن ایہم کے نام بھی ۷ ہجری میں اسلام کا پیغام بھیجا۔ جبلہ بن ایہم برضا ورغبت حلقۂ اسلام میں داخل ہوگیا اور اپنے قبول اسلام کی اطلاع بارگاہ رسالت پناہ میں بھیجی اور کچھ ہدایا اور تحائف بھی آپؐ کی خدمت میں بھیجے۔ اصحاب سیر کا خیال ہے کہ اس سفارت کی خدمت بھی سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی تھی۔ جبلہ برابر مسلمان رہا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وہ اتفاقاً دمشق کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ دفعتاً اس کا پاؤں ایک مزنی شخص کے اوپر جا پڑا۔ مزنی نے اسے ایک طمانچہ مار دیا۔ معاملہ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے حضور جا پہنچا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قصاص لیا جائے اور جبلہ بھی مزنی شخص کے تھپڑ مارے۔ جبلہ کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا اور کہنے لگا کہ اس کو قتل کیا جائے گا۔ سیدہ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں۔" جبلہ نے کہا: "اچھا اس کا وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے جس سے اس نے تھپڑ مارا ہے۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ جبلہ نے کہا کہ ایک معمولی آدمی اور بادشاہ کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلامی احکام میں بادشاہ وفقیر دونوں برابر ہیں۔ جو جرم اس نے کیا ہے تم صرف اسی جرم کی مقدار پر سزا دے سکتے ہو۔ جبلہ اس وقت تو خاموش رہا اور پوشیدہ طور پر بھاگ کر روم چلا

گیا اور وہاں جا کر نصرانی ہو گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ پتہ چلا تو کہ آپ کو اس کی اس حرکت پر بے حد افسوس ہوا۔ اور سیرۃ حلبیہ میں ہے کہ جب سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ جبلہ بن ایہم کے دربار میں پہنچے تو اس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا اور ایک تقریر بھی فرمائی جو بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''اے بادشاہ! تیری قوم (انصار) ❶ نے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اصلی وطن (مکہ) سے بلا کر اپنے وطن (مدینہ طیبہ) میں نہایت عزت واحترام کے ساتھ پناہ دی اور ان کی ہر طرح حمایت کی۔ بادشاہ! یہ نصرانی مذہب تیرے آباء واجداد کا مذہب نہیں ہے۔ شام کی حکومت اور رومیوں کی قربت نے تجھ کو عیسائی مذہب کی طرف مائل کر دیا ہے۔ یہی حکومت اگر تجھ کو کسریٰ کے زیر اثر مل جاتی تو تجھ کو پارسی مذہب کی طرف مائل کر دیتی۔ اگر تو حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائے تو یہی ملک شام بلا شرکت غیرے تیرا ہے اور شامی رعایا تیری ہیبت سے مطیع اور رومی تیرے دبدبہ سے مرعوب ہو جائیں گے۔''

''اے بادشاہ! اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تیرے اسلام قبول کرنے سے یہ ملک تیرے قبضۂ اقتدار سے نکل جائے گا تب بھی اس کے عوض اسلام کی دولت نہایت بیش قیمت ہے، یہ آخرت کا بہترین تحفہ ہے۔'' اور دنیا میں بھی کلیسا کے مقابلہ میں مساجد، ناقوس کے مقابلہ میں اذان اور شعانین کے عوض جمعہ اور عیدین جیسی بابرکت چیزیں تجھ کو نصیب ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا جو اجر ہے وہ تو بے نہایت ہے۔''

جبلہ نے نہایت غور وفکر سے سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کی اس متاثر کن تقریر کو سنا اور پھر اس نے اس کے جواب میں کہا:

''بخدا! میرا دل اس بات کا بے حد متمنی ہے کہ عرب کے اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی

❶ (سیدنا شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ نے انصار کو جبلہ کی قوم اس لیے کہا کہ غسانی خاندان عرب ہی کی شاخ تھا اور انصار مدینہ سے ان کا نسبی تعلق تھا۔)

نبوت کو سب لوگ اس طرح تسلیم کرلیں جس طرح کہ "رب السماوات والارض" کی الوہیت پر سب متفق ہیں۔ مجھے یہ سن کر بے حد مسرت اور خوشی ہوئی کہ میری قوم انصار نے ان کو بخوشی اور برضا ورغبت نبی تسلیم کرلیا۔ مجھ کو قیصر روم نے جنگ موتہ میں شرکت کی دعوت دی تھی لیکن میں نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ میں حق و باطل کی اس دعوت کے متعلق ابھی کوئی آخری فیصلہ نہیں کرسکا۔ ابھی مجھ کو مزید غور وفکر کی ضرورت ہے۔"

تمام ارباب سیر نے ان دونوں روایات سے مختلف اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے جب جبلہ بن ایہم غسانی کے پاس شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر بھیجا تو وہ بھی حارث بن ابی شمر کی طرح بہت ناراض ہوا اور رومیوں کے ساتھ مل کر آمادۂ جنگ ہوا۔ غزوۂ موتہ اور غزوۂ تبوک میں معاملہ چونکہ غیر منفصل رہا، اس لیے خلافت فاروقی میں شام پر پیہم حملے ہوئے اور تمام علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ اس وقت اس نے ہرقل اعظم اور کسریٰ کا انجام دیکھا کہ اتنی بڑی سلطنت کے حاکم ہونے کے باوجود اپنے اپنے ملکوں کی زمین ان پر تنگ ہوگئی تھی اور وہ شہر بہ شہر مارے مارے پھر رہے تھے۔ یہ بھی اس نے دیکھا کہ شام کے اکثر و بیشتر قبائل دوڑ دوڑ کر اسلام قبول کر رہے ہیں چنانچہ اس نے اپنے بنو غسان کے قبول اسلام کی اطلاع گورنر شام امین الامت سیّدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو دی۔ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس کے اسلام قبول کرنے سے انتہائی خوشی ہوئی۔ انھوں نے یہ خبر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھی پہنچائی۔ آپؓ بھی اس خبر سے انتہائی مسرور ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد جبلہ نے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ حاضر ہونے کی درخواست کی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور مدینہ آنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ جبلہ اپنے پانچ سو رشتہ داروں کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے استقبال کا حکم فرمایا اور مدینہ کا ہر چھوٹا بڑا شخص شہر سے باہر نکل کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جبلہ نے اپنے دوسو ساتھیوں کو ہتھیاروں سے آراستہ ہونے اور ریشمی

لباس پہننے کا حکم دیا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے جن کی دموں کو گرہیں لگی ہوئی تھیں اور گلوں میں سونے چاندی کے قلادے پڑے ہوئے تھے۔ جبلہ نے اپنا تاج پہنا جس میں اس کی دادی ماریہ کے کانوں کی بالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اہل مدینہ نے قبل ازیں اس آن بان اور شان کا آدمی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے امیرالمومنین جن کے رعب وداب سے قیصر وکسریٰ لرزتے تھے، ان سے بھی سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے لہٰذا جبلہ کی آن بان اور شان وشوکت کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ جبلہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، امیرالمومنین نے اسے خوش آمدید کہا اور از راہ لطف ومہربانی اس کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جبلہ امیرالمومنین کی سادگی کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ یہ اتنی بڑی سلطنت کے حکمران ہو کر اتنے سادہ ہیں۔ وہ ان کی سادگی سے بڑا متاثر ہوا لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ان کی شان وشوکت سے ذرہ برابر متاثر نہ ہوئے۔

جبلہ کو مدینہ منورہ آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ حج کا موسم آ گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حج کو تشریف لے گئے۔ جبلہ بھی آپ کے ساتھ حج کو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ اس کا تہہ بند بنوفزارہ کے ایک شخص کے پاؤں تلے آ کر اتر گیا۔ جبلہ نے غصہ میں اس کی ناک پر مُکّا مار دیا۔ وہ شکایت لے کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو بلا کر پوچھا۔ اس نے اس واقعہ کی تصدیق کی کہ ہاں میں نے مکا مارا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''چونکہ تم نے خود اقرار جرم کر لیا ہے اس لیے یا تو اس شخص سے اپنا یہ قصور معاف کراؤ ورنہ تمھیں اس کی سزا بھگتنا ہوگی اور وہ سزا یہ ہے کہ یہ فزاری بھی تیری ناک پر اتنے ہی زور سے مکا مارے گا۔ جبلہ یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ اس نے ناگواری کے لہجہ میں کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسلام میں قانون کی نگاہ میں تم دونوں برابر ہو، سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے تم کسی شے میں اس پر فضیلت نہیں پا سکتے۔ جبلہ نے کہا: ''امیرالمومنین! میں تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے اسلام میں جاہلیت سے زیادہ عزت دی جائے گی لیکن یہاں تو وہ چیز مجھے نظر نہیں آ رہی۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جبلہ! یہ خیال دل سے نکال دو، اگر تم اس فزاری سے اپنا قصور معاف نہیں

کراؤ گے تو میں تمھیں ضرور سزا دوں گا۔'' جبلہ نے کہا کہ ''میں پھر اپنا پہلا دین عیسائیت ہی اختیار کر لیتا ہوں۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر اب تم نے عیسائیت اختیار کی تو میں تمھاری گردن مار دوں گا کیوں کہ اب تم اسلام قبول کر چکے ہو اور اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ جبلہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اور پریشان ہوگیا۔ اس نے امیر المومنین کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دے دی جائے تاکہ میں اس مسئلہ پر غور وفکر کروں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کو اپنی قیام گاہ پر جانے کی بغیر کسی ضمانت کے اجازت دے دی تاکہ وہ رات کو اس معاملہ پر غور وفکر کرے۔

جبلہ اپنی قیام گاہ پر گیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو چپکے سے چل نکلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ وہ راتوں رات شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ صبح ہوئی تو نہ جبلہ تھا اور نہ اس کے ساتھی۔ وہ مکہ مکرمہ سے کافی دور جا چکے تھے اور مکہ ان کے ناپاک وجود سے خالی ہوگیا تھا۔ جبلہ نے سیدھا قسطنطنیہ کا رخ کیا اور وہاں جا کر ہرقل قیصر روم کے پاس اپنے ساتھیوں سمیت عیسائی ہوگیا۔ ہرقل جبلہ کے واپس آ جانے پر بہت خوش ہوا اور اسے اپنے حق میں ایک بہت بڑی فتح تصور کرنے لگا اور اس کو جاگیر سے نوازا اور بہت سی مراعات بھی دیں۔ [1]

بعض روایات میں ہے کہ جبلہ قسطنطنیہ میں ہرقل کے پاس بڑے عیش وآرام سے رہتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی دمشق کی آس پاس والی قیام گاہ کو اکثر یاد کرتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قاصد کو خط دے کر ہرقل کے پاس بھیجا۔ جب وہ ہرقل کے پاس سے واپس آ رہا تھا تو جبلہ اس کو وہاں مل گیا۔ دیکھا کہ اس کی شان وشوکت ہرقل سے بھی زیادہ ہے۔ کنیزیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار گا رہی ہیں۔ جبلہ نے قاصد سے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خیر وعافیت پوچھی۔ قاصد نے کہا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہی ہیں اور وہ نہایت ضعیف العمری میں اپنی زندگی کی باقی ماندہ منزلیں طے کر رہے ہیں۔ جبلہ کو سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کی یاد بہت ستانے لگی اور اس نے ایک کنیز کو پانچ سو دینار اور پانچ ریشمی پوشاکیں لانے کا حکم دیا۔ جب وہ یہ لے آئی تو جبلہ

---

[1] الاغاني: ١٤/ ٤٤.

نے قاصد سے کہا کہ حسان رضی اللہ عنہ کو میری طرف سے یہ چیزیں پہنچا دینا۔ اس کے بعد اس نے قاصد کو بھی اتنا ہی انعام دینا چاہا لیکن قاصد نے وہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔ جبلہ زار و قطار رو پڑا اور کنیزوں سے کہا کہ مجھے اور رولاؤ۔ کنیزوں نے اپنے عود اور بربط اٹھائے اور جبلہ کے ان اشعار کو نغمے میں ڈھالنے لگیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

- ''میں نے ایک طمانچہ کھا کر قبیلے کے سرداروں سے مدد طلب کی، اگر میں اس پر چپ ہو جاتا تو کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔''
- ''لیکن مجھے غصے اور غرور نے گھیر لیا اور میں نے صحیح آنکھ کانی آنکھ کے بدلے میں فروخت کر ڈالی۔''
- ''کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا اور کاش میں وہی بات مان لیتا جو عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہی تھی۔''
- ''کاش میں ترائی ہی میں اپنا گلہ چرایا کرتا یا ربیع یا مضر کے ہاں قید کاٹ رہا ہوتا۔''
- ''اور کاش! میں شام میں ادنیٰ اوقات بسر کرتا اور اپنے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں میں بہرا اور اندھا ہو کر رہتا۔''

قاصد مدینہ طیبہ واپس آیا اور امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جبلہ کا تمام حال سنایا اور اس انعام کا بھی ذکر کیا جو اس نے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ اتنی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود وہاں خوش نہیں تھا اور اسے اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہونے پر نہایت افسوس تھا لیکن اب دنیا کی عیش و عشرت اس کو اسلام کی طرف دوبارہ آنے سے روکے ہوئے تھی اور اپنے وطن شام کی محبت بھی اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لے رہی تھی اور قسطنطنیہ میں سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے کو تہی دست اور بے سکون سمجھتا تھا۔ قسطنطنیہ میں جبلہ کے اعزاء و اقرباء بھی مقیم تھے جو ہرقل کے درباریوں میں شامل تھے، لیکن جبلہ اور ہرقل دونوں کو شام کی یاد ستاتی تھی اور دونوں کے دل میں یہ خواہش رہ رہ کر چٹکیاں لے رہی تھی کہ کاش انھیں پھر کبھی شام جانا نصیب ہو لیکن یہ ناممکن تھا کیونکہ اب شام پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ یہاں کے کشادہ باغوں، برف کے چمکتے پہاڑوں اور سرسبز

وادیوں کی یاد انھیں ستاتی تھی مگر انھیں پھر ساری زندگی شام اور بیت المقدس آنا نصیب نہ ہوا اور وہ دونوں وہیں غریب الوطنی میں مر گئے۔

جبلہ کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ اور اس کے ساتھیوں کا اسلام سے پھر جانا قبول کر لیا لیکن اسلام کے قانون عدل وانصاف کو داغ دار نہ ہونے دیا اور شاید اسی شئے نے جبلہ کو پوری زندگی پریشان کیے رکھا اور وہ اپنے عمل پر افسوس کرتا رہا۔ عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوش نمائی کی بلندی کی جگہ تختی اور خشونت کی لکیریں ہیں لیکن دنیا کا تمام نظام صرف اور صرف عدل ہی کے دم سے قائم ہے کیونکہ اس کارگاہِ آب وگل کا تمام نظام ہی عدل اور توازن پر استوار ہے۔ اس دنیا میں عدل وانصاف کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ نظام شمسی کا ہر کرّہ اپنی جگہ معلّق ہے اور اپنے اپنے دائروں میں حرکت اور گردش کر رہا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس میں ذرہ برابر بھی انحراف، بے اعتدالی اور میلان واقع ہو۔ یہی عدل کا قانون ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم میں جکڑا ہوا ہے۔ اسی عدل وانصاف ہی کا یہ کرشمہ تھا کہ شتربانوں کی ایک قوم صحرائے عرب سے اٹھی، سیلاب کی طرح بڑھی اور تمام کرۂ ارض پر پھیل گئی۔ دنیا نے اس سیلاب کی زد میں ظلم و درندگی کی انھی لہروں کو دیکھنا چاہا جو ہمیشہ فوجوں کے طوفان میں اٹھتی رہی ہیں لیکن دنیا نے دیکھا اور تاریخ کے صفحات اس کی چشم دید گواہی دیتے ہیں کہ وہ مختلف مادی طاقتوں سے ٹکرائی، عظیم الشان پہاڑوں کو ٹھوکر ماری اور بالآخر تمام کرۂ ارضی کو اچھال کر رکھ دیا، تاہم نہ کسی جھونپڑی کو اجاڑا، نہ کسی گھر کو آگ لگائی، نہ کسی عظیم الشان محل کو برباد کیا، نہ تمدن کی یادگاریں مٹائیں اور نہ تہذیب کے آثار قدیمہ ہی مسمار کیے، نہ کسی ظالم کی مدد کی اور نہ کسی مظلوم کی امداد سے منہ پھیرا۔ وہ فاتحانہ جوش میں سیلاب کی طرح بڑھی لیکن جب ممالک مفتوحہ میں داخل ہوئی تو گرداب کی طرح سمٹ گئی۔

اسلام کا یہی قانون عدل وانصاف تھا جو بادشاہ وقت کو ایک معمولی فرد اور رعایا کے دعویٰ کی جواب دہی کے لیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا تھا۔ یہ بات نہ صرف مدینہ کی اس چھوٹی اور سادہ مسجد کی عدالت ہی میں تھی بلکہ دمشق اور بغداد کی پرشوکت عدالتوں

میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ ہارون الرشید جیسا عظیم اور باجبروت خلیفہ قاضی ابو یوسف کی عدالت میں مدعی کے ساتھ کٹہرے میں کھڑا ہونے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا۔

اسلام کے اسی قانون عدل وانصاف سے اگرچہ خاص خاص آدمیوں (جسے جبلہ بن ایہم وغیرہ جن کی ادعائی شان مجروح ہوتی تھی)، کے دل مکدر ہوتے تھے لیکن چونکہ ہر زمانہ میں عوام کا اصلی مذاق یہ نہیں تھا، اس لیے عوام پر اس کا نہایت اچھا اثر پڑتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں عوام عادل ومنصف بادشاہ کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ یہ انسانی نفسیات کا ایک بنیادی اصول ہے۔

نامۂ مبارک بنام ہوذہ بن علی شاہ یمامہ:

جغرافیہ نویسوں نے شام اور عراق کو جب جدا کیا تو عرب کو پانچ صوبوں میں تقسیم کیا۔ (۱) تہامہ (۲) حجاز (۳) نجد (۴) یمن اور (۵) عروض۔ عروض اس قطعے کا نام ہے جو مشرقی حدود عراق سے خلیج فارس کے ساحلوں تک چلا گیا ہے۔ اس صوبہ میں یمامہ، عمان اور بحرین تین قطعات ہیں۔ یمامہ کی حدود اربعہ یہ ہیں: مشرق میں عمان، مغرب میں حجاز اور یمن کے بعض علاقے، جنوب میں الربع الخالی، (الربع الخالی اس صحرائے اعظم کا نام ہے جو یمامہ اور عمان کے مغرب میں حضرموت اور بحرین کے درمیان واقع ہے) شمال میں نجد۔ یمامہ عہد قدیم میں قبائل طسم اور جدیس کا وطن تھا۔ حجر یا قریہ ان کی حکومت کا صدر مقام تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے قریبی زمانہ میں یہاں یمامہ میں ایک قبیلہ بنو حنیفہ آباد تھا۔ مشہور متنبّی اور کذاب مسیلمہ اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جنگ یمامہ جو سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت لڑی گئی، اس میں سیدنا وحشی رضی اللہ عنہ اور دوسری روایت کے مطابق سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ ایک نہایت زبردست جنگ تھی جو ایک الصادق الامین پیغمبر جناب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ایک متنبّی اور کذاب مسیلمہ کے پیروکاروں کے درمیان لڑی گئی، جس میں بڑے بڑے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کام آئے جن میں حفاظ کی بھی ایک کثیر تعداد تھی اور اس جنگ کے بعد ہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن حکیم کو کتابی شکل میں مدوّن کرایا۔ جس کی

تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ'' میں بیان کردی ہے۔

بعض ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ یمامہ کا قدیمی نام ''جوا'' تھا۔ طسم وجدلیس کی باہمی جنگ وجدل اور لڑائی بھڑائی میں ایک مرتبہ قبیلہ جدلیس کی ایک عورت یمامہ بنت تر کو یمامہ کے پایہ تخت کی شہر پناہ اور فصیل کے پھاٹک پر سولی دے کر لٹکایا گیا۔ اسی وقت سے اس شہر کا نام یمامہ مشہور ہوگیا اور پھر اس صدر مقام کے تمام خطہ کو یمامہ کہا جانے لگا۔

یمامہ اگرچہ عربی قبائل کا مسکن تھا اور اس کے سردار اور قبائل کے روساء بھی ہمیشہ عربی نسل سے ہی تعلق رکھتے تھے لیکن اسلام کے عروج اور شباب کے زمانہ میں یہ علاقہ ایرانی حکومت کے ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا اور کسریٰ ایرانی کے زیر اقتدار عربی حکام یہاں کی گورنری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ۷ ہجری میں یمامہ کے سردار کے نام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت ارسال کی تو اس وقت ہوذہ بن علی جو قبیلہ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا، یہاں کا گورنر یا حاکم تھا۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامۂ مبارک کی سفارت کا شرف سیدنا سلیط بن قیس بن عمرو عامری انصاری رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا گیا۔ سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر روانہ ہوئے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے یمامہ پہنچے اور ہوذہ بن علی کے دربار میں پہنچ کر آپ رضی اللہ عنہ کا نامۂ مبارک اس کے سپرد کیا۔ ہوذہ نے نہایت محبت، شفقت اور خندہ پیشانی سے اس خط کو وصول کیا اور سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ بن عمرو کو نہایت اعزاز واحترام کے ساتھ جگہ دی۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ترجمان حاضر ہو۔ اس نے آخر نامہ مبارک پڑھنا شروع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:

((بسم الله الرحمن الرحيم، من محمد رسول الله الى هوذه بن علي، سلام على من اتبع الهدى، واعلم ان ديني سيظهر الى منتهى الخف والحافر، فاسلم تسلم، واجعل لك ماتحت يديك .)) (زرقانی:۳/۴۰۷، سیرۃ حلبیہ:۲/۳۷۶، صبح الاعشیٰ:۶/۳۷۹)

''اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن اور رحیم ہے، یہ خط اللہ کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

جانب سے ہوذہ بن علی کے نام ہے۔ اس پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرا یہ دین اسلام تمام عرب وعجم کی حدود تک پہنچے گا اور عنقریب غالب آئے گا۔ پس تجھ کو چاہیے کہ اسلام قبول کر لے سلامتی میں رہے گا۔ مجھے تیرے ملک سے کوئی سروکار نہیں، وہ تیرے قبضہ میں بدستور رہے گا۔''

ہوذہ نے نامہ مبارک سنا اور خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ نے ہوذہ کے اس طرزِ عمل کو دیکھا تو دعوت کا جذبہ ان کے دل میں کروٹیں لینے لگا۔ چنانچہ انھوں نے اسے ان الفاظ میں نصیحت فرمائی:

''ہوذہ! اللہ جل شانہ نے تجھے ایک بڑی جماعت کا فرمانروا اور سردار بنایا ہے۔ تجھ سے پہلے آنے والے بہت سے لوگ نارِ جہنم میں ہیں۔ سردار اسے نہیں کہا جاتا جو ایمان کے آڑے آئے۔ اگر تو چاہے تو تیری قوم تیرے ہاتھوں ایمان کی سعادتِ کبریٰ حاصل کر سکتی ہے لہٰذا تو اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا نہ کر۔ میں تجھ کو بہترین چیز یعنی قبول اسلام کا مشورہ دیتا ہوں اور بدترین چیز یعنی کفر سے بچاتا ہوں۔ میں تجھ کو حق تعالیٰ شانہ کی عبادت کی تلقین کرتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے روکتا ہوں، اس لیے کہ اللہ کی عبادت کے صلہ میں جنت ہے اور شیطان کی عبادت کی سزا جہنم ہے اور تو میری اس نصیحت کو قبول کر لے تو تو بامراد ہوگا اور دہشت انگیز باتوں سے محفوظ و مصئون رہے گا اور اگر تو نے میری بات نہ مانی تو تیرے اور ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ عنقریب فیصلہ کر دے گا۔

بعض اصحاب سیرت نے لکھا ہے کہ سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ نے ہوذہ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا:

''ہوذہ! تجھ کو بوسیدہ ہڈیوں نے حکمران بنا دیا ہے اور حقیقت میں سردار اور حکمران وہ ہے جو ایمان سے متمتع ہو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کو زادِ راہ بنایا۔ میں تجھے ایک بہترین شئے کا حکم کرتا ہوں اور ایک بدترین شئے سے تجھے روک رہا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا تمھیں حکم کرتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے

روکتا ہوں، اگر تو اس کو قبول کرے گا تو تیری امیدیں اور تمنائیں بر آئیں گی اور اگر تو انکار کرے گا تو یاد رکھ قیامت کا ہولناک منظر ہمارے اور تمھارے درمیان اس حائل پردہ کو اٹھا دے گا۔"

مورخین اور اصحاب سیرت نے لکھا ہے کہ ہوذہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ سیدنا سلیط کی تقریر سنی اور متانت اور سنجیدگی سے اس کا جواب دیا۔ اس نے سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ سے کہا:

"اے سلیط! مجھ کو اس ذات الٰہی نے سرداری بخشی ہے، اگر وہ تجھ کو بھی یہ شرف بخش دے تو تو اس کو اپنے لیے فخر کی بہت بڑی بات سمجھے۔ میں تمھاری دعوت پر غور و فکر کر رہا ہوں۔ مجھ کو موقع دے کہ میں اس بارے میں کوئی مستقل فیصلہ کر سکوں۔ میں عنقریب تجھے کوئی جواب دوں گا۔"

اس کا جواب سننے کے لیے سیدنا سلیط رضی اللہ عنہ چند روز یمامہ میں قیام پذیر رہے اور جب وہاں سے وہ روانہ ہوئے تو ہوذہ نے شہر "ہجر" کے مشہور پارچہ جات اور بعض دیگر ہدایا اور تحائف انھیں دیے کہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میری طرف سے پیش کر دینا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ان کے نامہ مبارک کے جواب میں ایک خط دیا، جس میں لکھا:

((ما احسن ما تدعو اليه وانا شاعر قومي وخطيبهم، والعرب تهاب مكاني فاجعل لي بعض الامر اتبعك.))

جس دین کی طرف آپؐ دعوت دیتے ہیں وہ نہایت خوب اور بہترین دین ہے۔ (اور آپؐ جانتے ہیں کہ) میں اپنی قوم میں مشہور شاعر اور خطیب ہوں اسی لیے عرب میری نہایت عزت و تکریم کرتے ہیں اگر آپؐ کچھ مجھ کو بھی اپنی حکومت میں شریک کر لیں تو میں آپؐ کی اتباع کے لیے تیار ہوں۔

سیدنا سلیط ہوذہ کا جواب اور اس کے تحائف اور ہدایا لے کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور وہاں کے تمام واقعات و حالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خط پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ "ایسی حالت میں اگر وہ مجھ سے زمین کی ایک بالشت یا اس سے کم کا بھی طالب ہو تو میں اس کو نہ دوں گا اور یہ یاد رکھو کہ وہ اور اس کا

ملک سب فنا ہو جائے گا۔'' آپؐ کے ارشادِ گرامی کا مطلب یہ تھا کہ اس احمق نے میری اس دعوت کا مطلب یہ سمجھا کہ یہ دنیا طلبی کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے اس نے یہ شرط عائد کی حالانکہ آپؐ کے نامہ مبارک میں یہ بات واضح تھی کہ مجھ کو تیری حکومت اور سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔ اسلام اور ملک گیری کی ہوس دو متضاد چیزیں ہیں۔قبول اسلام ہی سعادت دارین اور نجات ابدی کا بہترین راستہ ہے۔

ہوذہ دنیا کے لالچ میں اس سعادت ابدی سے یک قلم محروم رہا اور جب آپؐ فتح مکہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو جبریل امین علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوذہ کے مرنے کی خبر دی کہ ہوذہ ایمان سے محرومی کی حالت میں اس دنیا سے گزر گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: ''سنو! یمامہ میں ایک کذاب ظاہر ہونے والا ہے جو نبوت کا دعویٰ کرے گا اور میرے بعد قتل ہوگا۔''

(زاد المعاد: ۳/۶۳، زرقانی: ۳/۳۵۵، سیرۃ حلبیہ: ۳/۲۲۶)

بعض روایات میں ہے کہ ہوذہ کے دربار میں دمشق کا ایک عیسائی عالم تھا۔ ہوذہ اس کا نہایت معتقد تھا۔ ہوذہ نے اس کے سامنے یہ تمام قصہ بیان کیا اور اس سے اس بارے میں مشورہ لیا کہ مجھ کو اس نبیؐ کی اطاعت کر لینی چاہیے یا نہیں؟ اس نصرانی عالم نے کہا کہ کتب سابقہ کی روایات بتاتی ہیں کہ یہ وہی نبی ہے جس کی بشارت ہم کو سیدنا مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ تم کو ضرور اس کی اطاعت کر لینی چاہیے، لیکن بدقسمتی سے ہوذہ مکمل واقفیت حاصل کرنے کے بعد بھی ایمان کی دولت سے محروم رہا اور حکومت کے غرور نے اسے اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے بے بہرہ رکھا۔ کسی نے سچ کہا ؏

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
چو خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

۱۰ہجری میں اسی قبیلہ بنو حنیفہ کی ایک بڑی جماعت قبیلہ کی جانب سے نبی کریمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور اس نے نیاز مندی اور قبول اسلام کا اظہار کیا۔ بعض روایات کے مطابق ۹ ہجری میں بنو حنیفہ کا یہ وفد مدینہ منورہ میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا۔

اس وفد میں مسیلمہ کذاب بھی تھا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی۔ یہ وفد سترہ آدمیوں پر مشتمل تھا اور ایک انصاری کے مکان پر اترا۔ پھر بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر مشرف بالاسلام ہو گیا لیکن مسیلمہ کذاب اپنے تکبر اور اکڑ پنے کے باعث بارگاہ رسالت میں حاضر نہ ہوا۔ آپ ﷺ خود ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے ہر طریقہ سے اس کی دل جوئی کرنا چاہی لیکن اس احمق پر پیغمبرانہ اخلاق کا کوئی اثر نہ ہوا، چنانچہ آپ ﷺ نے فراست نبوی سے یہ تاڑ لیا کہ اس میں شر موجود ہے۔ مسیلمہ کذاب نے کہا: اگر آپؐ مجھ کو اپنے بعد اپنا خلیفہ اور جانشین بنالیں تو میں آپؐ کی بیعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ سرکار دوعالم ﷺ کے ہاتھ میں اس وقت کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم مجھ سے یہ بھی مانگو گے تو میں تمھیں یہ بھی نہ دوں گا اور تم اپنے بارے میں اللہ کے مقرر کیے ہوئے فیصلہ سے تجاوز نہیں کر سکتے اور اگر تم نے پیٹھ پھیری تو اللہ تعالیٰ تمھیں توڑ کر رکھ دے گا۔ غالباً تو وہی ہے جو مجھے خواب میں دکھلایا گیا ہے اور یہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ ہیں جو تمھیں میری طرف سے جواب دیں گے۔ یہ کہہ کر آپؐ واپس تشریف لے آئے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''میرے پاس رُوئے زمین کے خزانے لا کر رکھ دیئے گئے اور ان میں سے سونے کے دو کنگن میرے ہاتھ میں آن پڑے، مجھے یہ بہت گراں گزرے، مجھے کہا گیا کہ انھیں پھونک مارو، میں نے پھونک ماری تو وہ دونوں اڑ گئے۔''

اس خواب کی تعبیر آپ ﷺ نے یہ فرمائی کہ آپ کے بعد دو کذّاب ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ ان میں سے ایک مسیلمہ کذاب ظاہر ہوا اور دوسرا اسود عنسی۔ اسود عنسی تو آپ کی زندگی ہی میں مارا گیا اور مسیلمہ کذاب آپؐ کے جانشین اور خلیفہ اول سیدنا صدیق ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مسیلمہ نے ۱۰ ہجری میں نبوت کا دعویٰ کیا اور ربیع الاول ۱۲ ہجری میں جنگ یمامہ میں قتل ہو گیا جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت ابوبکر صدیق'' میں دی ہے۔ (زرقانی: ۴/۱۹، فتح الباری: ۸/۹۳، مسند احمد: ۲/۳۴۷)

نامہ مبارک بنام اکیدر دومہ:

دومۃ الجندل شام اور مدینہ منورہ کے مابین دارالقریٰ یا تو ایک قریہ کا نام ہے یا پھر متعدد قریات کے مجموعہ کا نام ہے جو جبل طے کے قریب ایک شہر پناہ سے محصور ہے، اور بنو کنانہ جو قبیلہ بنو کلب کی ایک شاخ ہے، وہ یہاں آباد ہے۔ دومہ کے وسط میں ایک نہایت مستحکم قلعہ تھا جس کا نام مارد تھا۔ یہی قلعہ اکیدر کا قلعہ تھا۔ اکیدر سلطنت روم کا باج گزار تھا اور اس علاقہ پر حاکم تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کے پاس بھیجا کہ جا کر اس کو دعوت اسلام دیں اور اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر جزیہ دینا منظور کرے۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب دومہ پہنچے تو اکیدر کو دعوت اسلام دی۔ اکیدر نے بجائے اسلام قبول کرنے کے جنگ شروع کر دی۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ چونکہ جنگ کرنے کے ارادہ سے نہیں گئے تھے، اسی لیے ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی مجاہدین اسلام کی جماعت تھی لیکن تھے تو آخر ''سیف اللہ'' اور سیف اللہ کے لیے فوج کی کثرت وقلت کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جب اکیدر جنگ کے لیے تیار ہو گیا تو اس نے خالد رضی اللہ عنہ کو بھی تیار پایا۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی جھڑپ کے بعد سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے اکیدر کو گرفتار کر لیا اور اسی حالت میں سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس کو لے کر دربار رسالت میں پہنچے۔ اکیدر اگرچہ اسیر تھا لیکن شاہانہ لباس میں ملبوس بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اس کا اعزاز کیا اور اسے اپنے ساتھ بٹھایا اور اب پھر اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اکیدر نے آپ ؐ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھا اور آپ ؐ کا مبارک کلام سنا اور برضا ورغبت مسلمان ہو گیا۔ جب اکیدر آپ ﷺ سے رخصت ہونے لگا تو امان کے لیے آپ ؐ سے ایک عہد نامہ لکھوایا جس کے الفاظ حسب ذیل تھے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، هٰذَا الْكِتَابُ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لِاُكَيْدِرِ دُوْمَةَ ، حِيْنَ اَجَابَ اِلَى الْاِسْلَامِ وَخَلَعَ الْاَنْدَادَ وَ وَالْاَصْنَامَ مَعَ خَالِدِ بْنُ الْوَلِيْدِ سَيْفِ اللّٰهِ فِيْ دُوْمَةِ الْجَنْدَلِ وَاَكْنَافِهَا ، اِنَّ لَنَا الضَّاحِيَةَ مِنَ الضَّحْلِ وَالْبُوْرَ وَالْمَعَامِيَ وَاَغْفَالَ الْاَرْضِ وَالْحَلْقَةَ وَالسِّلَاحَ وَالْحَافِرَ وَالْحِصْنَ ، وَلَكُمْ

الضَّامِنَةُ مِنَ النَّخْلِ وَالْمَعِيْنِ مِنَ الْمَعْمُوْرِ ، لَا تُعْدَلُ سَارِحَتُكُمْ وَلَا تُعَدُّ فَارِدَتُكُمْ وَلَا يَحْظَرُ عَلَيْكُمُ النَّبَاتُ ، تُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ لِوَقْتِهَا وَتُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ بِحَقِّهَا ، عَلَيْكُمْ بِذٰلِكَ عَهْدُ اللّٰهِ وَالْمِيْثَاقُ ، وَلَكُمْ بِذٰلِكَ الصِّدْقُ وَالْوَفَاءُ ، شَهِدَ اللّٰهُ وَمَنْ حَضَرَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ .))

''شروع اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔ یہ خط محمد رسول (ﷺ) کی طرف سے اکیدر دومہ کے لیے لکھا گیا ہے جب کہ وہ اسلام کی دعوت کو قبول کر چکا ہے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ کے ساتھ دومۃ الجندل اور اس کے اطراف میں شرکاء واصنام کو خیر باد کہہ چکا ہے۔ چشمے کا نواحی اور اطراف کا علاقہ، غیر مزروعہ زمین، غیر مملوکہ زمین، غیر آباد اراضی، جنگ میں کام آنے والا سازوسامان، گھوڑے، مویشی اور قلعہ ہمارے لیے مختص ہوگا جب کہ شہری علاقے والی کھجوریں، آباد زمین والا چشمہ تمھارے لیے مخصوص ہوگا۔ تمھارے مال مویشی کو چرنے سے نہیں روکا جائے گا۔ جو جانور فالتو ہوگا اس کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ چراگاہوں سے تمھیں نہیں روکا جائے گا۔ تم اوقات مقررہ میں نماز پڑھو گے اور فرض شدہ زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے۔ اس سلسلہ میں تمھارے لیے عہد ومیثاق ہے اور اس پر تمھیں نہایت صدق وصفا کے ساتھ قائم رہنا ہے۔ اس پر اللہ اور حاضر مسلمان گواہ ہیں۔'' (روض الانف: ۲/۳۱۹، زرقانی: ۳/۴۱۴، سیرۃ حلبیہ: ۲/۳۲۹، عقد الفرید: ۱/۱۱۲، معجم البلدان: ۴/۱۰۸، فتوح البلدان: ص ۶۸، صبح الاعشٰی: ۶/۳۷۰)

سرکار دو عالم ﷺ نے ان معاہدوں کے ساتھ اکیدر اپنی حکومت چلاتا رہا اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرتا رہا لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ سرکار دو عالم ﷺ کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ تمام معاہدوں کو پس پشت ڈال کر مرتد ہوگیا اور دومۃ الجندل سے نکل کر حیرہ کی طرف بھاگ گیا اور وہاں دومہ کے نام سے ایک بلڈنگ بنا کر اس میں رہائش پذیر ہوگیا اور دومۃ الجندل کو اپنے بھائی حریث بن مالک ۔ سپرد کرد.

نامہ مبارک بنام جیفر بن جلندی فرمان روا عمان:

عرب کے صوبوں میں سے ایک صوبہ کا نام عمان ہے جو عروض کا صوبہ سمجھا جاتا ہے اور بحر عمان پر واقع ہے جو خلیج فارس کے قریب تھوڑے سے فاصلہ پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل وہاں قبیلہ اسد ''ازد'' کی ایک شاخ آباد تھی۔ اب اس علاقہ میں خارجیوں کی حکومت ہے جس کا دارالحکومت ''مسقط'' ہے۔ یہ خطہ موتیوں اور میوہ جات کے لیے بہت مشہور ہے۔ خلیج میں یہ علاقہ نہایت سرسبز وشاداب ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے عہد ہمایوں میں یہاں کا حاکم جیفر بن جلندی تھا اور اس کا بھائی عبد بھی بعض حصوں پر اس کی نیابت میں حکومت کرتا تھا۔ یہ دونوں ''ازد'' قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ان دونوں بھائیوں کو ذی قعدہ ۸ ہجری میں دعوت اسلام دینے کے لیے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو سفارت کار بنا کر بھیجا۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عمان پہنچا اور سب سے پہلے میں نے عبد سے ملاقات کی۔ اس لیے کہ وہ اپنے بھائی جیفر کی بہ نسبت زیادہ خلیق اور نرم مزاج تھا۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں جناب رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں اور تمھیں اور تمھارے بھائی شاہ عمان دونوں کے نام اسلام کی دعوت کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ عبد نے جواب میں کہا کہ میرا بھائی جیفر عمر میں مجھ سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ وہ بادشاہ اور عمان کا فرمان روا بھی ہے، اس لیے وہ زیادہ مستحق ہے کہ دعوت اسلام کا یہ معاملہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد اس سے آپ کی ملاقات کرا دوں گا۔ سیدنا عمر بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے اور عبد کے درمیان کچھ گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ عبد نے دعوت اسلام کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تو سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اسلام کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانو اور اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کرو اور محمد (ﷺ) کو اللہ کا رسول اور بندہ تسلیم کرو۔ یہی دو شہادتیں ہیں جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ عبد نے کہا: ''عمرو! تیرا باپ قوم کا سردار تھا۔ اس نے کیا طریقہ اختیار کیا؟ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لایا اور حالت کفر ہی میں مر گیا۔ کاش کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر پر

ایمان لے آتا اور اس کی صداقت کا اقرار کر کے جہنم کی آگ سے بچ جاتا۔ میں خود بھی کچھ عرصہ اپنے باپ کی رائے اور عقیدہ پر قائم رہا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل فرمایا اور مجھے اسلام کی قیمتی اور نایاب دولت ہاتھ آ گئی اور مجھے بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ حلقۂ اسلام میں داخل ہوا ہوں۔ میں نے نجاشی کے درمیان میں قریش کی جو سفارت کی اس سلسلہ میں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے واپس مکہ آ کر پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے کسی کام میں حصہ نہیں لیا بلکہ جب آپ مدینہ منورہ ہجرت فرما کر گئے تو چھ سات سال بعد پھر میں بھی مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تقریر سے متاثر ہو کر نجاشی بھی مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ اب یہ پوچھا گیا کہ ان کی رعایا کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا؟ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پہلے تو انھوں نے تھوڑی سی مخالفت کی بالآخر وہ اور اکثر پادری مسلمان ہوگئے۔ ہرقل نے نجاشی کے مسلمان ہونے کے بعد اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص نے جواب میں فرمایا کہ وہ خاموش رہا اور نجاشی کے خلاف وہ کچھ نہ کر سکا۔ نجاشی چونکہ ہرقل کا باج گزار تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے ہرقل کو خراج دینا بند کر دیا۔ ہرقل کو جب خراج کی اس بندش کا علم ہوا تو اس کے بھائی نیاق نے کہا کہ آپ کے ایک غلام نے آپ کو خراج دینے سے انکار کر دیا ہے اور آپ کے دین کو بھی اس نے ترک کر دیا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ پھر کیا ہوا۔ اس نے ایک دین کو پسند کر کے قبول کر لیا، مجھے اس سے کیا سروکار۔ بخدا! اگر بادشاہی کا خیال نہ ہوتا کہ یہ چھن جائے گی تو میں بھی وہی کرتا جو نجاشی نے کیا ہے۔ عبد نے بڑی حیرانگی سے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا یہ واقعی سچ ہے؟ انھوں نے فرمایا: "بخدا! یہ بالکل درست اور سچ ہے۔"

اب عبد نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ آپ کا پیغمبر کن چیزوں کا حکم کرتا ہے اور کن چیزوں سے روکتا ہے؟ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: "وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم فرماتے ہیں اور گناہوں، معصیت، زنا، شراب نوشی، بتوں کی پوجا اور صلیب وغیرہ کی پرستش سے روکتے ہیں۔ عبد کو دین اسلام اور پیغمبر

اسلام ﷺ کی تعلیمات اور احکام جو وضاحت سے بیان کیے گئے بہت پسند آئے اور اس نے نہایت حسرت سے کہا کہ کاش میرا بھائی اس دین کو قبول کر لے اور میں اور وہ دونوں سرور کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوں اور ایمان لے آئیں اور آپ ﷺ کی زیارت سے بھی مشرف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے بھائی نے ایسے اچھے دین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو وہ نہ صرف اپنے ملک کو نقصان پہنچائے گا بلکہ دین کے معاملہ میں بھی گھاٹے میں رہے گا۔ عبد کی یہ بات سن کر سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمھارا بھائی دین اسلام کو قبول کر لے گا تو اس کا ملک اس کے پاس ہی رہے گا البتہ یہ یہاں کے امراء اور متمول لوگوں سے صدقہ وصول کر کے یہاں کے فقراء اور غریب لوگوں میں تقسیم کرا دیں گے۔ صدقہ کا لفظ چونکہ عبد نے پہلی مرتبہ سنا تھا اس وجہ سے اس نے ''صدقہ'' کے لفظ کی وضاحت چاہی تو آپ نے زکوٰۃ کے تمام مسائل بیان فرما دیئے۔

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے چند روز عبد کے پاس ہی قیام فرمایا۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز اس نے مجھے جیفر کے دربار میں پہنچا دیا۔ میں نے اس کو سرکار دو عالم ﷺ کا نامہ مبارک دیا۔ اس نے اس کو پڑھا اور پڑھنے کے بعد اس نے وہ نامہ مبارک اپنے بھائی کو دے دیا۔ فرماتے ہیں کہ میں بغور دیکھ رہا تھا کہ عبد اپنے بھائی کی بہ نسبت زیادہ متاثر تھا۔ جیفر خط پڑھنے کے بعد مجھ سے کہنے لگا: ''قریش کا کیا حال ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ سب ایمان لا چکے ہیں۔ اب بادشاہ نے پوچھا: ''تمھارے پیغمبرؐ کے ساتھ رہنے والے کس قسم کے آدمی ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ جس نے بھی اسلام کو قبول کیا نہایت رغبت وخوش دلی سے قبول کیا ہے اور وہ تمام دنیا اور تمام علائق دنیا کو چھوڑ کر سرکار دو عالم ﷺ کا جان نثار اور فداکار بن گیا ہے۔ بادشاہ جیفر نے یہ تمام سن کر مجھے کہا کہ مجھے کل پھر ملنا۔ چنانچہ میں دوسرے روز جب بادشاہ سے ملنے کے لیے آیا تو پہلے اس کے بھائی عبد سے ملا۔ عبد نے کہا کہ اگر ہمارے ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو بادشاہ اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ عبد سے یہ بات سن کر میں بادشاہ کی خدمت میں پہنچا۔ مجھے دیکھ کر بادشاہ نے کہا میں نے بہت غور وفکر کیا اگر میں ایسے شخص کا مطیع اور فرمان بردار ہو جاؤں جس کی فوج ہمارے ملک تک

نہیں پہنچی تو سارا ملک عرب ہمیں کمزور اور بزدل ہونے کا طعنہ دے گا حالانکہ اگر اس کی فوج اس ملک میں آئے گی تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ میں نہایت بہادری اور جرأت سے اس کا ایسا مقابلہ کروں گا کہ تم لوگوں کو کبھی ایسا سابقہ نہ پڑا ہوگا۔

یہ جواب کوئی اچھا جواب نہیں تھا بلکہ ایک روکھا اور درشت جواب تھا جس پر میں نے کچھ مایوس سا ہو کر بادشاہ سے کہا کہ آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں کل واپس چلا جاؤں اور آپ کا یہ روکھا پھیکا جواب بارگاہ رسالت میں پہنچا دوں۔ میری یہ بات سن کر جیفر خاموش ہوگیا۔ صبح جب میں نے واپسی کے سفر کی پوری تیاری کر لی تو جیفر نے مجھے دوبارہ بلایا اور دونوں بھائیوں نے بخوشی میرے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا اور انھوں نے میرے سامنے اسلام کا ان الفاظ میں اقرار کیا:

> ”آپ نے مجھے ایسے نبی امی (ﷺ) کی خبر دی ہے جو کسی دوسرے کو حکم دینے سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں اور کسی شئے کو منع کرنے سے قبل خود اس سے پرہیز اور اجتناب کرتے ہیں۔ اگر وہ غالب ہوتے ہیں تو اکڑتے نہیں اور تکبر و غرور سے کام نہیں لیتے اور اگر مغلوب ہوتے ہیں تو اپنے مقصد سے باز نہیں رہتے، وہ عہد کو وفا کرتے ہیں، جب وعدہ کرتے ہیں تو سچا کرتے ہیں (واشهد انه نبی) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے نبی ہیں۔“

ایمان لانے کے بعد وہاں کے مفتوحہ میں سے میں نے سالیانہ وصول کیا اور رئیس عمان نے اس کی وصولی میں میری پوری مدد کی۔ میں نے وہاں کے متمول لوگوں اور مالداروں سے سالیانہ وصول کر کے وہیں کے فقراء اور غرباء میں اس مال کو تقسیم کر دیا اور اس سلسلہ میں ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہا کہ ایک روز اچانک مجھے سرکار دو عالم ﷺ کے وصال کی خبر پہنچ گئی۔

(طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۴۷)

جیفر نے پہلے تو سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ذرا سخت اور درشت باتیں کیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا امتحان لینا چاہتا تھا کہ کیا یہ واقعی کسی بادشاہ کا قاصد ہے یا کسی پیغمبر کا سفارت کار۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوگیا کہ یہ واقعی ایک پیغمبر کا

سفارت کار ہے جس کو ملک گیری کی ہوس نہیں تو بخوشی اسلام قبول کر لیا۔ دوسرے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بھائی عبد نے اس کو اصل حقیقت بتائی ہو اور بادشاہ کے ذہن میں اس نے یہ بات ڈالی ہو کہ یہ واقعی ایک نبی اور رسول کا سفارت کار ہے لہٰذا اس کی دعوت کا انکار دین و دنیا کے خسران کا باعث ہو سکتا ہے۔

نامۂ مبارک بنام سرداران ایلہ:

''ایلہ'' حجاز کے آخر اور شام کے علاقہ کے شروع میں بحر قلزم کے کنارے شہر آباد ایک شہر ہے۔ ابو منذر کا بیان ہے کہ یہ نام ایلہ بنت مدین بن ابراہیم علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا اور ابو عبید کہتے ہیں کہ ''ایلہ'' فسطاط اور مکہ مکرمہ کے درمیان بحر قلزم کے درمیان واقع ہے اور شام کے شہروں میں شمار ہوتا ہے اور ابو زید کہتا ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے اور ان یہود کا مسکن رہ چکا ہے جن پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ''سبت'' کے روز مچھلی کا شکار حرام کر دیا تھا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی کر کے اللہ کی لعنت سر لی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا تھا ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ﴾ یہ بستی اب بھی یہودیوں ہی کا مسکن تھی اور یوحنا بن روبہ اس کا حاکم تھا۔ اور اب اس کو عقبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وہی ''عقبہ'' ہے جو آج کل امریکن سیاست کی جولان گاہ بنا ہوا ہے اور جس کے لیے فلسطینی اور عرب حکومتیں ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، اس لیے کہ قریبی دورِ حکومت میں بھی عقبہ اور معان حقیقت میں حجاز کی حکومت ہی کے زیر سیادت ہیں اور اب مقامات مقدسہ کا جزو ہیں۔

غرض کہ مجاہدین اسلام جب مدینہ منورہ واپس ہونے لگے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوحنا بن روبہ سردار ایلہ اور شہر کے عمائدین کو اسلام کی دعوت کے لیے نامہ مبارک بھیجا جس کو سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے تحریر فرمایا۔ یہ نامہ مبارک بہت مفصل ہے اور اس میں معاہدین کے متعلق کی ایک بہترین دستاویز ہے۔ نامہ مبارک کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

((سلام انتم فانی احمد الیکم اللہ الذی لا الہ الا ھو وانی لم

اكن لا قاتلكم حتى اكتب اليكم فاسلم او اعطى الجزية
واطع الله رسله ورسل رسله واكرمهم واكسهم كسوة حسنة
غير كسوة الغزاء واكس زيدا كسوة حسنة فمهما رضيت رسلى
فانى قد رضيت وقد علم الجزيه ، فال اردتم ان يامن البر
والبحر فاطع الله ورسوله ، ويمنع عنكم كل حق كان للعرب
والعجم الا حق الله وحق رسوله ، وانك ان رودتهم ولم
ترضهم لا اخذ منك شيئا حتى اقاتلكم ، فاسبى الصغير
واقتل الكبير ، فانى رسول الله بالحق ، او من بالله وكتبه
ورسله وبالمسيح بن مريم انه كلمة الله ، وانى أؤمن به انه
رسول الله واتت قبل ان يمسكم الشر ، فانى قد اوصيت
رسلى بكم و اتت حرملة ثلثة اوسق شعير ، وان حرملة شفع
لكم وانى لو لا الله ، وذالك لم ار اسلك شيئا حتى ترى
الجيش وانكم ان اطعتم رسلى فان لكم جار محمد ومن
يكون منه وان رسلى شرحبيل وابى وحرملة وحريث بن زيد
الطائى ، فانهم مهما قاضوك عليه فقد رضية وان لكم ذمة
الله وذمة محمد رسول الله ، والسلام عليكم ان اطعتم
وجهّزوا اهل مقنا الى ارضهم .))

تم پر سلام ہو، میں تمھارے لیے اس اللہ کی حمد و بیان کرتا ہوں جو یکتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، میں تمھارے ساتھ کسی قسم کی جنگ کا ارادہ اس وقت تک نہیں رکھتا جب تک کہ تمھارے پاس میری تحریر محبت نہ پہنچ جائے، تمھارے لیے یہ بہتر ہے کہ یا مسلمان ہو جاؤ یا پھر جزیہ دینا منظور کرو اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ اور اس کے رسولؐ کے قاصدوں کی فرمان برداری قبول کرو، ہمارے قاصدوں کا احترام کرو اور ان کو غزا کے کپڑے کے علاوہ جو

کہ ریشمی ہوتا ہے، پارچات بطور نذر دو۔ وہ جن باتوں پر راضی ہوں گے میں بھی ان پر راضی ہوں اور ان کو جزیہ کے احکام بتا دیئے گئے ہیں، اگر تم کو امن کی زندگی پسند ہے اور خشکی اور تری میں فتنہ وفساد اور شور وشر منظور نہیں ہے تو اللہ کے پیغمبرؐ کی اطاعت اختیار کرو، اس کے بعد عرب وعجم میں کوئی تم کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا البتہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق کسی وقت بھی معاف نہیں ہوتا اور اگر تم نے ان باتوں کو نہ مانا اور رد کر دیا تو مجھ کو رفع فتنہ کے لیے جنگ کرنا پڑے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے قتل کیے جائیں گے اور چھوٹے گرفتار۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اللہ کا سچا پیغمبر ہوں۔ اللہ پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہوں اور یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ مسیح بن مریم علیہما السلام اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ مشورہ شر سے پہلے تم ان باتوں کو خوب سمجھ لو۔ میں نے اپنے قاصدوں کو اس بارے میں خوب سمجھا دیا ہے۔ حرملہ میرے پاس تین وسق (جو) لے کر آئے تھے اور تمھاری سفارش کرتے تھے۔ اگر اللہ کے حکم کی تعمیل اور تمھارے متعلق حرملہ کے نیک گمان کا پاس نہ ہوتا تو مجھ کو اس خط وکتابت کی ضرورت نہ ہوتی اور اس کے بجائے جنگ کا میدان گرم ہوتا۔ اگر میرے قاصدوں کی تم نے اطاعت کر لی تو اسی وقت سے تم کو میری اور ہر اس شخص کی جو مجھ سے وابستہ ہے، ہر قسم کی پناہ اور مدد حاصل ہے۔ خوب سمجھ لو کہ میرے قاصد شرحبیل بن حسنہ، ابی بن کعب، حرملہ اور حریث بن زید طائی جو فیصلہ تمھارے متعلق کریں گے میں اس سے کلی طور پر متفق ہوں اور تم اس وقت اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذمہ اور پناہ میں ہو۔ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو تم پر سلام ہو اور اہل مقنا (مقنا کے یہودیوں) کو اپنی جگہ پر قائم رہنے دو۔

یوحنا اس کے جواب میں خود ''تبوک'' میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اس شرط پر جزیہ دینا قبول کر کے اسلام کی امان میں داخل ہوگیا کہ ہر بالغ کے ذمہ سال بھر میں ایک دینار ادا کرنا ہوگا اور جزیہ کی یہ تعداد تین سو دینار سے کچھ زیادہ شمار کی گئی اور عورتیں اور بچے اس جزیہ سے معاف کیے گئے۔ (ماخوذ بلاغ مبین)

نامۂ مبارک بنام وائل بن حجر:

حضر موت بحر ہند کے ساحل یا عرب کے انتہائی سمت میں بحر عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ مورخین نے اس کی حدود اس طرح بیان کی ہیں: شمال میں بحر ہند، جنوب میں احقاف اور مغرب میں صنعاء واقع ہے۔ یمن کے صوبوں میں سے ایک مشہور صوبہ ہے۔ کہتے ہیں کہ قحطان کے بیٹوں میں سے ایک کا نام حضر ماوت تھا۔ اسی کے نام پر اس جگہ کا نام حضر موت رکھا گیا۔ عاد وثمود کا اصل وطن یہی مقام بتایا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں یہاں کے باشندوں نے اپنی ایک مستقل حکومت کر لی تھی اور ان کی شہرت تبابعہ یمن کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

حضر موت کا آخری بادشاہ حجر تھا۔ شاہی شوکت وسطوت اس کے دور ہی میں ختم ہوگئی تھی اور اس کے بعد اس کے بیٹے وائل بن حجر کی حیثیت ایک سردار کی رہ گئی تھی جس کو عربی میں ''قیل'' کہتے ہیں اور حضر موت کی یہ حکومت اس طرح مختلف سرداروں کے درمیان منقسم ہوگئی تھی، اس لیے آپ نے ۱۰ ہجری میں ان تمام سردارانِ حضر موت کے نام اسلام کی دعوت بھیجی۔

۱۰ ہجری میں سرکار دو عالم ﷺ نے یمن کے سرداروں کے نام اسلام کی دعوت کے پیغامات بھیجے جن میں تبابعہ یمن یعنی شاہان حمیر اور قبائل حضر موت دونوں شامل تھے اور نہ صرف یہ بلکہ ملک یمن کے تمام صوبوں حضر موت، احقاف، صنعاء اور نجران وغیرہ کے سرداروں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے سیدنا علی بن ابی طالب، سیدنا معاذ بن جبل اور سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم کو مقرر فرمایا تھا اور اللہ کے فضل وکرم سے ایک سال کے اندر اندر تمام یمن کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔

اسی سلسلہ میں آپؐ نے حضر موت کے آخری تاجدار وائل بن حجر کے نام بھی اسلام کی دعوت کے لیے پیغام بھیجا۔ ادھر وائل بن حجر قبول اسلام کے لیے مدینہ منورہ روانہ ہوئے ادھر سرکار دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بشارت سنائی کہ عنقریب ایک دور دراز بستی حضر موت سے اپنی قوم کے سردار وائل بن حجر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں سرشار آتے ہیں اور حضر موت کے شہزادے ہیں۔ جب چند روز کے بعد وائل بارگاہ رسالت

میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو خوش آمدید کہا اور اپنے برابر جگہ دی اور ان کی عزت وعظمت بڑھانے کے لیے ان کے نیچے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور پھر ان کو برکت کی دعا دی کہ اللہ تعالیٰ وائل اور اس کی اولاد میں برکت دے۔

سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد چند روز مدینہ طیبہ میں قیام پذیر رہے۔ جب وہ وطن روانہ ہونے لگے تو بارہ گاہ رسالتؐ میں عرض کیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے بخوشی اجازت مرحمت فرما دی اور سرداران حضر موت پر ان کی سرداری کو بحال رکھا۔ اس کے بعد سیدنا وائل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپؐ میری قوم کے لیے کچھ نصائح تحریر فرما دیں جو میں واپس جا کر ان کو سناؤں۔ آپ ﷺ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ سردارانِ حضر موت کے نام ایک مکتوب لکھیں۔ حضر موت کی زبان چونکہ حجاز سے مختلف تھی اس لیے نامہ مبارک میں اس کی رعایت رکھی گئی اور مخلوط زبان میں اس کو تحریر کیا گیا:

((من محمد رسول الله الى الاقيال العباهلة من اهل حضر موت باقامة الصلاة وايتاء الزكوة، على التيعة شاة والتيمة لصاحبها وفي السيوف الخمس، لا خلاط ولاراة ولا شناق ولا شغار ومن اجبى فقد اربى، وكل مسكرٍ حرام.))

(البیان والتبیین: ۲/ ۲۷، العقد الفرید: ۱/ ۱۱۲، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/ ۵۸)

''محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے حضر موت کے بحال رہنے والے شہزادوں کے نام۔ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جانوروں کے ابتدائی نصاب (جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے) میں ایک بکری دینا واجب ہوگا، چالیس بکریوں سے اگر ایک زائد ہو تو وہ مالک کا حق ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ تلواروں پر خمس ہوگا، خلط ملط کرنا یا جانوروں کو نشیبی جگہ کھڑا کر کے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو کم کر کے دکھانا ممنوع ہے۔ نہ تو دو قسم کے آدھے آدھے نصاب زکوٰۃ کو ملا کر ایک نصاب بنایا جائے گا اور نہ نکاح شغار (بلا مہر وٹے سٹے

کا نکاح) کی اجازت ہے۔"

قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ میں لکھا ہے:

((اِلَی الْاَقْیَالِ الْعَبَاهِلَةِ وَالْاَرْوَاعِ الْمُشَابِیْبِ فِی التِّیْعَةِ شَاةٌ لَامُقَوَّرَةَ الْاَلْیَاطِ وَلَا ضِنَاكَ، وَاَنْطُوا الثَّجَّةَ وَفِی السُّیُوْبِ الْخُمُسُ، وَمَنْ زَنٰی مِنْ بِكْرٍ فَاصْقَعُوْهُ مَائَةً وَاسْتَوْضُوْهُ عَامًا، وَمَنْ زَنٰی مِنْ ثَیِّبٍ فَضَرِّجُوْهُ بِالْاَضَامِیْمِ، وَلَا تَوْصِیْمَ فِی الدِّیْنِ وَلَا غُمَّةَ فِی فَرَائِضِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ وَوَائِلُ بْنُ حُجْرٍ یَتَرَفَّلُ عَلَی الْاَقْیَالِ.)) (الشفاء:ص۴۰۹)

"بحال رہنے والے شہزادوں اور رعب دار سرداروں کے نام، ابتدائی نصاب پورا ہونے پر ایک بکری ہے۔ نصاب سے فالتو بکری مالک کا حق ہے۔ یہ بکری نہ تو دبلی ہو اور نہ موٹی تازی، درمیانہ قسم کی ادا کیا کرو اور تلواروں میں خمس واجب ہے۔ غیر شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگاؤ اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دو اور شادی شدہ اگر زنا کرے تو اسے لہولہان کر دو۔ حدود دینی میں سستی نہیں ہوگی، نہ اللہ کے فرائض میں پردہ پوشی ہوگی۔ ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے اور وائل بن حجر شہزادوں کے سربراہ ہوں گے۔"

ابن سعد نے اس نامہ مبارک کا مضمون ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

((من محمد رسول الله الی اقیال العباهلة لیقیموا الصلوة ویوتوا الزکوٰة و الصدقة علی التبیعة والسائمة لصاحبها النسمة، لا خلاط، ولا وراط، ولا شغار، ولا شناق ولا جلب، ولا جنب، ولا شناق، وعلیهم العون لسرایا المسلمین وعلی کل عشرة ما تحمل العراب من اجبی فقد اربی.)) (طبقات ابن سعد:۳/۳۲۷)

[illegible]

[illegible]

"هذا كتاب من محمد النبي لوائل بن حجر قيل حضر [illegible] وذلك لك [illegible] سلمت وجعلت لك ما في يديك من

⓫ [illegible] ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے [illegible] زکوٰۃ سے بچنے کے لیے مجتمع کریں، مثلاً چالیس بکریوں سے ایک سو بیس [illegible] کے پاس جدا جدا چالیس چالیس بکریاں ہیں تو [illegible] جب دونوں کو ایک جا جمع کر کے صرف ایک بکری [illegible] ہے۔ دوسرا لفظ ''وراط'' ہے۔ وراط زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنے کچھ مویشیوں کو چھپانا ہے [illegible] کے بارے میں غلط بیانی کرنا کہ فلاں صاحب نصاب ہے اور [illegible] صاحب نصاب نہ ہو۔ تیسرا لفظ شناق اور شغار ہے۔ زکوٰۃ کے خوف سے اپنے جانوروں کو دوسرے شخص کے جانوروں میں ملا دینا، مثلاً اپنے پانچ اونٹ ایک بکری دینے کے خوف سے دوسروں کے پچیس اونٹوں میں شامل کر [illegible] لیے کہ پچیس اور تیس اونٹوں کی زکوٰۃ ایک ہی ہے۔ چوتھا لفظ ''جلب'' عامل یعنی تحصیل دار کا مقام تحصیل زکوٰۃ سے چند میل دور پڑاؤ ڈال کر اصحاب زکوٰۃ کو وہاں تک آنے پر مجبور کرنا اور ''جنب'' کا مطلب ہے کہ اصحاب زکوٰۃ کا اپنے مویشیوں کو عامل کے خوف سے چند میل دور لے جانا اور عامل کے لیے وصول زکوٰۃ میں پریشانی پیدا کرنا ہے۔ یہ دونوں چیزیں بھی ناجائز ہیں۔

الارضين والحصون، وانه یوخذ منك من كل عشرة واحدة ینظر فی ذالك ذوا عدل وجعلت لك ان لا تظلم فیها ما قام الدین والنبی والمومنون علیه انصار .))

"یہ خط ہے اللہ کے نبی محمد (ﷺ) کی جانب سے وائل بن حجر سردار حضرموت کے نام، چونکہ تم مسلمان ہوگئے ہو اس لیے میں تمھارے تمام مقبوضات یعنی زمینیں اور قلعے تمھاری ہی ملکیت میں چھوڑتا ہوں۔ تم ان سب کے مالک ہو البتہ تم کو پیداوار کا عشر دینا ہوگا اور دو منصف اس کا فیصلہ کیا کریں گے اور ہم اس کا انتظام کر دیں گے کہ تم پر تا قیام دین کسی قسم کا کوئی ظلم نہ ہوگا اور نبی اور مومنین اس معاملہ میں تمھارے مددگار رہوں گے۔"

اس نامۂ مبارک پر اپنی مہر لگا کر آپ ﷺ نے سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو مدد کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ اونٹنی پر سوار تھے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پیادہ پا چل رہے تھے۔ چلتے چلتے جب گرمی کی شدت سے سیدنا معاویہؓ کو زیادہ تکلیف ہونے لگی تو آپ نے سیدنا وائل رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھ کو اپنے پیچھے اونٹنی پر بٹھا لیجیے۔ سیدنا وائل رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تم بادشاہوں کے برابر بیٹھنے کے لائق نہیں ہو۔ سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ یہ بھی قریش کے سردار ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہے۔ سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا اپنی جوتیاں ہی مرحمت فرما دیجیے کہ زمین کی گرمی کی شدت سے محفوظ ہو جاؤں۔ سیدنا وائل رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اونٹنی کے سایہ میں چلتے رہو۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے کہ اونٹنی کا سایہ اس گرمی کے لیے کافی نہیں ہے۔

حسن اتفاق سے قبول اسلام کے کچھ عرصہ بعد ہی سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ حضرموت کو خیرباد کہہ کر کوفہ میں آباد ہوگئے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور تک زندہ رہے۔ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے ان کا بہت اکرام واحترام کیا اور سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کو اپنے برابر مسند پر بٹھایا۔ دوران گفتگو میں اس واقعہ کا تذکرہ بھی آ گیا

جوان کے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان حضرموت کی راہ میں پیش آیا تھا۔ سیدنا وائل رضی اللہ عنہ اس واقعہ کو یاد کر کے بہت افسوس کرنے لگے کہ اس روز میں نے کیوں ان کو اپنے پیچھے اونٹ پر نہ بٹھایا۔

مختصر یہ کہ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے حضرموت کی شاہی کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو اپنا طغرائے امتیاز بنایا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں داخل ہو گئے۔

نامۂ مبارک بنام شاہان حمیر:

یمن کے جنوبی حصہ پر جو حکومت قائم تھی وہ حمیر کے نام سے موسوم تھی۔ (معجم البلدان، ارض القرآن) ''حمیر'' حمرہ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کا مطلب سرخ رنگ ہے۔ عرب اقوام حبش کو ''سودان'' یعنی سیاہ کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں نے اس عربی قوم کو حمیر یعنی گوری رنگ کی قوم کہنا شروع کر دیا ہوگا۔ حمیر تقریباً ڈیڑھ صدی قبل مسیح سے مغربی یمن میں آئے اور پھر اطراف و جوانب تمام عرب پر قابض ہو گئے۔ حمیر کی سلطنت صدیوں تک ایک عظیم الشان سلطنت رہی ہے مگر بعد میں مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر اسلام سے کچھ پہلے معمولی ریاستوں کی شکل میں باقی رہ گئی۔ انھی بادشاہوں کی اولاد میں حارث اور شریح پسران عبد کلال، اور ہمدان، معافر اور نعمان روسائے حمیر تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہزادوں کے پاس بھی اسلام کا پیغام بھیجا اور سیدنا عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی رضی اللہ عنہ کو اس سفارت کا شرف عطا فرمایا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ تبوک سے واپسی پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہان حمیر کا خط ملا جس میں انھوں نے اسلام کا اعلان کیا تھا اور یہ اعلان کرنے والے تھے حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور نعمان والی ذی رعین، ہمدان اور معافر، اسی طرح زرعہ ذی یزن نے مالک بن مرہ رہاوی کے اسلام کا بھی اعلان کیا تھا۔ ان سب نے شرک اور مشرکین سے علیحدگی کا بھی اعلان کیا تھا۔ چنانچہ آپ ؐ نے انھیں لکھا:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى الْحَارِثِ ابْنِ عَبْدِ كُلَالٍ وَنُعَيْمِ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ وَالنُّعْمَانِ قَيْلِ ذِیْ

رُعَيْنٍ وَهَمْدَانَ وَمَعَافِرْ ، أَمَّا بَعْدَ ذٰلِكُمْ: فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكُمُ اللّٰهَ الَّذِي لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ، أَمَّابَعْدَا! فَإِنَّهُ قَدْ وَقَعَ بِنَا رَسُوْلُكُمْ مَقْفَلَنَا مِنْ أَرْضِ الرُّوْمِ فَلَقِيْنَا بِالْمَدِيْنَةِ فَبَلَّغَ مَا أَرْسَلْتُمْ بِهٖ وَخَبَّرَ مَا قَبْلَكُمْ وَأَنْبَأَنَا بِإِسْلَامِكُمْ وَقَتْلِكُمُ الْمُشْرِكِيْنَ وَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ هَدَاكُمْ بِهِدَايَتِهٖ إِنْ أَصْلَحْتُمْ وَأَطَعْتُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَأَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَأَعْطَيْتُمْ مِنَ الْمَغَانِمِ خُمُسَ اللّٰهِ وَسَهْمَ نَبِيِّهٖ وَصَفِيِّهٖ وَمَا كَتَبَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الصَّدَقَةِ مِنَ الْعِقَارِ عُشْرُ مَا سَقَتِ الْعَيْنُ وَمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَكُلُّ مَا سُقِيَ بِالْغَرْبِ نِصْفُ الْعُشْرِ وَفِي الْإِبِلِ فِي الْأَرْبَعِيْنَ ابْنَةُ لَبُوْنٍ ، وَفِي ثَلَاثِيْنَ مِنَ الْإِبِلِ ابْنُ لَبُوْنٍ ذَكَرٌ ، وَفِيْ كُلِّ خَمْسٍ مِنَ الْإِبِلِ شَاةٌ وَفِيْ كُلِّ عَشْرٍ مِنَ الْإِبِلِ شَاتَانِ .

وَفِيْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مِنَ الْبَقَرِ بَقَرَةٌ وَفِيْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ مِنَ الْبَقَرِ تَبِيْعٌ: جَذَعٌ أَوْ جَذَعَةٌ ، وَفِيْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مِنَ الْغَنَمِ سَائِمَةً وَحْدَهَا شَاةٌ وَإِنَّهَا فَرِيْضَةُ اللّٰهِ الَّتِيْ فَرَضَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَةِ ، فَمَنْ زَادَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ، وَمَنْ أَدّٰى ذٰلِكَ وَأَشْهَدَ عَلٰى إِسْلَامِهٖ وَظَاهَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ فَإِنَّهٗ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَهٗ مَا لَهُمْ وَعَلَيْهِ مَا عَلَيْهِمْ وَلَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ .

وَإِنَّهُ مَنْ أَسْلَمَ مِنْ يَهُوْدِيٍّ أَوْ نَصْرَانِيٍّ فَإِنَّ لَهٗ مِثْلَ مَا لَهُمْ وَعَلَيْهِ مِثْلَ مَا عَلَيْهِمْ ، وَمَنْ كَانَ عَلٰى يَهُوْدِيَّتِهٖ أَوْ نَصْرَانِيَّتِهٖ فَإِنَّهٗ لَا يُفْتَنُ عَنْهَا وَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ عَلٰى كُلِّ حَالِ ذَكَرًا أَوْ أُنْثٰى حُرٍّ أَوْ عَبْدٍ دِيْنَارٌ وَافٍ أَوْ قِيْمَتُهٗ مِنَ الْمَعَافِرِ أَوْ عِوَضُهٗ ثِيَابًا ، فَمَنْ أَدّٰى ذٰلِكَ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ فَإِنَّ لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ وَمَنْ مَنَعَهٗ فَإِنَّهٗ عَدُوٌّ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ .

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ مُحَمَّدً النَّبِيُّ أَرْسَلَ إِلٰى زُرْعَةَ ذِي يَزَنْ: أَنْ إِذَا أَتَتْكُمْ رُسُلِي فَأُوْصِيكُمْ بِهِمْ خَيْرًا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَعَبْدُاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ وَمَالِكُ بْنُ عُبَادَةَ وَعُقْبَةُ بْنُ نَمِرٍ وَ مَالِكِ بْنِ مُرَّةَ وَاصْحَابُهُمْ وَأَنْ اَجْمَعُوْا مَا عِنْدَكُمْ مِنَ الصَّدَقَةِ وَالْجِزْيَةِ مِنْ مَخَالِيْفِكُمْ وَابْلِغُوْهَا رُسُلِي وَأَنَّ اَمِيرَهُمْ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ فَلَا يَنْقَلِبَنَّ إِلَّا رَاضِيًا.

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ مُحَمَّدًا يَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّهُ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ: ثُمَّ أَنَّ مَالِكَ بْنَ مُرَّةَ الرَّهَاوِيَ قَدْ حَدَّثَنِي أَنَّكَ قَدْ أَسْلَمْتَ مِنْ أَوَّلِ حِمْيَرَ وَقَتَلْتَ الْمُشْرِكِيْنَ، فَأَبْشِرْ بِخَيْرٍ وَآمُرُكَ بِحِمْيَرَ خَيْرًا، وَلَا تَخُوْنُوْا وَلَا تَخَاذَلُوْا، فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ مَوْلٰى غَنِيِّكُمْ وَفَقِيْرِكُمْ.

وَإِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِأَهْلِهِ إِنَّمَا هِيَ زَكَاةٌ يُتَزَكّٰى بِهَا عَلٰى فُقَرَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَبْنَاءِ السَّبِيْلِ، وَإِنَّ مَالِكًا قَدْ بَلَّغَ الْخَبَرَ وَحَفِظَ الْغَيْبَ وَآمُرُكُمْ بِهِ خَيْرًا، وَإِنِّي قَدْ بَعَثْتُ إِلَيْكُمْ مِنْ صَالِحِي أَهْلِي وَأُوْلِي دِيْنِهِمْ وَأُوْلِي عِلْمِهِمْ فَآمُرُكُمْ بِهِمْ خَيْرًا فَإِنَّهُمْ مَنْظُوْرٌ إِلَيْهِمْ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، وَبَرَكَاتُهُ.))

''شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ محمد (ﷺ) کی جانب سے جو اللہ کے نبی اور رسول ہیں، حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور والی ذی رعین نعمان اور ہمدان اور معافر کے نام۔ اس کے بعد میں اب تمھارے سامنے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ لوگوں کا قاصد ہمارے پاس پہنچا جب کہ ہم سرزمین روم سے واپس آئے تھے، وہ ہمیں مدینہ میں ملا، اس نے تمھارا پیغام اور حالات ہمیں پہنچا دیئے ہیں، اس نے ہمیں

بتایا ہے کہ آپ لوگ مسلمان ہوگئے ہیں اور مشرکین کو قتل کیا ہے۔ اللہ نے اپنی ہدایت سے آپ کو راہ راست پر ڈالا ہے۔ اگر آپ لوگ اصلاحی روش پر چلے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی، نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کرتے رہے، مال غنیمت میں سے اللہ اور اس کے برگزیدہ رسولؐ کا پانچواں حصہ ادا کیا اور جو صدقات مسلمانوں پر فرض ہیں ادا کیے۔ جو زمین چشموں سے سیراب ہو یا آسمانی بارش سے سیراب ہو اس کی پیداوار پر عشر ہے۔ جو زمین کنویں سے پانی نکال کر سیراب ہو اس کی پیداوار پر نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہے۔ اونٹوں کی زکوٰۃ یہ ہے کہ چالیس اونٹوں پر دو سالہ اونٹنی ہوگی۔ تیس اونٹ ہوں تو دو سالہ اونٹ دینا ہوگا۔ پانچ اونٹ ہوں تو ان پر ایک بکری ہوگی اور ہر دس اونٹوں پر دو بکریاں ہوں گی، اگر چالیس گائیں ہوں تو ان کی زکوٰۃ ایک گائے ہے۔ تیس گائیں ہوں تو ایک سال کا بچھڑا (مذکر یا مونث) چراگاہ میں چرنے والی اگر چالیس بھیڑ بکریاں ہوں تو ایک بکری واجب ہوگی اور یہ ہے اللہ کا فریضہ جو اس نے صدقات کے سلسلہ میں مومنوں پر عائد کیا ہے، اگر کوئی زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے، جس نے یہ فریضہ ادا کیا، اپنے اسلام پر شہادت قائم کی اور مشرکین کے خلاف مومنین کی مدد کی تو وہ اہل ایمان میں شامل ہوگیا۔ اس کے حقوق وفرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اگر کوئی یہودی یا نصرانی مسلمان ہو جائے تو اس کے حقوق وفرائض بھی وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ جو شخص یہودیت یا نصرانیت پر قائم رہنا چاہے تو اسے فریفتہ کر کے اپنے مذہب سے نہیں ہٹایا جائے گا۔ اسے جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ ہر بالغ مرد، عورت، آزاد اور غلام پر ایک پورا دینار یا اس کی قیمت کے برابر معافر کے بنے ہوئے کپڑے یا اس کے علاوہ کپڑے جو معاوضہ بن سکتے ہوں، تو جس نے یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ادا کر دیں، اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ اور تحفظ حاصل ہوگا، اور جس

نے اس سے انکار کیا تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن ہے۔"

"اس کے بعد اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ نے زرعہ بن ذی یزن کے نام پیغام بھیجا ہے کہ اگر تمھارے پاس میرے قاصد آئیں تو ان کے بارے میں تمھیں نیکی اور بھلائی کی وصیت کرتا ہوں اور وہ ہیں معاذ بن جبل، عبداللہ بن زید، مالک بن عبادہ، عقبہ بن نمر، مالک بن مرہ رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھی۔ تمھارے پاس جو مال زکوۃ ہے وہ جمع کر لو اور اپنے علاقوں سے جزیہ وصول کر کے میرے قاصدوں کے پاس پہنچا دو اور ان کے امیر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ انھیں تمھارے ہاں سے مطمئن ہو کر لوٹنا چاہیے۔ اس کے بعد محمد ﷺ گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ وہ اس کے بندے اور رسول ﷺ ہیں پھر یہ کہ مالک بن مرہ رہاوی نے مجھے بتایا ہے کہ تو حمیر میں سے سب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوا ہے اور مشرکین کو قتل کیا ہے تجھے بھلائی کی بشارت ہو۔ میں تجھے قوم حمیر کے ساتھ بھلائی کا حکم دیتا ہوں۔ خیانت نہ کرنا، ساتھ نہ چھوڑنا کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ تم میں سے ہر امیر وغریب کے والی ہیں۔"

"محمد ﷺ اور ان کے اہل بیت کے لیے صدقات حلال نہیں ہیں۔ یہ تو زکوۃ ہے جو غریب اور بے وطن لوگوں کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ مالک نے بات پہنچا دی ہے۔ امانت سے کام لیا ہے۔ میں تمھیں اس کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہوں۔"

"میں نے تمھارے پاس اپنے صالح ساتھیوں کو بھیجا ہے جو دین دار بھی ہیں اور صاحب علم بھی۔ تمھیں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہوں کیونکہ یہ قابل لحاظ واحترام ہیں۔ تم پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔"

(سیرۃ ابن ہشام: ۲/ ۳۸، سیرۃ حلبیہ: ۲/ ۳۵۱، فتوح البلدان: ۷۷، طبری: ۳/ ۱۰۳، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/ ۵۳)

طبقات ابن سعد میں نامہ مبارک کی جو عبارت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

((سلام انتم ما امنتم بالله ورسوله، وان الله وحده لا شريك له، بعث موسى باياته وخلق عيسى بكلماته، قالت اليهود عزير ابن الله، وقالت النصارى الله ثالث ثلاثه عيسى ابن الله .)) (طبقات ابن سعد: ۳/۳۲۷)

"تم پر اس وقت تک سلامتی ہو جب تک تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو، بے شک حق تعالیٰ شانہ وہ ذات ہے جو یکتا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانیاں دے کر بھیجا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلمہ سے پیدا کیا مگر یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام تین میں سے ایک ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں۔" (العیاذ باللہ)

سرکار دو عالم ﷺ نے یہ نامہ مبارک سیدنا عیاش رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جب تم یمن کے اس حصہ میں پہنچ جاؤ جو تمھاری منزل ہے اور رات ہو جائے تو کسی جگہ قیام کر لینا اور ان کے پاس رات کے وقت نہ جانا، صبح ہو جائے تو اٹھ کر وضو کرنا اور دو رکعت نماز پڑھ کر بارگاہ الوہیت میں کامیابی و کامرانی کی دعا کرنا اور جب میرا یہ خط ان سرداروں کے پاس لے جاؤ تو اپنے داہنے ہاتھ سے ان کے داہنے ہاتھ میں یہ خط دینا۔ ان شاء اللہ وہ اس کو قبول کریں گے اور اگر گفت و شنید کی نوبت آئے تو پہلے سورۃ لم یکن اللہ کفروا تلاوت کرنا اور پھر آمنت بمحمد وانا اول المسلمین پڑھ کر ان سے ہم کلام ہونا۔ اس کے بعد وہ نہ کسی دلیل میں کامیاب ہوسکیں گے اور نہ حق کے مقابلہ میں کوئی تحریر پیش کر سکیں گے۔ وہ اگر اپنی زبان میں ایسی تقریر کریں جو تم نہ سمجھ سکو تو ان سے کہنا کہ ترجمان سے ترجمہ کراؤ اور یہ دعا پڑھنا:

((قل حسبی الله امنت بما انزل الله من كتاب وامرت لاعدل بينكم الله ربنا وربكم، لنا اعمالنا ولكم اعمالكم، لا حجة بيننا وبينكم الله يجمع بيننا واليه المصير .))

پس اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان سے کہنا کہ وہ لکڑیاں کہاں ہیں جن کو دیکھ کر تم

لوگ سجدہ میں گر جاتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تین لکڑیاں تھیں جو صلیب کی شکل میں تھیں، ایک جھاؤ کی تھی جس پر سفید روغن چڑھا ہوا تھا۔ دوسری آبنوس کی لکڑی تھی اور تیسری ایک گرہ دار لکڑی تھی جس کو عربی میں خیزران کہتے ہیں۔ اگر وہ لکڑیاں تم کو مل جائیں تو تم ان کو عام لوگوں کے سامنے جلا دینا۔

سیدنا عیاش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب منزل مقصود پر پہنچا تو مجھے ایک عالی شان محل میں لے جایا گیا۔ تین ڈیوڑھیاں طے کر کے سراپردہ تک پہنچا اور پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو ایوان میں لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیر ہوں۔ یہ کہہ کر نامہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق ان کے سپرد کر دیا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جو ہدایات دی تھیں اس کے مطابق عمل کرتا رہا۔ سرداران قریش نے والا نامہ غور سے سنا اور خوشی اور مسرت کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ میں نے حسب ہدایت نبوی تین لکڑیاں طلب کیں اور انھیں برسر بازار رکھ کر جلا دیا اور نہایت عزت و کامیابی کے ساتھ واپس آ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمام واقعہ بیان کر دیا۔

بعض روایات میں ہے شاہان حمیر نے جب اسلام قبول کر لیا تو اپنے قبول اسلام کی اطلاع کے لیے بارگاہ رسالت میں اپنا ایک وفد بھیجا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبول اسلام پر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا اور وفد کو اکرام و احترام کے ساتھ نوازا اور اسی وقت شاہان حمیر کے لیے چند نصیحتوں پر مشتمل ایک نامۂ مبارک تحریر فرمایا اور وفد کو نہایت عزت و احترام سے روانہ کیا۔

نامۂ مبارک بنام امرائے بنی وائل:

بکر بن وائل ایک قبیلہ کا نام ہے۔ قریش میں یہ سب سے بڑا قبیلہ ہے جس نے ہمسایہ حکومتوں کے مقابلہ میں وطنی استقلال کی بنیاد ڈالی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کو بھی دعوت اسلام کے سلسلہ میں نامہ مبارک تحریر فرمایا اور سیدنا ظبیان بن مرثد رضی اللہ عنہ کو اس کی سفارت کا شرف مرحمت فرمایا۔ اس نامہ مبارک کا خلاصہ یہ ہے:

اما بعد! فاسلموا تسلموا.

''بعد حمد وصلوٰۃ اسلام لے آؤ محفوظ رہو گے۔''

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے نامہائے مبارک میں ہر ایک بادشاہ کو یہ توجہ دلائی ہے کہ ((اسلم تسلم)) ''اسلام قبول کرلے محفوظ رہے گا'' یہ دین ودنیا دونوں کی سلامتی کی طرف اشارہ تھا۔ کاش کہ وہ سمجھتے کہ دامن اسلام میں دین ودنیا دونوں کی سلامتی ہے اور جس دنیا کی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے ہم اسلام قبول نہیں کررہے اسلام اس کے قائم رہنے کی بھی ضمانت دیتا ہے۔ یہ بات مختلف بادشاہوں کو کوئی عام آدمی نہیں لکھتا تھا بلکہ یہ اس آدمی کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات تھے جو دولت خداوندی کا قاسم تھا اور جس کے بارے میں خود حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰىٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى ۝﴾ اور ''گفتہ او گفتہ اللہ بود'' جس کی شان تھی۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی بیّن شہادت دیتے ہیں کہ خسرو پرویز نے جب سرکار دو عالم ﷺ کے نامہ مبارک کو پھاڑا تھا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کی اس گستاخی کا جواب مسلمانوں کے ہاتھوں سے تو بعد میں دیا، پہلے اس کے بیٹے کے ہاتھ سے دلایا کہ اس نے خسرو پرویز کو قتل کر دیا اور پھر وہ شیرویہ خود اپنے کردار کی بدولت فنا کی نیند سو گیا اور عرق مقوی کے شوق میں زہر ہلاہل کی شیشی پی کر اس دنیوی جاہ وحشم کو جس پر اس کو بڑا ناز تھا اور جس کی خاطر اس نے اپنے باپ کو قتل کیا، ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گیا۔ پھر دخت پوران کی نسوانی نزاکت حکومت کے بارِ عظیم کو برداشت نہ کرسکی اور آخر کار یزدگرد کی ظالمانہ اور عیاشانہ حکومت نے ایک طرف رعایا کو بددل کردیا اور دوسری طرف وہ اپنے وزیر دفاع رستم کے سمجھانے کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ بے جا چپقلش پر آمادہ ہوگیا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کے بارے میں سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا: ((اسلم تسلم)) وہ اسلام نہ لایا اور سلامتی نہ پاسکا۔

قیصر روم ہرقل اور شاہ دمشق حارث نے باوجود یہ سمجھ لینے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول ہیں، پھر بھی اپنے گھوڑوں کی نعل بندی کرانی شروع کر دی اور تباہی اور بربادی کی طرف اپنی قوم کو لے گئے اور اس کلمۂ حق کو مٹانے کے لیے ہزاروں لاکھوں

انسانوں کو جمع کر کے مسلمانوں کے مقابلہ میں لے آئے لیکن سب لوگوں نے لسان نبوت سے ایک روز سن لیا کہ ((اذا هلك قیصر فلا قیصر بعد)) ''یعنی جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر تخت روم پر کوئی قیصر نہیں آئے گا۔'' اور ایسا ہی ہوا اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو کبھی رسوا نہیں ہونے دیتے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی رد نہیں کرتے۔ مقوقس عزیز مصر سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول کی تصدیق کے باوجود بھی قیصر کے حکم سے نبرد آزمائی کے لیے مسلمانوں کو ((هل من مبارز)) کی دعوت دی جائے۔ مسلمان تو اس سے جنگ کرنے نہیں گئے تھے۔ پیغام تو اس کا اور اس کے شہنشاہ کا پہنچا تھا کہ ہم وہ قوت رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ جنگ و پیکار کی یہ زندگی خود اس کی اپنی طبیعت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ قیصر کے حکم کی تعمیل تھی، اس لیے مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی اور مسلمانوں کی کریمانہ سخاوت اور منتقمانہ جذبات سے بالاتر ترحم نے اس کو اپنی چند روزہ زندگی عزت سے گزارنے کا موقع دے دیا۔ تاہم سرکار دو عالم ﷺ کی پیغمبرانہ پیشگوئی ''بادملكه'' (اس کی حکومت تباہ ہوگئی) اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہی۔

تاریخ تو یہ بھی بتاتی ہے کہ ان بادشاہوں کے قبول اسلام سے انکار اور نہ صرف انکار بلکہ نامہ مبارک یا سفارت کاروں کی توہین و تحقیر کے باوجود مسلمانوں نے اپنی جانب سے کبھی اقدام جنگ نہیں کیا اور اگر خود ان سلاطین نے بھی انتہائی غیظ و غضب میں جنگ کا اقدام کرنا چاہا ہے تو بھی نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے ہر ممکن طریقہ سے اس کو ٹالا ہے اور آشتی اور صلح کی راہ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ کیا تاریخ کا یہ واقعہ فراموش کر دیا جائے گا کہ جب قیصر روم کے دربار سے رسول اکرم ﷺ کا سفیر واپس آ گیا تو قیصر روم، عزیز مصر اور شاہ دمشق سب نے متفق ہو کر صلیبی جہاد کا اعلان کر دیا اور تمام قلمرو حکومت میں نقیب دوڑا دیئے اور شام کے علاقہ میں کئی لاکھ رومیوں کا لشکر مسلمانوں کے استیصال کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ اہل اسلام کو یہ تمام خبریں پہنچ رہی تھیں اور حارث غسانی نے خود سرور کائنات ﷺ کو یہ کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں جو کچھ تیاریاں میں کر رہا ہوں، ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور

جا کر اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کو بتا دے لیکن پھر بھی مسلمان خاموش بیٹھے رہے اور انھوں نے دفاعی کارروائی کا بھی اس وقت تک ارادہ نہ کیا جب تک کہ ان کو جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع نہ مل گئی کہ رومی تبوک کے میدان کو ''میدان جنگ'' بنا رہے ہیں اور قوی امکان ہے کہ دو چار روز میں پیش قدمی کر کے مدینہ منورہ کے قریب ہی کی جگہ پر قابض ہو جائیں۔ اب مسلمان مجبور ہو گئے اور انھوں نے تبوک کی طرف پیش قدمی کر دی تا کہ مدینہ کو میدانِ جنگ نہ بنایا جائے۔

جب مجاہدین اسلام کا لشکر گرمی اور بھوک کی شدت اور سامان جنگ کی قلت کے باعث بے سروسامانی کی تکلیف اور وطن سے کوسوں دور مسافرانہ حالت میں سخت صعوبتیں برداشت کر کے تبوک تک پہنچ گیا تو حریف فوج کا لشکر جانباز مجاہدین سے مرعوب ہو کر منتشر ہو گیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے عیسائیوں کے علاقوں میں پیش قدمی نہیں کی تا کہ ان کی قوتوں کو ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ آپؐ رحمۃ للعالمین بھی تھے۔ اس وقت آپؐ کی یہ صفت سامنے آئی چنانچہ لشکر اسلام کو حکم ہو گیا کہ جب دشمن جنگ سے گریز کر گیا ہے تو ہم کو بھی درگزر کرنا چاہیے اور بغیر کچھ کیے واپس ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ہمارا مقصد ملک گیری کی ہوس نہیں، صرف فتنہ انگیزیوں کی روک تھام اور ان کا انسداد مطلوب ہے، لہٰذا اگر اس وقت حریف اپنی فتنہ پردازی سے باز آ گیا ہے تو تم بھی درگزر اور صلح و آشتی کے ساتھ واپس چلو۔

اس جملہ ((اسلم تسلم)) میں اس حقیقت کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ اسلام وہ دین فطرت ہے کہ اس کی بنیاد ہی سلامتی اور امن پر قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام امن و سلامتی کا بہترین وثیقہ اور آخری سند ہے۔ اس لیے اس دین کا نام بھی ''اسلام'' رکھا گیا جس کا مادہ ''سلم'' یعنی سلامتی ہے لہٰذا اگر تم نے ایسے دین کو قبول کر لیا اور اس کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تو پھر دین و دنیا کی سلامتی ہمارے حصہ میں آ جائے گی اور ہر قسم کے فتنہ و فساد کی بنیادیں صرف اس ایک نام ہی سے نہ صرف متزلزل ہو جائیں گی بلکہ ان کی بیخ و بن بھی باقی نہ رہے گی۔

نامۂ مبارک بنام نہشل بن مالک:

اسی سلسلہ میں سرور کائنات ﷺ نے بنی وائل میں سے نہشل بن مالک سردار قبیلہ کے نام بھی دعوت اسلام کا خط ارسال فرمایا، اور آپ ﷺ کے حکم سے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ عفان رضی اللہ عنہ نے ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد ان کو امان دیئے جانے کا تذکرہ تھا۔ آپ ﷺ کے نامہ مبارک کا مضمون یہ ہے:

((هذا كتاب من محمد رسول الله لنهشل بن مالك ومن معه من بني وائل لمن اسلم و اقام الصلوة واتى الزكوة واطاع الله ورسوله واعطى من المغنم خمسه الله وسهم النبي واشهد على اسلامه وفارق المشركين فانه امن بامان الله و برى اليه محمد من الظلم))

"یہ نامہ اللہ کے رسول (ﷺ) محمد کی طرف سے نہشل بن مالک وائل اور بنی وائل کے ان لوگوں کے نام ہے جو حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں اور مال غنیمت میں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حصہ (خمس) نکالتے ہیں اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہیں اور مشرکین سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں، پس وہ اللہ کی امان میں مامون ہیں اور محمد ﷺ ان پر ہر قسم کے ظلم سے بری ہیں۔"

نامۂ مبارک بنام بنی زہیر:

ایک روز مطرف کے ساتھ ابو العلا کہتا ہے کہ میں اونٹوں کی مارکیٹ میں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے ایک اعرابی کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا ہے اور وہ کہتا جاتا ہے کہ کیا تم میں سے کوئی شخص پڑھا لکھا ہے؟ میں اس کی یہ آواز سن کر آگے بڑھا اور اس سے کہا کہ میں پڑھا لکھا ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو؟ اس اعرابی نے چمڑے کا وہ ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ لیجئے، یہ محمد ﷺ کا نامہ مبارک ہے جو ہمارے نام آیا ہے،

اس کو پڑھ کر سنا دیجئے۔ میں نے وہ نامہ مبارک اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں لکھا تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم ، من محمد النبی لزهير بن اقيش ، حی من عكل ، انهم ان شهدوا ان لا اله الا الله ، وان محمدا رسول الله ، وفارقوا المشركين ، واقروا بالخمس فی غنائمهم وسهم النبی ، فانهم آمنون بامان الله ورسوله .))

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ خط ہے اللہ کے نبی محمد (ﷺ) کی جانب سے بنی زہیر بن اقیش کے نام جو قبیلہ عکل کی ایک شاخ ہے۔ اگر یہ لوگ لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور مشرکین سے بیزار ہیں اور مال غنیمت میں سے اللہ کے نبی کا حصہ تسلیم کرتے ہیں پس وہ اللہ اور اس کے رسول کی امان میں محفوظ ہیں۔''

لوگوں نے نامۂ مبارک کا مضمون سننے کے بعد اس اعرابی کو گھیر لیا اور اس سے دریافت کرنے لگے کہ کیا تم نے سرور کائنات ﷺ سے کوئی حدیث سنی ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، لوگوں نے کہا کہ اللہ تم پر رحم فرمائے ہم کو بھی وہ حدیث سنائیں۔ اعرابی نے کہا:

((سمعته يقول: من سرّه ان تذهب كثير من وحر الصدر فليصم شهر الصبر وثلاثة ايام من كل شهر .))

''میں نے آپ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو شخص سینہ کی آگ فرو کرنا چاہتا ہے اس کو چاہیے کہ رمضان کے روزے اور ہر ماہ میں ''ایام بیض'' کے تین روزے رکھے۔''

لوگوں نے ان سے پھر دریافت کیا: کیا واقعی تم نے سرور کائنات ﷺ کو یہ حدیث ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے؟ یہ سن کر وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں اب کبھی تم سے کلام نہیں کروں گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرور کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف

بہ سلام ہو چکے تھے اور ان کے اسلام لانے اور وطن واپس ہو جانے کے بعد تمام قوم کے نام رسول اللہ ﷺ نے یہ امان نامہ تحریر فرمایا تھا۔

نامۂ مبارک بنام نصاریٰ نجران:

نجران یمن کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں کے عیسائیوں کے نام سرکار دو عالم ﷺ نے ایک نامۂ مبارک لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اِلٰهِ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اَمَّا بَعْدُ، فَاِنِّي اَدْعُوْكُمْ اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ وَاَدْعُوْكُمْ اِلٰى وِلَايَةِ اللّٰهِ مِنْ وِّلَايَةِ الْعِبَادِ، فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَالْجِزْيَةُ، فَاِنْ اَبَيْتُمْ فَقَدْ آذَنْتُكُمْ بِحَرْبِ الْاِسْلَامِ.))

”شروع اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے جو ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کا معبود ہے۔ امابعد! میں تمھیں بندوں کی بندگی اور عبادت کے بجائے اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور بندوں کی ولایت اور سرپرستی کے بجائے اللہ کی ولایت وسرپرستی کی دعوت دیتا ہوں، اگر تم انکار کرو گے تو پھر تمھیں جزیہ دینا ہوگا اور اگر اس سے بھی انکار کرو گے تو پھر میں تمھیں اسلام سے جنگ کا الٹی میٹم دیتا ہوں۔“ (صبح الاعشیٰ:۶/۳۸۰؛ جمہرۃ رسائل العرب:۱/۷۹)

شاید اسی خط کے جواب میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا ۹ ہجری میں مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ ان ساٹھ افراد میں سے ۲۴ افراد اشراف میں سے تھے۔ رئیس الوفد عبدالمسیح عاقب تھا۔ دوسرا شخص ایہم بن شرحبیل تھا جو ثقافتی اور سیاسی امور کا نگران تھا اور تیسرا ان کا لاٹ پادری اور روحانی پیشوا ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔ شاہان روم ابو حارثہ کی بڑی عزت وتکریم کرتے تھے اور اس کو بڑی بڑی جاگیریں دے رکھی تھیں۔ یہ تینوں آدمی اہل نجران کے سرکردہ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کو مسجد نبویؐ میں اتارا۔ انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ مختلف امور پر بات چیت کی۔ انھوں نے الوہیت اور ابنیت مسیح پر بھی آپ ﷺ سے گفتگو

کی۔ آپؐ نے ان کے مسکت جوابات دیئے۔ لیکن وہ حق واضح ہونے کے باوجود بھی ایمان نہ لائے۔ آپ ﷺ نے ان کو دن بھر غور و فکر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جب اگلی صبح ہوئی تو آپؐ نے پھر ان پر اسلام پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی مسلمان ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا یہ اسلام کیا ہے جب کہ تم خدا کے لیے بیٹے تجویز کرتے ہو، صلیب کی پرستش کرتے ہو، خنزیر کھاتے ہو؟'' اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر آپؐ نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی جس کو انھوں نے قبول نہ کیا۔ آخر کار انھوں نے باہمی مشورہ سے یہ فیصلہ کیا کہ سرکار دو عالم ﷺ کو اپنے بارے میں حکم بنایا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے جزیہ لینا منظور فرمالیا اور ایک معاہدہ تحریر ہوا جس میں تھا کہ:

- اہل نجران سالانہ دو ہزار جوڑے ادا کریں گے۔ ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں۔ ہر جوڑے کی قیمت ایک اوقیہ چاندی (۱۵۲ گرام چاندی) ہوگی۔
- اہل نجران پر آپؐ کے قاصد کی ایک ماہ کی مہمانی ضروری ہوگی۔
- یمن میں اگر کوئی شورش اٹھ کھڑی ہوئی تو اہل نجران پر تیس زرہیں اور تیس گھوڑے اور تیس اونٹ عاریتاً دینے لازم ہوں گے جو بعد میں واپس کر دیئے جائیں گے۔
- اللہ اور اس کا رسول ﷺ (یعنی اسلامی اسٹیٹ) ان کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔
- جو شخص سود کھائے گا تو میں اس سے بری الذمہ ہوں۔
- اگر کوئی شخص ظلم اور تعدّی کرے گا تو اس کے بدلہ میں دوسرا شخص ماخوذ نہ ہوگا۔

سیدنا ابوسفیان بن حرب، سیدنا غیلان بن عمرو، سیدنا مالک بن عوف، سیدنا اقرع بن حابس، اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے اس عہد نامہ پر اپنے شہادتی دستخط کیے۔

(زرقانی: ۴/۴۳، زادالمعاد: ۳/۴۱، فتح الباری: ۸/۹۴)

اس کے بعد ان میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور ان کا سردار ایہم اور عبدالمسیح عاقب واپس جا کر مسلمان ہوگئے اور پھر مدینہ طیبہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان دونوں کو سیدنا ابوایوب انصاریؓ کے مکان پر ٹھہرایا۔ لاٹ پادری ابوحارث کا چچا زاد بھائی کرز

بن علقمہ بھی چند روز کے بعد مسلمان ہو گیا۔ پھر سرکار دو عالم ﷺ نے صدقات اور جزیہ لانے کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے ہاں روانہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ صدقہ مسلمانوں ہی سے لیا جاتا ہے۔

نامۂ مبارک بنام بنو ثقیف:

غزوۂ حنین کے بعد آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا لیکن بعض حالات کے پیش نظر آپ ﷺ کو وہ محاصرہ ترک کرنا پڑا، لیکن غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد سب سے پہلے اہل طائف نے اپنی اطاعت کا اعلان کیا۔ ہوا یہ کہ اہل طائف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی جو طائف کے محاصرہ کے دور میں یمن گئے ہوئے تھے جب وہ یمن سے واپس آئے تو غزوۂ تبوک سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور خود اسلام قبول کر کے اپنی قوم کو مسلمان کرنے کے لیے جلد واپس جانے پر مصر ہوئے۔

آپ ﷺ کو بنو ثقیف کے بت لات کے بارے میں ان کی عصبیت سے بہت خطرہ تھا، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان میں تبلیغ سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ”اگر تم نے بنو ثقیف میں تبلیغ کی تو کہیں وہ تمھیں قتل نہ کر دیں لیکن عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنے بارے میں یہ خطرہ نہ تھا کیونکہ بنو ثقیف ان کا بہت احترام کرتے تھے لہٰذا عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے تو بنو ثقیف اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں، وہ میری بات کو ضرور مانیں گے۔“ چنانچہ وہ طائف پہنچے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی۔ رات کو یارانِ شہر نے چھپ کر مشورہ کیا کہ عروہؓ کو قتل کر دیا جائے۔ سیدنا عروہ رضی اللہ عنہ کو ان کے اس مشورہ کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ جب صبح کے وقت سیدنا عروہ رضی اللہ عنہ نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر بنو ثقیف کو نماز کے لیے جمع ہونے کے لیے کہا تو انھوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کا محاصرہ کر کے ان پر چاروں طرف سے تیر برسانا شروع کر دیے۔ چنانچہ ایک تیر انھیں ایسا لگا جس سے وہ شہید ہو گئے۔ سیدنا عروہ رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ یہ تھے:

”یہ اسلام اللہ کی دین ہے جو مجھے عطا ہوئی اور یہ موت شہادت ہے جو میرے مقدر میں تھی۔ میں بھی انھی شہداء کی طرح ہوں جو قبل ازیں سرکار دو عالم ﷺ

کی معیت میں کفار سے برسرپیکار ہوئے اور جام شہادت نوش کیا۔"

اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرتے ہوئے انھوں نے وصیت فرمائی کہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ دفن کیا جائے جو طائف کے محاصرہ میں شہید ہوئے تھے۔ بنوثقیف نے انھیں شہید تو کر دیا لیکن اب وہ سب پریشان تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہوگا کیونکہ انھوں نے اسلام کے ایک اہم سپوت کو قتل کیا ہے۔ اب مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں، چنانچہ انھوں نے باہمی مشورہ سے اپنی طرف سے عبد یالیل کو صلح کے لیے نامزد کیا لیکن عبد یالیل نے پہلے تو انکار کر دیا کیونکہ یہ وہی شخص ہے جس نے سفر طائف میں آپ ﷺ پر طائف کے اوباشوں سے پتھروں کی بارش کروا کر آپؐ کو لہولہان کرایا تھا، اسے اپنا انجام معلوم تھا لیکن بعد میں بنوثقیف نے پانچ اور آدمیوں کو اس کے ساتھ خدمت میں حاضر ہونے کے لیے شامل کر دیا۔ اس وفد میں عثمان بن عاص ثقفیؓ بھی تھے جو سب سے زیادہ کم عمر تھے۔ یہ دراصل اس دعا کا اثر تھا جو آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ ختم کرنے کے بعد ان کے لیے کی تھی:

"اے اللہ! بنوثقیف کو ہدایت فرما اور مسلمان کر کے ان کو میرے پاس بھیج۔"

چنانچہ سیدنا عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے آٹھ ماہ بعد چھ آدمیوں کا ایک وفد عبد یالیل کی زیر قیادت مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ سب سے پہلے ان لوگوں کو سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور جلدی سے سرکار دو عالم ﷺ کو خوش خبری دینے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ راستہ میں ان کی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا: "اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہو؟" سیدنا مغیرہؓ نے بتایا کہ میں بنوثقیف کے وفد کی آپ ﷺ کو خوشخبری دینے کے لیے جا رہا ہوں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم دی اور کہا کہ مجھ کو اجازت دو کہ میں جا کر رسول اللہ ﷺ کو یہ بشارت دوں۔ سیدنا مغیرہؓ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جا کر عبد یالیل کے وفد کی خوش خبری رسول اللہ ﷺ کو سنائی۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے قیام کے لیے مسجد نبویؐ میں خیمہ نصب کرایا تاکہ وہ قرآن حکیم کو سنیں اور نماز اور نمازیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ ان کی میزبانی کے

فرائض سیدنا خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد تھے لیکن طائف والے بہرحال طائفی تھے۔ وہ اپنے بارے میں مسلمانوں سے بہت خائف تھے کیونکہ انھوں نے اسلام کے ایک بطل جلیل سیدنا عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، چنانچہ سیدنا خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ان کے لیے جو کھانا لاتے بنوثقیف اس وقت تک کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتے جب تک سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اس میں سے کچھ چکھ نہ لیتے۔ سیدنا خالد بن سعید رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بنوثقیف کے وفد کے مابین وکیل کا کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ چنانچہ وفد نے خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین شرطیں پیش کیں:

- نماز معاف کر دی جائے۔
- ہمارے بت لات کو تین سال تک نہ توڑا جائے۔
- ہمارے بت ہمارے ہاتھوں سے نہ تڑوائے جائیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی دو شرطیں تو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے لات کے لیے تین سال کے بجائے ایک ماہ کی مہلت مانگی لیکن وہ بھی انھیں نہ دی گئی۔ کیونکہ جس طرح ایمان اور کفر جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح ایمان باللہ اور شرک ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ بنوثقیف کی طرف سے لات کو منہدم نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اللہ اور لات کو مساوی مقام دینا چاہتے تھے اور اسلام میں یہی شرک ہے۔ بنوثقیف نے جب نماز کی معافی کی شرط پیش کی تو آپ ؐ نے اس کا مختصر جواب دیا کہ:

((لا خير في دين لا صلوٰة فيها .))

''اس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں نماز نہیں۔''

قائد وفد عبدیالیل بن عمرو نے کہا کہ آپ ؐ اپنے اور بنوثقیف کے درمیان ایک معاہدہ لکھوا دیں جس میں زنا کاری، سود خوری اور شراب نوشی کی اجازت ہو لیکن آپ ؐ نے ان کی یہ بات بھی منظور نہ فرمائی۔ آخر انھوں نے تنہائی میں مشورہ کیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سپر انداز ہونے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں لہٰذا انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ البتہ یہ شرط لگائی کہ ہمارے ہاتھ سے ہمارے بتوں کو نہ تڑوایا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ شرط

منظور فرمائی کیونکہ مقصود بتوں کو توڑنا تھا خواہ اہل طائف خود توڑیں یا کوئی اور توڑے۔ آپ نے عثمانؓ بن ابی عاص ثقفی کو ان کا امیر بنا کر ایک نوشتہ لکھ دیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ بن ابی عاص کو امیر اس لیے مقرر فرمایا کیوں عثمانؓ مسائل دین سیکھنے اور قرآن حکیم پڑھنے کے بہت دلدادہ اور حریص تھے۔ وفد ثقیف آخر رمضان تک مدینہ منورہ میں مقیم رہا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزے بھی رکھے۔ ان کی افطاری اور سحری دونوں وقت کا کھانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سے جاتا۔ یہ بھی ان کا ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ جب یہ وفد واپس طائف جانے لگا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن ابی عاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"باجماعت نمازوں میں قیام وسجود اور رکوع میں طول مت دو کیونکہ مقتدیوں میں کمزور اور ضعیف بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے، بچے، ناتواں اور کاروباری لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔"

جو نوشتہ اور نامہ مبارک بنو ثقیف کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرحمت فرمایا، وہ حسب ذیل ہیں:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ عَضَاهَ وَجٍّ وَصَيْدَهٗ حَرَامٌ لَا يُعْضَدُ شَجَرُهٗ، وَمَنْ وُجِدَ يَفْعَلُ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَاِنَّهٗ يُجْلَدُ وَتُنْزَعُ ثِيَابُهٗ فَاِنْ تعدن ذٰلِكَ فَاِنَّهٗ يُؤْخَذُ نَيُبْلَغُ بِهِ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ وَاِنْ هٰذَا اَمْرُنَبِيِّ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ، وَكَتَبَ خَالِدُ بْنُ سَعِيْدِ بْنِ الْعَاصِ بِاَمْرِ الرَّسُوْلِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ فَلَا يَتَعَدَّاهُ اَحَدٌ يَظْلِمُ نَفْسَهٗ فِيْمَا اَمَرَهٗ بِهٖ مُحَمَّدٌ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.))

"شروع اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور رسول کی طرف سے مومنین کے نام۔ وادی وج کے درخت اور شکار حرام ہیں۔ یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں گے۔ اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کی تو اسے پکڑ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ یہ خط خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھا۔ جو اس کی خلاف

ورزی کرے گا وہ خود پر ظلم کرے گا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا یہی حکم ہے۔"

(سیرۃ ابن ہشام: ۲/۳۵۱، زرقانی: ۴/۱۰، سیرۃ حلبیہ: ۲/۳۳۹، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/۵۲)

طائف کا یہ وفد جب واپس گیا اور لوگوں کو بتایا تو وہ سب اسی وقت ایمان لے آئے۔

وفد کے واپس جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ انہدام لات کے لیے بھیجا۔ دونوں حضرات ثقیف کی قرابت اور مودّت میں دوسروں سے زیادہ قریب تھے۔ ابوسفیان اور مغیرہ رضی اللہ عنہما دونوں ہاتھوں میں کدالیں لیے لات کے صنم کدہ کی جانب جا رہے تھے تو ثقیف کی عورتیں برہنہ سر چھتوں پر بصد حسرت و یاس ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جونہی انھوں نے لات پر ضرب لگائی تو عورتوں نے نالہ وشیون سے زمین وآسمان ایک کر دیے لیکن وفد کے معاہدہ کی وجہ سے کسی نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی جرأت نہ کی۔ لات کے چڑھاوے میں جو مال وزر اور زیورات جمع تھے، وہ سب لے لیے۔ اول ان میں سے عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابو ملیح اور عروہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے قارب بن الاسود کا قرض ادا کیا اور جو بچا وہ آپ ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اسی وقت اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے دین کی مدد فرمائی۔ لات کے انہدام اور اہل طائف کے قبول اسلام کی ہیبت سے حجاز کے باقی قبائل اور قریے بھی مسلمان ہو گئے اور آپ ﷺ کی سطوت کا شہرہ شمال میں روم کی دیواروں تک جا پہنچا اور جنوب میں یہ غلغلہ یمن اور حضرموت تک چلا گیا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام انہدام لات میں لکھا ہے۔ (زرقانی: ۴/۸، زاد المعاد: ۳/۲۶، سیرۃ ابن ہشام: ۲/۵۳۷)

نامۂ مبارک بنام سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ:

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت فطرۃً اثر پذیر واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ نبوت کے بارہویں سال جب مدینہ طیبہ میں اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کرنے میں کچھ بھی پس وپیش نہ کیا۔ جب انھوں

نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ سیرت کی کتابوں میں بیعت عقبہ ثانیہ میں ان کی حاضری کا پتہ چلتا ہے۔ جب یہ جماعت مکہ سے مدینہ واپس ہوئی تو ملت اسلام کی روشنی گھر گھر پھیل گئی ؎

یثرب تمام مطلع انوار ہو گیا

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کم سن تھے مگر جوش ایمانی کا یہ اثر تھا کہ بنوسلمہ کے بت توڑے گئے تو بت شکنوں کی جماعت میں وہ سب کے پیش پیش تھے۔ بت کا کسی کے گھر میں موجود ہونا اب ان کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ سیدنا معاذؓ ابتداء سے ہونہار تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور چند ہی دنوں میں فیض نبوت نے یہ اثر دکھایا کہ اسلام کی تعلیم کا اعلیٰ نمونہ بن گئے اور ان کا شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے برگزیدہ افراد میں ہونے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی، چنانچہ آپ انھیں اپنے ساتھ سواری پر بٹھاتے۔

بنوسلمہ نے اپنے محلّہ میں ایک مسجد بنائی۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ اس مسجد کے امام تھے۔ ۹ ہجری میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے تشریف لائے تھے کہ رمضان میں ملوک حمیر (یمن) کا قاصد اہل یمن کے قبول اسلام کی خبر لے کر مدینہ منورہ آیا۔ اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی امارت کے لیے سیدنا معاذؓ کا نام تجویز فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو ایک فرمان لکھوایا جس میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے رتبہ کے بارے میں ان الفاظ میں اشارہ تھا: ((انی بعثت الیکم خیر اھلی)) ''میں اپنے لوگوں میں سے بہترین شخص کو تمھارے لیے بھیجتا ہوں۔'' سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ جب یمن جانے لگے تو سوار ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور لوگ بھی ساتھ ساتھ تھے، روانگی کا وقت آیا تو خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مشایعت فرمائی۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ اونٹ پر سوار تھے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ کے ساتھ پیادہ پا چل رہے تھے۔ شفقت اور محبت کا اظہار ہر فقرہ سے ہو رہا تھا۔ فرمایا: معاذؓ! تم پر قرض بہت ہے اگر کوئی ہدیہ لائے تو قبول کر لینا۔ میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔ تھوڑی دور چل کر وداع کا وقت آیا۔ اس وقت ایک

عجیب سماں تھا۔ سرور کائنات ﷺ اپنے محبوب سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے تھے۔ معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: شاید اب تم سے ملاقات نہ ہو۔ اب مدینہ آؤ گے تو میری بجائے میری قبر ملے گی۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ اس جملہ پر زار وقطار رونے لگے کہ اب آخری ملاقات ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بس اب نہ رو، رونا شیطانی حرکت ہے۔ رخصت کرتے وقت فرمایا:

((حفظك الله من بين يديك ومن خلفك وعن يمينك وعن شمالك ومن فوقك ومن تحتك ودراء عنك شر والانس والجن.)) (مسند احمد: ۵/ ۲۳۵)

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط ارسال فرمایا تھا جس میں انھیں ان کے ایک بیٹے کی وفات پر تعزیت اور تسلی فرمائی تھی۔ اس خط کا مضمون یہ ہے:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَى مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، سَلَامٌ عَلَيْكَ، فَاِنِّي اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اَمَّا بَعْدُ: فَعَظَّمَ اللّٰهُ لَكَ الْاَجْرَ وَاَلْهَمَكَ الصَّبْرَ، وَرَزَقَنَا وَاِيَّاكَ الشُّكْرَ، ثُمَّ اِنَّ اَنْفُسَنَا وَاَهْلِيْنَا وَمَوَالِيْنَا مِنْ مَوَاهِبِ اللّٰهِ السَّنِيَّةِ وَعَوَارِفِهِ، الْمُسْتَوْدَعَةِ نُمَتَّعُ بِهَا اِلٰى اَجَلٍ مَعْدُوْدٍ، وَيُقْبَضُ لِوَقْتٍ مَعْلُوْمٍ، ثُمَّ افْتَرَضَ عَلَيْنَا الشُّكْرَ اِذَا اَعْطٰى وَالصَّبْرَ اِذَا ابْتَلٰى، وَكَانَ ابْنُكَ مِنْ مَوَاهِبِ اللّٰهِ الْهَنِيَّةِ وَعَوَارِفِهِ الْمُسْتَوْدَعَةِ مَتَّعَكَ بِهِ فِيْ غِبْطَةٍ وَسُرُوْرٍ، وَقَبَضَهُ مِنْكَ بِاَجْرٍ كَثِيْرٍ، اَلصَّلَاةُ وَالرَّحْمَةُ وَالْهُدٰى، اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ فَلَا تَجْمَعَنَّ عَلَيْكَ يَا مُعَاذُ خَصْلَتَيْنِ، اَنْ يُحْبِطَ جَزَعُكَ صَبْرَكَ فَتَنْدَمَ عَلٰى مَا فَاتَكَ فَلَوْ قَدِمْتَ عَلٰى ثَوَابِ مُصِيْبَتِكَ، قَدْ اَطَعْتَ رَبَّكَ وَتَنَجَّزْتَ مَوْعُوْدَهُ، عَرَفْتَ اَنَّ الْمُصِيْبَةَ قَدْ قَصُرَتْ عَنْهُ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْجَزَعَ لَا يَرُدُّ مَيِّتًا وَلَا يَدْفَعُ حُزْنًا فَاَحْسِنِ الْجَزَاءَ وَتَنَجَّزِ الْمَوْعُوْدَ وَلْيُذْهِبْ اَسَفَكَ مَا هُوَ نَازِلٌ بِكَ فَكَانَ

قَدْ .)) (صبح الاعشیٰ: ۹/ ۸۰، جمہرۃ رسائل العرب: ۱/ ۶۵)

''شروع اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے نام، تم پر سلامتی ہو، میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ امابعد! اللہ تعالیٰ تمھارے اجر کو بڑا کرے اور تمھیں صبر کی تلقین فرمائے اور ہمیں اور تمھیں دونوں کو شکر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ ہماری جانیں، اہل وعیال اور دوست احباب اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ بخششیں ہیں اور اس کے احسانات ہیں جو اس نے ہمیں بطور امانت دے رکھے ہیں۔ ایک محدود مدت تک ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور مقررہ وقت پر یہ ہم سے لے لی جاتی ہیں۔ پھر اس نے ہم پر یہ فرض اور ضروری قرار دیا کہ اس کی بخشش کا شکریہ ادا کریں اور آزمائش میں پڑیں تو صبر سے کام لیں۔

تمھارا بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کی خوشگوار بخششوں میں سے ہی تھا اور اس کی بطور امانت دی ہوئی بھلائیوں میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اپنے اس بیٹے کے سبب خوشی اور مسرت سے بہرہ ور کیا اور ایک بہت بڑے اجر کے بدلے تم سے لے لیا یعنی صلوٰۃ، رحمت اور ہدایت کا اجر۔ اگر تو صبر سے اسے اجر کا سبب تصور کرے تو اے معاذؓ! تو پھر تم میں دو باتیں جمع نہ ہونے پائیں گی کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری گھبراہٹ صبر کو ضائع کر دے اور تم اس محرومی پر نادم ہو، اس لیے اگر تم مصیبت پر ثواب حاصل کرنے کی ہمت کرو تو اپنے رب کے فرمانبردار قرار پاؤ گے اور اس کا وعدہ پورا کر دکھاؤ گے اور تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس اجر سے یہ مصیبت کہیں کم ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آ سکتا اور نہ اس سے غم کی مصیبت ٹل سکتی ہے، اس لیے حسن جزاء حاصل کرو اور وعدہ پورا کر دکھاؤ، تمھاری مصیبت کا غم اس تصور سے زائل ہو جانا چاہیے کہ یہی موت تم پر بھی نازل ہونے والی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ جیسے تم بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہو۔''

خطباتِ نبویؐ:

سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی زندگی کے چالیس سال اپنے پیارے وطن مکہ مکرمہ میں گزارے جس میں آپؐ نے قریش کے مختلف کاموں میں حصہ لیا۔ آپ ﷺ کی صداقت وامانت کو دیکھ کر مکہ اور اطراف واکناف کے لوگوں نے آپؐ کو ''الامین'' اور ''الصادق'' کا لقب دیا کیونکہ وہ آپؐ کی صداقت وامانت سے بہت متاثر تھے لیکن جب آپ ﷺ کی عمر چالیس سال کو پہنچی اور یہی سن کمال ہے اور غار حرا میں آپؐ کی خلوت نشینی کا تیسرا سال آیا تو حق تعالیٰ نے چاہا کہ انسانیت پر اس کی رحمت کا فیضان ہو، چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ ﷺ کو نبوت و رسالت سے مشرف فرمایا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلے چھ ماہ آپؐ کو سچے خواب آتے رہے۔ چنانچہ رویائے صادقہ کے ذریعے نبوت کا آغاز ربیع الاول میں ہوا جو آپؐ کی ولادت کا مہینہ ہے لیکن حالت بیداری میں آپ ﷺ پر نزول وحی رمضان المبارک میں ہوا۔ (فتح الباری:۱/۲۷)

رمضان المبارک کے مبارک مہینہ میں آپؐ حسب معمول غار حرا میں تشریف فرما تھے کہ دفعتاً ایک وجود اس غار میں نمودار ہوا اور آپؐ کو سلام کیا۔ (زرقانی:۱/۲۱۱)

یہ رمضان المبارک کی ۲۱ تاریخ دوشنبہ کی رات تھی اور اگست کی ۱۰ تاریخ تھی۔ قمری حساب سے آپ ﷺ کی عمر اس وقت چالیس سال چھ ماہ بارہ دن تھی اور شمسی حساب سے ۳۹ سال تین ماہ ۲۲ دن۔ اس نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا ''اقراء'' پڑھیے۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''میں پڑھنا نہیں جانتا۔'' حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس نے مجھے پکڑ کر ایسا دبایا کہ میری مشقت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس طرح اس نے مجھے تین دفعہ دبایا اور تیسری مرتبہ اسی شدت سے دبا کر چھوڑ دیا اور کہا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾

(العلق ۹۶:۱ تا ۵)

''آپؐ اپنے رب کے نام سے پڑھیے جو تمام کائنات کا خالق ہے، خصوصاً انسان

کا جس کو اس نے خون کے لوتھڑے (جمے ہوئے خون) سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے، آپ کا رب بہت ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا۔ یہ نبوت کی سب سے پہلی وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ آپ وہاں سے گھر واپس لوٹے اس حالت میں کہ آپ پر گھبراہٹ اور کپکپاہٹ طاری تھی۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی اس کیفیت کو دیکھ کر کہا:

((کلا، واللہ لا یخزیك اللہ ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علٰی نوائب الحق.)) (بخاری مع فتح الباری:۱/۲۲)

''بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام اور نامراد کر دے اور آپ کی مدد نہ کرے کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، تھکے ہارے اور درماندہ انسانوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور ایسی خدماتِ جلیلہ سرانجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، بے ٹھکانہ مسافروں کو اپنا مہمان بناتے ہیں اور حق بجانب امور میں معین و مددگار رہتے ہیں۔''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں جب سکون پیدا ہوا اور گھبراہٹ کی کیفیت جاتی رہی تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، ان کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری کیفیت بیان کی۔ ورقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنتے ہی کہا کہ یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔

(فتح الباری:۱۲/ ۳۱۷، عمدۃ القاری:۱/ ۵۳)

نبوت ملنے کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم طواف کعبہ کے لیے حرم میں تشریف لے گئے یہاں ورقہ سے پھر آپ کی ملاقات ہوئی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گزشتہ تمام کیفیت ورقہ سے بیان کی۔ ورقہ نے کہا:

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، آپؐ اس امت کے نبی ہیں۔ آپؐ دیکھئے گا کہ یہ لوگ آپؐ کی تکذیب کریں گے، آپؐ کو اذیتیں دیں گے یہاں تک کہ آپؐ کو آپؐ کے وطن (مکہ) سے نکال دیں گے، اگر میں ان دنوں تک زندہ رہا تو ہر قدم پر رضائے الٰہی کے لیے آپؐ کی نصرت اور اعانت کروں گا۔ یہ کہہ کر ورقہ نے فرط عقیدت سے آپ ﷺ کے سر مبارک کو بوسہ دیا۔“ (سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۲۳۸)

گھر آ کر آپؐ نے اپنے ذہن میں دعوت خداوندی کا نقشہ تیار کیا اور اس کے مطابق لوگوں کو دین خداوندی کی دعوت دینا شروع کر دی۔

اعلان نبوت کے بعد سرکار دو عالم ﷺ کی دعوتی جدوجہد کے سلسلہ میں آپؐ کے ہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو پیش آتی ہے۔ حالات کا یہ سخت تقاضا تھا کہ اس دعوتی کام کو اولاً پوشیدہ طور پر کیا جائے۔

ضماد بن ثعلبہ ازدی دور جاہلیت ہی سے آپؐ کے دوستوں میں سے تھا۔ یہ جھاڑ پھونک سے لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ بعثت کے بعد یہ مکہ آیا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ کوئی آپؐ کو ساحر کہتا ہے اور کوئی مجنون اور دیوانہ۔ یہ دیکھ کر ضماد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اگر آپؐ میں آسیب کے کچھ اثرات اور جنون کی کچھ علامات ہیں تو مجھے علاج کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے ضماد کے سامنے یہ چند کلمات پڑھے جو آپؐ اکثر و بیشتر اپنے خطبات کے آغاز میں پڑھا کرتے تھے:

((الحمد لله نحمدهٗ ونستعينه ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور انفسنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلله فلا هادي له، واني اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، واشهد ان محمداً عبده ورسوله))

”سب تعریف اللہ کے لیے ہے، ہم سب اسی کی حمد وثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے مغفرت کے طلب گار ہیں اور اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے

نفسوں کے شر سے، جس کو وہ ہدایت سے نوازے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں
اور جس کو وہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ
اللہ کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے، کوئی اس کا شریک
نہیں اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

آپؐ کے منہ سے یہ کلمات سن کر ضماد کے جسم پر ایک لرزہ طاری ہو گیا اور عرض کیا کہ ان کلمات کو پھر دہرائیں۔ میں نے اس سے بہتر کلام زندگی بھر کبھی نہیں سنا۔ یہ کلمات تو فصاحت و بلاغت کی انتہائی گہرائی اور گیرائی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر فوراً کہا: "اور میں بھی یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا و یکتا ہے، ذات وصفات میں اس کا کوئی شریک نہیں اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔" پھر آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی اور دولت ایمان سے بہرہ مند ہو کر اپنی قوم کی طرف چلے گئے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ: ۳۶۳، مسند احمد: ۱/۳۰۲، الاصابہ: ۲/۲۱۰، دلائل النبوۃ: ۲/۱۰، صفۃ الصفوۃ: ۱/۶۰۴، مسلم: رقم: ۸۶۸، سیرۃ حلبیہ: ۱/ ۳۲۹۔

یہ صرف ضماد ازدیؓ پر ہی منحصر نہیں، اس دور میں کئی لوگ اس قسم کا شعور رکھتے تھے۔ لوگوں نے جو آپؐ کی دعوت کو قبول کیا اس میں دعوت کی ہمہ گیری کو بھی بہت بڑا دخل تھا کیونکہ دعوت کی ہمہ گیری قلب و ذہن میں خود جگہ بنا لیتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ جب اشراف قریش نے ابو طالب کی معرفت آپ ﷺ سے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب
کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع وفرمانبردار ہو جائے گا۔"

اور وہ توحید کا مطالبہ تھا کیونکہ اس اعتقادی کلمہ کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز مضمر ہے۔ یہ انسانی فطرت کی آواز ہے، اس لیے وہ انسانی نفسیات کی انتہائی گہرائیوں میں شامل ہو جاتا ہے اور اکثر مخالفین کے اندر سے اپنے لیے حامی پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ حافظ

ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہا مگر کوئی جنگ ایسی نہ تھی جس میں شریک نہ ہوا ہوں اور یہ خیال لے کر واپس نہ آیا ہوں کہ میں صحیح جگہ نہیں کھڑا ہوں۔'' (البدایہ والنہایہ: ۴/ ۱۳۷)

اپنی اس دعوت کے سلسلہ میں آپؐ نے ایک پہاڑی وعظ بھی فرمایا جس وعظ کو سننے کے بعد اگر چہ لوگ گھروں کو چلے گئے لیکن ہر شخص کے ذہن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سابقہ زندگی تھی جو شبنم کی طرح پاکیزہ اور برف کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ سیدہ خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کی اسی پاکیزہ سے متاثر ہوکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے بھی آپؐ کی اس سابقہ زندگی کو آپؐ کی صداقت کی دلیل بتایا ہے۔ (۱۰۔۱۶) اور اسی صاف اور شفاف زندگی کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ ''الصادق'' اور ''الامین'' کہتے رہے۔

اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا کہ آپؐ نے بنوعبدالمطلب کی ایک دعوت کی جس میں کم وبیش چالیس آدمی اکٹھے ہوگئے۔ اس میں کھانے سے فراغت کے بعد آپؐ نے اپنی دعوت پر مشتمل انھیں ایک خطبہ ارشاد فرمایا:

((ان الرائد لا یکذب اهله، والله لو کذبت الناس جمیعاً ما کذبتکم، ولو غررت الناس جمیعا غررتکم، والله الذی لا اله الا هو انی لرسول الله الیکم خاصة والی الناس کافة والله لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون ولتحاسبن بما یعملون، ولتجزون بالاحسان احساناً، وبالسوء سوءً وانها الجنة ابدا او لنار ابدا .)) (سیرۃ حلبیہ: ۱/ ۲۷۲، جمہرۃ خطب العرب: ۱/ ۵۱)

''کوئی خبر لانے والا اپنے خاندان سے جھوٹ اور کذب بیانی سے کام نہیں لیتا۔ اللہ کی قسم! اگر میں دنیا کے تمام انسانوں سے جھوٹ بولتا بھی تو تم لوگوں سے تو پھر بھی غلط بیانی نہ کرتا۔ اگر میں تمام دنیا والوں سے دھوکہ کر بھی لیتا تو پھر بھی تم سے کبھی دھوکہ نہ کرتا۔ میں اس اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت

کے لائق نہیں کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں اور میں تمھارے لیے خصوصاً اور دنیا کے تمام انسانوں کے لیے عموماً مبعوث کیا گیا ہوں۔ اللہ کی قسم! تمھیں موت بھی اسی طرح آتی ہے جس طرح تم سو جایا کرتے ہو۔ تم (قیامت کے روز) اٹھائے بھی اسی طرح جاؤ گے جس طرح تم بیدار ہو جایا کرتے ہو۔ تمھارے جملہ اعمال کا محاسبہ بھی ضرور ہوگا اور تمھیں بھلائی کا بدلہ بھلائی اور برائی کا بدلہ برائی ضرور دیکھنا ہوگا۔ پھر اس کے بعد یا تو تمھارے لیے ہمیشہ کی جنت ہوگی یا جہنم۔"

یہ تھا سرکار دو عالم ﷺ کا اوّلیں خطبہ جو دینی نصائح اور عبرت آموزی کا حسین مرقع ہے۔

مدینہ منورہ میں آپؐ کا پہلا خطبہ:

سرکار دو عالم ﷺ کئی روز کا سفر طے کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو مدینہ طیبہ کے مرد، عورتیں اور بچے خوشی سے اچھلنے لگے۔ آپ ﷺ کے زیر پا اپنی آنکھیں بچھائیں اور نظر اشتیاق کو فرش راہ کیا۔ مدینہ سے ۵ کلومیٹر دور ایک آبادی ہے جس کا نام "قباء" ہے۔ یہاں انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ سب سے زیادہ عمرو بن عوف کا خاندان ممتاز تھا۔ یہ خاندان قبیلہ دوس کا بطن تھا۔ (فتح الباری: ۷/۱۹۴) انھوں نے ہتھیار زیب تن کر کے آپؐ کا استقبال کیا۔ (بخاری: ۱/۵۵۲)

سرکار دو عالم ﷺ نے صرف چار روز قبا میں قیام فرمایا یعنی پیر، منگل، بدھ اور جمعرات۔ اسی دوران آپؐ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ حدیث میں اس مسجد کے بارے میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے چلے اور مسجد قبا میں جا کر دو رکعت ادا کرے اس کے لیے ایک عمرہ کا ثواب ہے۔ (ابن ماجہ)

بخاری اور مسلم میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی ہر ہفتہ کو مسجد قبا کی زیارت کو کبھی سوار اور کبھی پیادہ تشریف لے جاتے اور دو رکعت نماز پڑھتے۔

پانچویں روز جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آپؐ اونٹنی پر سوار ہوئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آپؐ کے ردیف تھے۔ آپ ﷺ نے بنونجار کو جو آپؐ کے ماموں کا قبیلہ تھا، اطلاع بھیج دی تھی۔ چنانچہ وہ تلواریں حمائل کیے حاضر خدمت تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی

معیت میں مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق آپ ﷺ کی اونٹنی کا نام قصواء تھا۔ یہ اونٹنی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ہجرت کے سفر کے لیے دی تھی۔ آپ بنو سالم کی آبادی میں پہنچے تو جمعہ کا وقت آ گیا۔ آپ نے بطن وادی میں اس مقام پر جمعہ پڑھا جہاں اب مسجد ہے۔ جمعہ میں قریباً ایک سو آدمی تھے۔

(بخاری:۱/ ۵۵۵، زاد المعاد:۲/ ۵۵، ابن ہشام:۱/ ۴۹۴، ابن سعد:۱/ ۱۶۰)

اس جمعہ میں آپ ﷺ نے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا، حق تعالیٰ شانہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

((اما بعد ایها الناس! فقدموا لا نفسکم، تعلمن والله لیصعقن احدکم، ثم لیدعن غنمه، لیس لها راع، ثم لیقولن له ربه، ولیس له ترجمان ولا حاجب یحجبه دونه، الم یاتك رسولی فبلغك، واتیتك مالا و افضلت علیك فما قدمت لنفسك؟ فلینظرن یمیناً وشمالاً، فلا یری شیئا، ثم لینظرن قدامه فلا یری غیر جهنم، فمن استطاع ان یقی وجهه من النار ولو بشق من تمرة فلیفعل، ومن لم یجد فبکلمة طیبة فان بها تجزی الحسنة عشر امثالها الی سبعمائة ضِعفٍ، والسلام علیکم وعلی رسول الله ورحمة الله و برکاته.)) (الروض الانف:۱/ ۱۰، جمہرۃ خطب العرب:۱/ ۵۵)

"اے لوگو! اپنے لیے کچھ توشۂ آخرت جمع کر لو۔ تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی قسم! تم میں سے کسی کو بھی بجلی کی طرح اچانک موت آ سکتی ہے۔ پھر اسے اپنا ریوڑ چرواہے کے بغیر چھوڑ کر جانا ہوگا۔ پھر اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہوگا، پھر اس کا رب اس سے پوچھے گا جب کہ وہاں نہ تو کوئی ترجمان ہوگا اور نہ ہی درمیان میں کوئی پردہ حائل ہوگا۔ کیا تیرے پاس میرا رسول نہیں آیا تھا؟ کیا اس نے تجھے میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟ کیا میں نے تجھے

مال نہیں دیا تھا اور تجھ پر اپنا فضل نہیں کیا تھا؟ اب بتا تو نے اپنی آخرت کے لیے کیا توشہ تیار کر رکھا ہے؟ تب وہ دائیں بائیں نظر دوڑائے گا لیکن کچھ نہ پائے گا۔ پھر سامنے دیکھے گا تو اسے جہنم کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آئے گا لہٰذا اگر کوئی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانا چاہتا ہے تو اسے ضرور کار خیر میں حصہ لینا ہوگا خواہ کھجور کا ٹکڑا ہی دے کر ہو۔ کیونکہ اگر کسی کو یہ بھی میسر نہ ہو تو ایک پاکیزہ بات ہی کر کے وہ اس نیکی کے کام میں حصہ لے سکتا ہے کیونکہ اس پاکیزہ اور نیک کلمہ کی نیکی کا بدلہ بھی دس گنا ہے جو سات سو گنا تک بڑھ سکتا ہے۔ تم پر اور اللہ کے رسول ﷺ پر اللہ کی رحمتیں، برکتیں اور سلام ہو۔

ابن اسحٰق کا قول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بار پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں فرمایا:

((ان الحمد لله احمدهٗ واستعينه ، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ، ومِنْ سيئات اعمالنا ، من يهدى الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ، ان احسن الحديث كتاب الله تبارك و تعالى قد افلح من زينه الله فى قلبه وادخله فى الاسلام بعد الكفر ، واختاره على ما سواه من احاديث الناس ، انه احسن الحديث وابلغه ، احبوا ما احب الله ، احبوا الله بكل قلوبكم ولا تملوا كلام الله وذكره ولا تقس عنه قلوبكم ، فانه من كل ما يخلق الله يختار ويصطفى قد سماه الله خيرته من الاعمال و مصطفاه من العباد الصالح الحديث ، ومن كل ما اوتى الناس من الحلال والحرام ، فاعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا واتقوه حق تقاته ، و اصدقوا الله صالح ما تقرلون بافواهكم ، وتحابوا بروح الله بينكم ان الله يغضب ان ينكث عهده والسلام عليكم .))

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، میں اسی کی حمد بیان کرتا ہوں اور اسی سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کے شر سے اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ راہ ہدایت پر ڈال دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ بے شک بہترین بات تو اللہ کی کتاب ہے۔ وہ شخص فلاح پا گیا جس کے سینے کو اللہ نے اس کتاب سے زینت بخشی اور کفر کے بعد اسے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا اور لوگوں کی باتوں کے بجائے اللہ کی کتاب کی بات کو اس نے اپنے لیے چن لیا۔ بے شک کتاب اللہ بہترین اور بلیغ ترین بات ہے۔ وہی چیز پسند کرو جسے اللہ تعالیٰ نے پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے دلوں کی اتھاہ گہرائی سے محبت کرو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے ہرگز رنجیدہ نہ ہونا۔ اس کے بارے میں سنگ دل نہ بن جانا، بلاشبہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے پھر اسی میں سے انتخاب کرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے چیدہ اعمال میں سے قرار دیا ہے۔ بندوں میں سے اللہ تعالیٰ کا منتخب شدہ وہ ہے جو عمدہ اور اچھی بات کرنے والا ہو۔ جو کچھ اس نے لوگوں کو حلال وحرام میں سے عطا فرمایا ہے اس میں سے پاکیزہ اسے پسند ہے، سو اسی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اپنے منہ سے اچھی بات کہو اور اللہ کے حضور صدقہ کرو، اللہ کے ہاں پسندیدہ فراخ دلی کی بنیاد پر آپس میں الفت ومحبت پیدا کرو، اگر اللہ کے ساتھ کوئی کیا ہوا عہد وپیمان توڑ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔''

(الروض الانف: ۱/۵۱، اعجاز القرآن باقلانی: ۱۱۰، جمہرۃ خطب العرب: ۱/۵۳)

آپؐ کے خطبات میں سے بعض خطبات کا تعلق احکام سے ہے جن میں آپ ﷺ نے کسی شرعی حکم کی وضاحت فرمائی ہے جیسا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر نماز عید کی ادائیگی سے قبل سرکار دو عالم ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں قربانی کے مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((من صلى صلاتنا ونسك منسكنا فقد اصاب النسك، ومن نسك قبل الصلوة فتلك شاة لحم))

(ابوداؤد: رقم ۲۸۰۰، بخاری: رقم ۹۸۳، سنن کبریٰ بیہقی: رقم ۱۹۶۴۵ وغیرہ)

''جس نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی اور ہمارے طریقے پر قربانی کی تو اس کی قربانی صحیح اور درست ہوگئی اور جس نے نماز سے قبل ہی قربانی کر لی تو وہ قربانی صرف گوشت کھانے کے لیے ہے یعنی اس کی قربانی ادا نہیں ہوئی۔''

یہ خطبہ تو مختصر ہے لیکن آپ کے بعض خطبے طویل ہیں جیسا کہ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شعبان کی آخری تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی آمد کے حوالے سے ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آپ نے رمضان المبارک کے نہایت اہم مسائل بیان فرمائے۔ آپ نے فرمایا:

((یا ایها الناس! قد اظلكم شهر عظيم، شهر مبارك، شهر فيه ليلة خير من الف شهر، شهر جعل الله صيامه فريضة وقيام ليلة تطوعاً، من تغرب فيه بخصلة من الخير كان كمن ادى فريضة فيما سواه، ومن ادى فيه فريضة كان كمن ادى سبعين فريضة فيما سواه، وهو شهر الصبر، والصبر ثوابه الجنة، وشهر المواساة، وشهر يزداد فيه رزق المومن، من فطر فيه صائما كان له مغفرة لذنوبه، وعتق رقبة من النار، وكان له مثل اجره من غير ان ينقص من اجره شئى، قالوا ليس كلنا نجد ما نفطر الصائم، فقال: يعطى الله هذا الثواب من فطر صائما على تمرة او على شربة ماء او مذقة لبن، وهو شهر اوله رحمة واوسطه مغفرة وآخره عتق من النار، من خفف عن مملوكه غفر الله له واعتقه من النار، واستكثروا فيه من اربع خصال، خصلتين ترضون بهما

ربكم ، وخصلتين لا غنى بكم عنهما ، فاما الخصلتان اللتان ترضون بهما ربكم فشهادة ان لا اله الا الله ، وتستغفرونه واما الخصلتان اللتان لاغنى بكم عنهما ، فتسئلون الله الجنة وتعوذون به من النار ، ومن اشبع فيه صائما سقاه الله من حوضي شربة لايظمأ حتى يدخل الجنة .))

''اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ کرنے والا ہے۔ اس مبارک مہینے کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کے قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض نیکی ادا کرے گا اس کو رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں کے فرضوں کے برابر اجر ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب رمضان کے علاوہ اور مہینوں کے ستر فرضوں کے برابر ہے۔ یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، یہ غم خواری اور ہم دردی کا مہینہ ہے، اس مہینے میں مومنوں کے رزق میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جس شخص نے اس مہینے میں کسی روزے دار کا (اللہ کی رضا کے لیے) روزہ افطار کرایا تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتش جہنم سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور روزہ دار کے ثواب واجر میں کوئی کمی کیے بغیر اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔'' سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی وہی ثواب عطا فرمائے گا جو ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ یا دودھ کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے۔ یہ مہینہ ایسا مبارک ہے جس کا ابتدائی حصہ باعث رحمت ہے، درمیانی حصہ باعث مغفرت ہے اور آخری حصہ جہنم سے آزادی کا باعث ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام یا خادم کے کام میں

تخفیف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے جہنم سے آزاد کر دے گا۔ اس مہینے میں تم چار خصلتوں کے لیے خوب کوشش کرو، دو خصلتیں تو ایسی ہیں جن سے تمھارا رب راضی ہوگا۔ اور وہ یہ ہیں: (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (۲) اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا اور دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے تم بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ (۱) یہ کہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرنا اور (۲) جہنم سے پناہ مانگنا اور جس شخص نے کسی روزہ دار کو کچھ پلایا تو اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض (کوثر) سے ایسا مشروب پلائے گا جس کے پینے کے بعد اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔" (ابن خزیمہ: ۱۹۱۳، رقم: ۱۸۸۷، درالمنثور: ۱/ ۴۴۷)

اسی طرح آپ ﷺ نے جمعے اور امامت کے بارے میں خطبہ دیا اور دین کے مختلف مسائل کو بیان فرمایا: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الا ایها الناس! توبوا الی ربکم قبل ان تموتوا وبادروا الاعمال الصالحة قبل ان تشغلوا، وصلوا الذی بینکم و بین ربکم بکثرة ذکرکم له، وکثرة الصدقة فی السرو العلانیة، ترزقوا و توجروا وتنصروا واعلموا ان الله عزوجل قد افترض علیکم الجمعة، فی مقامی هذا، فی عامی هذا، فی شهری هذا، الی یوم القیامة، حیاتی ومن بعد مماتی، فمن ترکها وله امام فلا جمع الله له شمله ولا بارك له فی امره، الا ولا حج له الا ولا صوم له، الا ولا صدقة له، الا ولا برّ له، الا ولا یوم اعرابی مهاجرا، الا ولا یوم فاجر مومنا، الا ان یقهره سلطان، یخاف سیفه او سوطه.))

(اعجاز القرآن، باقلانی: ص ۱۱۰، جمہرۃ خطب العرب: ۱/ ۵۳)

"اے لوگو! خبردار، اس سے پہلے کہ تمھیں موت آئے اپنے رب کے حضور توبہ کر

لو۔ مصروفیات اور مشاغل میں الجھنے سے پہلے ہی اعمال صالحہ کے لیے سبقت کرلو۔ اللہ کے نزدیک کی کثرت اور پوشیدہ اور ظاہر صدقات سے اپنے رب سے اپنا رشتہ اور تعلق مضبوط کرلو۔ تمھیں رزق، اجر اور نصرت سے نوازا جائے گا اور یہ بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جمعہ فرض کیا ہے۔ میری اس جگہ پر، اس سال کے دوران، اس مہینے کے اندر یہ قیامت تک فرض رہے گا۔ میری اس زندگی میں اور میری وفات کے بعد بھی اگر کسی نے جمعہ ترک کردیا جب کہ اسے امام بھی میسر تھا تو اللہ تعالیٰ اسے کبھی دل جمعی عطا نہ کرے اور نہ ہی اس کے معاملات میں برکت دے۔ یہ بھی سن لو کہ تارک جمعہ کا نہ حج ہے اور نہ روزہ اور نہ ہی اس کی زکوٰۃ۔ آگاہ رہو اس کی کوئی نیکی بھی قبول نہیں۔ خبردار کوئی گنوار اور جاہل کسی مہذب اور عالم کی امامت نہ کرائے اور نہ کوئی فاجر و بدکار کسی مومن کی امامت کرائے۔ ہاں اگر اسے کوئی قوت زیر کرے جس کی تلوار اور کوڑے کا اسے خوف ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔"

مدینہ منورہ میں سب سے پہلے جمعہ کا خطبہ:

مدینہ طیبہ جہاں آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی، اسے یثرب کہا جاتا تھا۔ یثرب کے کہنے کی وجہ بعض حضرات کے نزدیک یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس شہر کو یثرب نامی عمالقی نے بسایا تھا اور اس نے اپنے اس نام پر اس شہر کا نام رکھا۔ (المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی: ۸۹/۱) اس شہر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ (معجم البلدان، یاقوت الحموی: ۸۴/۵) سرکار دو عالم ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کو یثرب کے نام سے موسوم کرنے سے منع فرما دیا۔ (وفاء الوفاء سمھودی: ۸/۱)

ہمارے خیال میں اس لفظ کے لغوی معنیٰ بھی کچھ اچھے نہیں ہیں کیونکہ یثرب اس چربی کو کہتے ہیں جو اوجھڑی اور انتڑیوں پر ہوتی ہے اور تثریب گناہ اور برائی پر دلالت کرتا ہے۔ یثرب کی وجہ تسمیہ اور اشتقاق کی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مکه والمدینة فی الجاهلیة وعهد الرسول: احمد ابراهیم ص ۲۹۱)

سرکار دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے اس شہر میں سکونت پذیر ہوگئے اور اب ایک آزاد فضا میں سانس لینے لگے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے تو انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ (مواخات) قائم کیا۔ بعض روایات کے مطابق مسجد نبویؐ کی تعمیر مواخات کے دوران یا اس کے بعد ہوئی۔ (عیون الاثر: ۱/ ۳۲۲) یہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے مطالبے پر ہوئی۔ آپؐ نے اس میں ۴۵ مہاجرین کو ۴۵ انصار کا بھائی بنایا۔

(السیرۃ النبویہ لابن ہشام: ۱/ ۵۰۴، عیون الاثر: ۱/ ۳۴۴، الدرر فی المغازی والسیر لابن عبدالبر: ص ۹۱)

مدینہ منورہ میں سب سے پہلے آپؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر کی کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کا نصب العین اقامت دین ہوتا ہے۔ مسجد کی تعمیر اسلامی معاشرہ میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے جہاں اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے وہاں آداب المعاشرت کی تکمیل بھی ہوتی ہے چنانچہ آپؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی جس کی تفصیل ہماری کتاب ''پیغمبر امن ﷺ'' میں دی گئی ہے۔ اس مسجد نبویؐ میں آپؐ نے جمعہ کا جو سب سے پہلا خطبہ دیا وہ یہ تھا:

((الحمد لله ، احمده واستعينه واستغفره واستهديه و اومن به ولا اكفره واعادى من يكفره ، واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ، وان محمدا عبده ورسوله ، ارسله بالهدى والنور والموعظة على فترة من الرسل ، وقلة من العلم وضلالة من الناس ، وانقطاع من الزمان ، ودنو من الساعة وقرب من الاجل ، من يطع الله ورسوله فقد رشد ، ومن يعصهما فقد غوى وفرط وضل ضلالا بعيدا .

واوصيكم بتقوى الله فانه خير ما اوصى به المسلم ، المسلم ان يحضه على الآخرة وان يامره بتقوى الله فاحذروه ما حذركم الله من نفسي ، ولا افضل من ذلك نصيحة ، ولا افضل من ذلك ذكرا ، وان تقوى الله لمن عمل به على رجل ومخافة من ربه ، عون صدق على ما تبغون من امر الآخرة ،

ومن يصلح الذى بينه وبين الله من امره فى السرو العلانية لا ينوى بذلك الا وجه الله، يكن له ذكرا فى عاجل امره، وذخرا فيما بعد الموت حين يفتقر المرء الى ما قدم وما كان من سوى ذلك يودلو ان بينه وبينه امدا بعيدا، ويحذركم الله نفسه، والله رؤف بالعباد.

والذى صدق قوله وانجز وعده لا خلف لذلك فانه يقول عزوجل: ما يبدل القول لدى وما انا بظلام للعبيد، فاتقوا الله فى عاجل امركم وآجله فى السر والعلانية، فانه من يتق الله يكفر عنه سيئاته، ويعظم له اجرا، ومن يتق الله فقد فاز فوزاً عظيماً، وان تقوى الله يوفى مقته ويوقى عقوبته ويوقى سخطه، وان تقوىٰ الله يبيض الوجوه ويرض الرب ويرفع الدرجة، خذوا بحظكم ولا تفرطوا فى جنب الله، قد علمكم الله كتابه ونهج لكم سبيله، ليعلم الذين صدقوا ويعلم الكاذبين فاحسنوا كما احسن الله اليكم، وعادوا اعداءه وجاهدوا فى الله حق جهاده هواجتباكم وسماكم المسلمين، ليهلك من هلك عن بينة ويحيا من حى عن بينة، ولا قوة الا بالله فاكثروا ذكر الله، واعلموا لما بعد اليوم، فانه من يصلح ما بينه و بين الله يكفر الله ما بينه وبين الناس ذلك بان الله يقضى على الناس ولا يقضو ن عليه، ويملك من الناس ولا يملكون منه، الله اكبر، ولا قوة الا بالله العظيم.)) (الطبری:۲/۲۵۵،جمہرۃ خطب العرب:۱/۵۶)

”تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، میں اسی کی حمد بیان کرتا ہوں، اسی کی مدد کا خواہاں ہوں، اسی سے بخشش کا طلب گار ہوں، اسی سے ہدایت چاہتا ہوں، اسی

پر ایمان رکھتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ایک وقفے کے بعد ہدایت، نور اور موعظت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ جب علم کی بہت بڑی کمی ہو چکی تھی۔ لوگ ضلالت اور گمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور زمانے کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ قیامت قریب تھی اور اجل بھی قریب آن پہنچی تھی۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی وہ ہدایت پا گیا اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا اور حد سے تجاوز کر گیا اور دور رس گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں، اس لیے کہ (ایک) مسلمان (کسی دوسرے) مسلمان کو ایک بہترین وصیت ہی کر سکتا ہے کہ وہ اسے آخرت کے لیے جوش دلائے اور اسے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دے۔ سو اللہ تعالیٰ نے جس بات سے تجھے ڈرایا ہے، اس سے اجتناب کرو، اس سے بہتر نہ تو کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے افضل کوئی ذکر ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اسی کے لیے ہے جس نے اپنے رب کے خوف اور ڈر سے اس پر عمل کیا۔ تم آخرت کی جس بات کے طالب ہو اس کے لیے یہ بہترین اور سچا معاون ہے۔

جس نے ظاہر و باطن میں اپنے رب کے اور اپنے درمیان رشتوں کو درست کیا اور اس میں اس کی نیت صرف اللہ کی ذات ہوئی تو یہ بات اس کے دنیاوی معاملات کے لیے نصیحت اور مرنے کے بعد والی زندگی میں ذخیرہ ثابت ہوگی جب کہ بندہ اپنے توشہ آخرت کا محتاج ہوگا اور اگر اس کے علاوہ کوئی بات ہوئی تو وہ پسند کرے گا کہ اس کے اور اس کی اس بات کے درمیان طویل فاصلہ حائل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی ذات کے بارے میں احتیاط کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کا قول سچا ہے اور جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس میں کوئی

خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں: ''میرے ہاں قول میں تبدیلی نہیں ہوتی اور نہ میں اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والا ہی ہوں، اس لیے اپنے دنیوی اور اخروی معاملات میں، پوشیدہ طور پر اور ظاہری طور پر اللہ سے ڈرتے رہو کیونکہ جو اللہ عزوجل سے ڈرتا ہے وہ اس کے گناہوں کو دور کر دیتا ہے اور اسے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ جو اللہ سے ڈرا اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ اللہ کا خوف اس کی نفرت سے بچاتا ہے اور اس کے عذاب سے نجات دلاتا ہے اور اس کی ناراضی سے بندے کو محفوظ ومصئون رکھتا ہے۔ اللہ کا تقویٰ اور خوف چہروں کو عزت ووجاہت بخشتا ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کی رضا کا باعث ہوتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔ اپنا مقدر پاؤ اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں تفریط سے کام نہ لو۔ اس نے تمھیں اپنی کتاب کا علم دیا اور اپنا راستہ واضح کر دیا تاکہ وہ تم میں سے جھوٹے اور سچے لوگوں کی پہچان کر سکے۔ اس وجہ سے اللہ کے لیے بھلائی اختیار کرو جس طرح اس نے تم پر احسان کیا ہے۔ اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو، اللہ کی خاطر جہاد کا حق ادا کرو، اس نے تمھیں منتخب کیا اور چنا ہے اور تمھیں مسلمان کا لقب دیا ہے تاکہ دلائل سے محروم ہونے والا ہلاک ہو اور دلائل کا سہارا پانے والا زندہ رہے۔ قوت تو صرف اللہ ہی کی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو۔ آج کے بعد زندگی کے لیے عمل کرو کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اپنے رشتوں کی اصلاح کر لیتا ہے تو وہ لوگوں کے فیصلے کرتا ہے مگر لوگ اللہ کے فیصلے نہیں کر سکتے۔ وہ انسانوں کا مالک ہے، انسان اس کے مالک نہیں ہیں۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ اللہ عظیم کے سوا اور کوئی قوت وطاقت کا سرچشمہ نہیں۔''

چونکہ آپؐ معدن علم وحکمت تھے، اس لیے آپؐ نے اپنی امت کو علم وحکمت کے خطبات سے بھی نوازا۔ ایک خطبہ میں آپ ﷺ نے دنیا اور اس کے انجام کے بارے میں متنبہ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ایک روز نماز عصر کے بعد آپ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اِنَّ الدُّنْیَا خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ اَلَا وَاِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِیْهَا فَنَاظِرٌ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوْا الدُّنْیَا وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ اَلَا لَا یَمْنَعَنَّ

رَجُلًا مَخَافَةُ النَّاسِ اَنْ يَقُوْلَ الْحَقَّ اِذَا عَلِمَهٗ (وَلَمْ يَزَلْ يُخْطُبُ حَتّٰى لَمْ تَبْقَ مِنَ الشَّمْسِ اِلَّا حُمْرَةٌ عَلٰى اَطْرَافِ السَّعَفِ فَقَالَ) اِنَّهٗ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا فِيْمَا مَضٰى اِلَّا كَمَا بَقِيَ مِنْ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْمَا مَضٰى)) (اعجاز القرآن: ص ۱۱۳، جمھرۃ خطب العرب: ۱/۵۴)

".......یہ دنیا ہے تو سرسبز اور شیریں لیکن خبردار رہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس دنیا میں اس لیے رکھا ہے کہ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ سو دنیا کے بارے میں تقویٰ اختیار کرو اور عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ سن لو کسی آدمی کا خوف تمھیں حق بات کہنے سے نہ روکے، اگر اسے پتہ چل جائے کہ یہ بات حق ہے۔ (آپؐ اپنا یہ خطبہ ارشاد فرماتے ہی رہے حتیٰ کہ سورج مغرب میں چھپنے لگا لیکن سورج کی کچھ سرخی کھجوروں کے پتوں کے آس پاس باقی رہ گئی۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا) دنیا کی عمر کا اتنا حصہ بھی باقی نہیں رہا جتنا کہ تمھارے آج کے سورج کا حصہ باقی رہ گیا ہے۔"

اسی طرح ایک خطبہ میں آپ ﷺ نے لوگوں کو یہ بتایا کہ زندگی کے جو یہ چند روز تمھیں ملے ہیں ان فرصت کے لحات کو غنیمت جانو اور اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت اور اس کی رضا کے حصول کے لیے گزارو۔ آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا:

ایھا الناس ان لکم معالم فانتھوا الی معالمکم وان لکم نھایة فانتھوا الی نھا یتکم ، فان العبدبین مخافتین ، اجل قد مضی لا یدری ما الله فاعل فیه ، واجل باق لا یدری ما الله قاض فیه فلیاخذ العبد من نفسه لنفسه ومن دنیاہ لآخرته ومن الشیبة قبل الکبر و من الحیاۃ قبل الممات فوالذی نفس محمد بیدہ ما بعد الموت من مستعتب ولا بعد الدنیا من دار الا الجنة او النار .))

لوگو! تمھارے لیے کچھ حدیں ہیں، اس لیے اپنی حدوں پر رک جایا کرو۔ تمھارے لیے ایک انتہاء ہے، اپنی اس انتہا پر رک جایا کرو، وجہ اس کی یہ ہے کہ

بندہ دو خوفوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک مدت عمر ہے جو گزر چکی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کے بارے میں کیا کرنے والے ہیں۔ عمر کا ایک حصہ ہے جو باقی رہ گیا ہے۔ اس کے متعلق بھی کسی بندے کو کچھ علم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والے ہیں، اس لیے بندے کو اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ دنیا سے آخرت کے لیے، جوانی سے بڑھاپے کے لیے اور زندگی سے موت کی آمد سے قبل کچھ کر لینا چاہیے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، موت کے بعد اللہ کو راضی کرنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور نہ دنیا کے بعد اور کوئی گھر ہوگا سوائے اس کے کہ یا جنت ہوگی یا جہنم۔''

(البیان والتبیین: ۱/ ۳۰۲، عیون والاخبار: ۲/ ۲۳۱، اعجاز القرآن باقلانی ص: ۱۱۰، جمہرۃ خطباء العرب: ۱/ ۶۵)

اپنے بعض خطبات میں آپؐ نے جہاد ومغازی کے بارے میں ترغیب دی ہے اور شہادت کے فضائل بیان کیے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد کے آداب وغیرہ سکھائے ہیں۔ کچھ خطبات تو خاص مواقع پر آپؐ نے ارشاد فرمائے اور بعض خطبے ایسے ہیں جن میں جہاد کی عام باتوں کی لوگوں کو تلقین کی جیسے کہ غزوۂ تبوک میں آپؐ نے لوگوں کو ان کی روزمرہ کی ضروریات کے بارے میں ان الفاظ میں خطاب فرمایا، اس خطبہ کے چند جملے حسب ذیل ہیں:

راس الحكم مخافة الله، وخير ما القي في القلوب اليقين، والارتياب من الكفر، والنياحة من عمل الجاهلية، والغلول من جمر جهنم، والسكركن من النار، والشعر من ابليس، والخمر جماع الاثم، والنساء حبالة الشيطان، والشباب شعبة من الجنون، وشر المكاسب كسب الرباء، وشر الماكل مال اليتيم، والسعيد من وعظ بغيره، والشقي من شقي في بطن امه، وانما يصير احدكم من موضع اربعة اذرع، والامر إلى الآخرة، وملاك العمل خواتمه.))

''دانائیوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، اور دلوں کی سب سے پسندیدہ چیز یقین ہے۔ شک پیدا کرنا کفر کا ایک حصہ ہے اور میت پر نوحہ کرنا اور بین کرنا جاہلیت کا عمل ہے۔ خیانت جہنم کی آگ ہے اور شراب کا پینا دوزخ کی آگ میں داغے جانے کے مترادف ہے۔ اور (برا) شعر ابلیس کی طرف سے ہے۔ شراب تمام گناہوں کی جڑ ہے، عورتیں شیطان کے پھندے ہیں اور سب سے بری خوراک یتیم کا مال ہے، سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے اور بدبخت وشقی تو ماں کے پیٹ میں ہی ایسا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو چار ہاتھ کے گڑھے میں جانا ہے اور معاملہ آخرت پر منحصر ہے، اور عمل کا مدار اس کے انجام پر ہے۔''

(البدایہ والنہایہ: ۵/ ۱۷، زاد المعاد: ۳/ ۵۴۱، دلائل النبوۃ بیہقی: ۵/ ۲۴۱، واقدی، المغازی: ۳/ ۱۰۱۶)

اسی طرح خطبۂ احد میں جہاد کی ترغیب کے ساتھ عام نوعیت کی تعلیمات بھی ارشاد فرمائیں، چنانچہ خطبہ کے آغاز ہی میں فرمایا:

((یـا ایها الناس! اوصیکم بما اوصانی الله فی کتابه من العمل بـطـاعـتـه، والتـنـاهی عن محارمه، ثم انکم الیوم بمنزل اجرو ذخـر لمن ذکر الذی علیه ثم وطن نفسه له علی الصبر والیقین والـجـدّ والنشاط، فان جهاد العدو شدید، شدید کربه، قلیل من یصبر علیه الا من عزم الله رشده.)) (سبل الہدی والرشاد: ۴/ ۱۸۹)

''لوگو! میں تمہیں وہی وصیت کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اطاعت وفرمان برداری اور محرمات سے بچنے کے لیے مجھے کی ہے۔ آج تم اجر وثواب کے مقام پر کھڑے ہو۔ جس شخص نے اپنے آپ کو ذکر (یعنی قرآن حکیم) پر قائم کرلیا اور پھر اس نے اپنے نفس کو صبر، یقین، جہد مسلسل اور شرح صدر پر آمادہ کرلیا تو وہ شخص کامیاب وکامران ہے۔ دشمن سے جہاد کرنا بہت مشکل کام ہے اور وہ لوگ بہت کم ہیں جو اس صبر آزما مرحلے میں ثابت قدم رہتے ہیں

سوائے ان لوگوں کے جن کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمالیا ہو۔"

اپنے ایک خطبہ میں سرکار دو عالم ﷺ نے جہاد کی فضیلت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

((ان الجهاد فی سبیل الله والایمان بالله افضل الاعمال ، فقام رجل فقال: یا رسول الله ﷺ! ارایت ان قتلت فی سبیل الله تکفر عنی خطایای؟ فقال رسول الله ﷺ: "نعم ، ان قتلت فی سبیل الله وانت صابر ، محتسب مقبل غیر مدبر" ثم قال رسول الله ﷺ: "کیف قلت؟" قال: "ارایت ان قتلت فی سبیل الله اتکفر عن خطایای؟ فقال رسول الله ﷺ: "نعم ، وانت صابر محتسب مقبل غیر مدبر الا الدین ، فان جبرائیل علیه السلام قال لی ذالك .))

(مسلم: رقم ۱۸۸۵، مسند احمد: رقم ۸۰۱۲، ترمذی: رقم ۱۷۱۸)

"جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ، ایمان کی افضل ترین صورتیں ہیں۔ یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: "ہاں۔ بشرطیکہ تو راہ خدا میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تو صبر کرنے والا، ثواب آخرت کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا۔ پھر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: "تم نے کیا کہا تھا؟" اس شخص نے عرض کیا: "اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ عمل میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، بشرطیکہ تو اللہ کی راہ میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تو صبر کرنے والا، ثواب کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا، سوائے قرض کے (کہ وہ کسی صورت معاف نہ ہوگا) کیونکہ جبریل علیہ السلام نے ابھی ابھی مجھے یہ بات بتائی ہے۔"

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کا خطبہ:

۸ ہجری میں سرکار دو عالم ﷺ نے مکہ کو فتح کیا۔ اس مبارک فتح کے موقع پر قلب مبارک بے حد مسرور اور ہر بن مُو شکر خداوندی میں رطب اللسان تھا کہ آج اس شہر میں ان مظلوموں کی معیت میں فاتحانہ غلبہ حاصل ہوا ہے جن پر یہاں تیرہ سال ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور حالت احرام میں نہ ہونے کے باعث صرف طواف ہی پر اکتفا کیا۔ طواف کے وقت آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک کمان (اور بعض روایات کے مطابق ایک چھڑی) تھی اور بیت اللہ کے گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ ﷺ اسی کمان سے ان بتوں کو ٹھوکر مارتے جاتے اور کہتے جاتے:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (الاسراء۱۷:۸۱)

”حق آ گیا اور باطل چلا گیا، بے شک باطل جانے والی چیز ہے۔“

طواف سے فارغ ہونے کے بعد سیدنا عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان سے کعبۂ مشرفہ کی کنجیاں لیں اور پھر آپ ﷺ کے حکم سے دروازہ کھولا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے بیت اللہ کے اندر ہر طرف تصویریں ہیں جن میں سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں بھی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں فال گیری کے تیر تھے۔ یہ دیکھ کر فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو ہلاک کرے۔ اللہ کی قسم! ان پیغمبروں نے کبھی بھی فال کے تیر استعمال نہیں کیے تھے۔ آپ ﷺ نے بیت اللہ کے اندر لکڑی کی ایک کبوتری بھی دیکھی جسے آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے توڑ دیا اور تمام تصویروں کو آپ ﷺ کے حکم سے مٹا دیا گیا اور پھر بیت اللہ کو آبِ زمزم سے دھو دیا گیا۔ اس وقت آپؐ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ (زرقانی:۲/۳۳۲، فتح الباری:۸/۱۴)

بیت اللہ کے اندر داخل ہو کر آپ ﷺ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس وقت سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ بیت اللہ کے تمام گوشوں میں پھر خلیل اللہ کے اس وارث نے توحید وتکبیر کی آواز کو بلند کیا۔ فارغ ہو کر دروازہ کھولا۔

دیکھا کہ صحن مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ سب منتظر ہیں کہ زبان رسالت سے ان دشمنوں اور مجرموں کے متعلق سزا کے کیا احکام صادر ہوتے ہیں۔

نبی رحیم و کریم ﷺ نے کعبہ کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ لیے اور باب کعبہ پر کھڑے ہو کر قریش کے اجتماع کے سامنے چند بنیادی اصولوں کا اعلان فرمایا۔ یہ خطبہ ایک فاتح پیغمبر ﷺ کا خطبہ تھا جو انسان کو آداب انسانیت سکھانے کے لیے آیا تھا اور جس نے ماضی کی داستان کو گلدستۂ طاق نسیان بنا کر ان لوگوں کو مستقبل کی شاہراہوں کی طرف ان الفاظ میں راہ نمائی فرمائی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

((لا الہ الا اللہ وحدہ لا شريك له، صدق وعده، ونصر عبده، وهزم الاحزاب وحده، الا كل ماترة او دم او مال يدعى فهو تحت قد مى ها تين، الا سدانة البيت وسقاية الحاج الا وقتل الخطا مثل العمد بالسوط والعصا، فيهما الدية مغلظة منها اربعون خليفة في بطونها او لادها۔ يا معشر قريش ان الله قد اذهب عنكم نخوة الجاهلية وتعظمها بالآباء الناس من آدم، وآدم خلق من تراب، ثم تلا: يا ايها الناس! انا خلقناكم من ذكر و انثى وجعلنا كم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اكرمكم عند الله اتقاكم، (الآية) يا معشر قريش! ما ترون انى فاعل بكم؟ قالوا خيرا اخ كريم وابن اخ كريم، قال: اذهبوا فانتم الطلقاء.))

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا اور تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ کوئی ساجھی، اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست دی۔

ہر ایک رسم وریت، کسی بھی خون یا مال کا مطالبہ جو روایتی طور پر چلا آرہا ہے، آج سے وہ سب میرے پاؤں کے نیچے ہے یعنی سب ختم ہے مگر بیت اللہ کی

دربانی اور کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام یعنی پرانی رسم و رواج کے بعد یہ دو منصب باقی رہیں گے۔

یہ بھی سن لو کہ کوئی شخص غلطی سے مارا جائے یا کوڑے اور لاٹھی کی ضرب سے کوئی مر جائے جس کو شبہ عمد کہا جاتا ہے، اس میں دیت مغلظہ ہوگی یعنی سو اونٹ جن میں چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں گی۔

اے قریش کے لوگو! جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کا غرور جو تمھارے اندر تھا کہ ہم سب سے اونچے ہیں، اور جاہلیت کی یہ نخوت کہ باب دادا کی عظمت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کا خاتمہ فرما دیا ہے۔ اب ایک ہی حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں باعزت اور ذی وقار شخص وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو یعنی جو سب سے زیادہ خداشناس اور خدا ترس ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔" (البدایہ والنہایہ: ۴/ ۳۰۱، الروض الانف: ۲/ ۲۷۴، طبری: ۳/ ۱۲، ابن الاثیر: ۲/ ۱۲۱، سیرۃ ابن ہشام: ۲/ ۲۷۳، اعجاز القرآن باقلانی: ص۱۱۲، جمہرۃ خطب العرب: ۱/ ۵۲)

انسان کی حرص کے بارے میں خطبہ:

انسان فطری طور پر حریص پیدا کیا گیا ہے۔ موت ایک یقینی چیز ہے لیکن وہ دوسروں کے لیے موت کا تصور تو رکھتا لیکن اپنے بارے میں یہی سمجھتا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ اس دنیا میں رہنا ہے گویا سب کو موت آنی ہے لیکن مجھے نہیں آنی۔ ایسے غافل انسان کے لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپ نے فرمایا:

((ایها الناس! کان الموت فیها علی غیر نا قد کتب، وکان

الحق فيها على غيرنا قد وجب، وكان الذى نشبع من الاموات سفر عما قليل الينا راجعون، نبوئهم اجداثهم ونأكل من تراثهم، كأنا مخلدون بعدهم، ونسينا كل واعظة، وامنا كل جائحة، طوبى لمن شغله عيبه عن عيوب الناس، طوبى لمن انفق مالا اكتسبه من غير معصية وجالس اهل الفقه والحكمة، وخالط اهل الذل والمسكنة. طوبى لمن زكت وحسنت خليقته وطابت سريرته، وعزل عن الناس شره، طوبى لمن انفق الفضل من ماله، وامسك الفضل من قوله، ووسعته السنة ولم تستهوه البدعة.))

(صبح الاعشیٰ:۱/۲۱۳،جمہرۃ خطب العرب:۱/۵۲)

''اے لوگو! ہم کچھ یوں تصور کرتے ہیں کہ جیسے اس دنیا میں موت تو ہمارے علاوہ دوسروں کا مقدر ہے۔اس دنیا میں حقوق بھی دوسروں کے ذمہ ہی واجب ہیں، گویا ہم جن مرنے والوں کو رخصت کرتے وہ کوئی مسافر ہیں جو عنقریب ہمارے پاس لوٹ کر آنے والے ہیں، ہم انھیں قبروں میں سپرد خاک کرتے اور ان کی میراث ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم نے ان کے بعد ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ ہم ہر عبرت کو گلدستۂ طاق نسیان بنا بیٹھے اور تباہی سے خود کو محفوظ ومصئون سمجھ بیٹھے۔ اس شخص کے لیے اچھائی ہے جسے اس کے عیبوں نے لوگوں کے عیوب سے غافل کر دیا۔ بھلائی ہے اس کے لیے جس نے اللہ کی راہ میں ایسا مال خرچ کیا جو اس نے کسی گناہ یا غلط طریقہ سے نہیں کمایا تھا۔ جو شخص اہل فقہ وحکمت کی صحبت میں بیٹھا اور بے کسوں اور ناداروں سے میل جول رکھا! خوش خبری ہے اس کے لیے جس کی فطرت وجبلت پاکیزہ اور اچھی ہے۔ جس کا باطن پاک اور لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں۔ مبارک باد ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنا فالتو مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اپنی فالتو بات اپنے منہ ہی میں روک

لی، جسے سنت پر پورا پورا عمل میسر آیا اور بدعت اس کے لیے باعث ہوس نہ بنی۔“

بنی نہد کے جواب میں خطبہ:

اس دور میں یہ دستور تھا کہ ایک قبیلہ کا خطیب اٹھتا اور وہ اپنے خطبہ میں اپنے مقاصد کو بیان کرتا۔ پھر اس کے جواب میں دوسرے قبیلہ کا خطیب اٹھ کر اپنے خطبے میں اس کے مقاصد کی تائید یا تردید کرتا، چنانچہ کتابوں میں ایک خطبہ بنی نہد کے خطیب کے جواب میں بھی ملتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اللهم! بارك لها في محضها ومخضها ومذقها، وابعث راعيها في الدثر بيانع الثمر، وافجر له الثمد وبارك له في المال والولد من اقام الصلاة كان مسلما، ومن اتى الزكاة كان محسنا، ومن شهد ان لا اله الا الله كان مخلصا، يا بني نهد لكم ودائع الشريك ووضائع الملك لا تلطط في الزكاة ولا تلحد في الحياة ولا تتثاقل عن الصلاة .))

(الشفا: قاضی عیاض ا/۱۶۹، العقد الفرید: ا/۱۱۳، جمہرۃ خطب العرب: ا/ ۱۰۸)

”اے اللہ! اس قبیلہ نہد کی خالص دودھ، دہی کی لسی اور دودھ کی لسی میں برکت عطا فرما، ان کے چرواہے کو سب کے مویشیوں کا نگہبان بنا، ان کے لیے پانی کے چشمے نکال اور ان کے مال و اولاد میں برکت عطا فرما۔ جس نے نماز قائم کی وہ مسلمان ہوگیا، جس نے زکوۃ دی وہ بھلائی کرنے والا ہوا اور جس نے گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ مخلص اور پاکیزہ ہوگیا۔ اے بنی نہد! تمھیں شریک کار کی امانت اور مملکت کے وظائف کا حق حاصل ہوگا۔ زکوۃ کے معاملہ میں رکاوٹ نہ ڈالنا، زندگی میں کج روی اختیار نہ کرنا اور نماز میں سستی اور کاہلی نہ کرنا۔“

خیف میں سرکار دو عالم ﷺ کا خطبہ:

خیف منیٰ میں ایک مقام ہے جہاں آج کل ”مسجد خیف“ کے نام سے ایک نہایت

شاندار مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس مقام خیف پر آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے فرامین اور اپنی احادیث کی دوسروں تک تبلیغ کے بارے میں ارشاد فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید کی کہ اپنی زندگی کا مقصد آخرت کو بنائیں تو دنیا ناک رگڑتی ہوئی ان کے پاس آئے گی اور چودہ سو سال کے واقعات نے اس بات کو سچا بھی کر دکھایا۔ فرمایا:

((نضّر الله عبد اسمع مقالتی فوعَاها ثم ادا ها الی من لم یسمعها، فرب حامل فقه لافقه له، ورب حامل فقه الی من هو افقه منه ثلاث لا یغل علیهن قلت المومن: اخلاص العمل لله والنصیحة لاولی الامر، ولزوم الجماعة، ان دعوتهم تکون من ورائه، ومن کان همه الآخرة جمع الله شمله، وجعل غناه فی قلبه، واتته الدنیا وهی راغمة، ومن کان همه الدنیا فرق الله امره وجعل فقره، بین عینیه ولم یاته من الدنیا الا ما کتب له.)) (اعجاز القرآن، باقلانی: ص ۱۱۲، جمہرۃ خطب العرب: ۵۴)

"اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازگی بخشے جس نے میری بات سنی، اسے یاد کر لیا اور پھر اسے اس شخص تک پہنچایا جس نے یہ بات نہ سنی تھی، کیونکہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ فقہ کا حامل سمجھ سے عاری ہوتا ہے یعنی حامل فقہ غیر فقیہ ہوتا ہے اور کوئی حامل فقہ اپنے سے زیادہ سمجھ رکھنے والے سے رجوع کرتا ہے۔ تین باتیں ایسی ہیں جن پر کسی مومن کا قلب کینہ کا شکار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلصانہ عمل، اہل حکومت کی خیر خواہی اور جماعت کی پابندی۔ ان کی دعا اس کے لیے ہوگی جس کا مقصد آخرت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے دل جمعی عطا کرے گا۔ اور اس کی تونگری کو اس کے دل سے وابستہ کر دے گا اور دنیا اس کے پاس ناک رگڑتی ہوئی آئے گی اور جس کا مقصد حصول دنیا ہوگا اللہ تعالیٰ اس کے معاملہ کو انتشار سے دوچار کر دے گا۔ اس کا افلاس اس کی آنکھوں میں ظاہر کر دے گا اور دنیا میں سے تو اسے وہی کچھ ملے گا جو اس کے لیے لکھا جا چکا ہے۔"

خطبہ حجۃ الوداع:

۲۳ سال کی شبانہ روز دعوت وتبلیغ اور جہد مسلسل اور متعدد غزوات وسرایا سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوگئے۔ دور دراز کے قبائل اور وفود بارگاہِ نبوتؐ میں آ کر توحید خداوندی اور رسالت محمدیؐ کا اقرار کر کے اور کفر وشرک سے تائب ہو کر اسلام کی دعوت کو دل وجان سے قبول کر چکے۔ ۹ ہجری میں کعبہ کو مراسم جاہلیت سے بالکل پاک کر دیا گیا۔ اب ہاتف غیبی آپ ﷺ کے قلب وشعور کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ اب دنیا میں قیام کا دور اختتام پذیر ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بارے میں بتا بھی دیا تھا کہ اب میں اس دنیا سے جانے والا ہوں۔ ۱۰ ہجری میں آپ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انھیں رخصت فرماتے ہوئے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا: اے معاذؓ! غالباً اس سال کے بعد تم مجھ سے نہیں مل سکو گے بلکہ میری اس مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو گے۔ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ جملہ سن کر سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ رونے لگے۔

دین کی ہر بات آپ ﷺ نے امت کو بتا دی اور اس کا عملی نمونہ بھی دکھا دیا تھا لیکن سنت ابراہیمی کے مطابق حج کیسے کیا جاتا ہے، ابھی آپؐ نے یہ امت کو نہیں بتایا تھا۔ ۹ ہجری میں اگرچہ آپ ﷺ نے حج کی فرضیت کے بعد سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا اور انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کو اس فریضہ سے روشناس کرایا لیکن لوگوں کی معیت میں اعلان نبوت کے بعد ایک دفعہ بھی آپؐ نے امت کو حج کر کے نہیں دکھایا تھا۔ ہجرت سے قبل اگرچہ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق آپؐ نے دو حج کیے تھے لیکن وہ حج کس طریقہ سے کیے، امت کو اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا، اس لیے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ امت کو مناسک حج کے بارے میں بتایا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ حج کے بارے میں سنت ابراہیمی کیا ہے؟

علاوہ ازیں دین کے لیے اور دین کی دعوت کے لیے آپ ﷺ نے ۲۳ سال شبانہ روز گوناگوں مشکلات اور تکالیف برداشت کیں۔ طائف میں پتھر کھائے تو مکہ میں اونٹ کی

اوجھڑی سجدہ کی حالت میں اپنے اوپر ڈلوائی۔ احد میں دندان مبارک شہید کروائے تو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کے اولین ساتھیوں نے بھی یہ مشقتیں برداشت کیں۔ اب آپؐ جاننا چاہتے تھے کہ میری محنت کا نتیجہ کیا کچھ ہے؟ کیونکہ ایک وقت وہ تھا کہ جب مٹھی بھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی، بے سروسامان کفر کے سامنے لا کر میدان بدر میں کھڑے کر دیئے اور خود خالق ارض سما کے حضور سر بہ سجود ہو کر یہی دعا کی کہ "الٰہی! میری پندرہ سال کی یہی کمائی ہے کفر جس کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، اس کو تیری نصرت اور مدد چاہیے، کیونکہ اگر یہ مٹھی بھر لوگ کفر نے نیست نابود کر دیئے تو پھر قیامت تک تیری عبادت کوئی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دعا قبول فرمائی اور وہ تین سو تیرہ مجاہد بے سروسامانی کے باوجود کامیاب وکامران ہوئے۔ اس کے بعد کے آٹھ سالوں کی محنت کا ثمرہ بھی ایک جگہ آپؐ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے اور ان سب سے آپ ﷺ یہ شہادت لینا چاہتے تھے کہ آپ ﷺ نے حق امانت ادا کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام بغیر کسی ردّ و بدل کے لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان سب باتوں کی شہادت آپؐ اپنے کانوں سے سننا چاہتے تھے چنانچہ آپؐ نے اس تاریخی حج کا جس کو بعد میں حجۃ الوداع کا نام دیا گیا، اعلان فرمایا: یہ اعلان ۱۰ ہجری میں کیا گیا جب کہ اس سال کے اکثر مہینے نکل چکے تھے۔ ذی قعدہ کا بھی دوسرا پندھرواڑہ شروع ہو چکا تھا۔

آپ ﷺ کے اس عزم کے افشا ہوتے ہی یہ خبر تمام ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ صحرا کے بادیہ نشین، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بسنے والے، دیہات اور شہروں کے باسی اور دور ونزدیک ہر طرف سے لوگ امنڈ کر مدینہ میں سمٹ آئے۔ مدینہ سے باہر خیموں کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا۔ آپؐ نے خود بھی مختلف جگہوں پر لوگوں کو پیغام بھجوایا کہ اس سال میں خود حج پر جا رہا ہوں لہٰذا اس موقع پر شمولیت کر کے مجھ سے احکام حج سیکھ لو۔ چنانچہ ایک لاکھ (۲۴) ہزار بلکہ اس سے بھی زائد تعداد میں لوگ مدینہ اور اس کے باہر جمع ہو گئے۔ یہی وہ لوگ تھے جو چند سال قبل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ کوئی شخص کسی کی قیادت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن آج مؤدت واخوت کے صدقے میں باہم بھائیوں کا

سا برتاؤ کر رہے تھے۔ ہزاروں نو وارد مسلمان جوق در جوق مدینہ طیبہ پہنچ کر اس کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے اور ہر بشر خندہ رو، چہرے سے مسرت و شادمانی آشکار اور اتحاد و اتفاق میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح تھا اور ہر ایک کی آرزو اور خواہش یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے نقش پا کو اپنے لیے نشان راہ بنائے اور آپؐ کی پیروی کر کے منزل مقصود حاصل کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کا یہ مبارک سفر ۲۵ ذی قعدہ ۱۵ ہجری مطابق ۲۲ فروری ۶۳۲ء کو ظہر اور عصر کے درمیان مدینہ منورہ سے شروع کیا۔ وہ ہفتہ کا دن تھا۔

(سیرۃ ابن ہشام: ۴/ ۲۴۸، طبقات ابن سعد: ۲/۱۷۳)

کتابوں میں آپ ﷺ کے ساتھ جانے والوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس سے کچھ زائد آئی ہے۔ نماز ظہر آپؐ نے مدینہ طیبہ میں پڑھی اور عصر ذوالحلیفہ میں۔ یہاں سے آپؐ نے حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھا اور لبیک کی آواز بلند کی۔ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بھی اس سفر میں آپؐ کے ہمراہ تھیں۔ زائرین کعبہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے پیچھے پیچھے صدائے لبیک بلند کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ خانۂ خدا کی زیارت اور حج بیت اللہ کی خوشی سے دل بلیوں اچھل رہے تھے اور تمام قافلہ دو چادروں میں ملبوس یک رنگ اور یک لباس مساوات کا ایک نادرۂ روزگار نمونہ پیش کرتے ہوئے زبان پر تلبیہ کا ورد لیے خلوص نیت سے اپنے پروردگار کی زیارت کے لیے اپنا سفر جاری کیے ہوئے تھا۔ ۸ ذی الحجہ کے روز آپؐ منیٰ تشریف لے گئے۔ ۹ ذی الحجہ کو آپؐ عرفات پہنچے اور اپنی ناقہ قصواء پر بیٹھ کر آپ ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا: جو دنیا میں انسانی حقوق کا سب سے پہلا چارٹر ہے اور دنیا اتنی ترقی کرنے کے باوجود انسانی حقوق کا اس سے بہتر چارٹر پیش نہیں کر سکی:

((الحمد لله نحمد ونستعينه ونستغفره ونتوب اليه، ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، واشهد ان محمدا عبده ورسوله،

اوصيكم عباد الله بتقوى الله، واحثكم على طاعته واستفتح بالذى هو خير، امابعد:

ايها الناس! اسمعوا منى ابين لكم فانى لا ادرى لعلى لا القاكم بعد عامى هذا فى موقفى هذا، ايها الناس ان دماء كم واموالكم حرام عليكم الى ان تاتوار بكم كحرمة يومكم هذا فى شهر كم هذا فى بلدكم هذا.

الاهل بلغت؟ اللهم اشهد!

فمن كانت عنده امانة فليودها الى الذى ائتمنه عليها وان ربا الجاهلية موضوع، وان اول ربا أَبْدَأُ به ربا عمى العباس بن عبدالمطلب، وان دماء الجاهلية موضوعة وان اول دم نبدابه دم عامر بن ربيعة الحارث بن عبدالمطلب وان ما ثر الجاهلية موضوعة غير السدانة والسقاية، والعمد قود، وشبه العمد ما قتل بالعصار والحجر، وفيه مائة بعير، فمن زاد فهو من الجاهلية.

ايها الناس! ان الشيطان قد يئس ان يعبد فى ارضكم هٰذه ولٰكنه قد رضى ان يطاع فيما سوى ذلك مما تحقرون من اعمالكم ايها الناس! انما النسى زيادة فى الكفر يضل به الذين كفروا يحلّونه، عاماً ويحرمونهٗ عاما ليوا طئوا عدة ما حرم الله فيحلوا ما حرم الله، ان الزمان قد استداركهيئته يوم خلق الله السموات والارض، ان عدة الشهور عند الله اثنى عشر شهرا فى كتاب الله يوم خلق السموت والارض منها اربعة حرم، ثلاثة متواليات وواحد فرد، ذوالقعدة و ذوالحجة والمحرم، ورجب الذى بين جمادى وشعبان.

الاهل بلغت؟ اللهم اشهد،
ايها الناس! ان لنسائكم عليكم حقا، ولكم عليهن حق، لكم عليهن الا يوطئن فراشكم غير كم، ولا يدخلن احدا تكرهونه بيوتكم الا باذنكم ولا ياتين بفاحشة مبينة، فان فعلن فان الله قد اذن لكم ان تعضلوهن وتهجروهن فى المضاجع، وتضربوهن ضربا غير مُبَرِّح فان انتهين واطعنكم فعليكم رزقهن وكسوتهن بالمَعروف، وانما النساء عند كم عوان لا يملكن لا نفسهن شيئا، اخذ تموهن بامانة الله استحللتم فروجهن بكلمة الله فاتقوا الله فى النساء واسترصوا بهن خيرا.
الاهل بلغت؟ اللهم اشهد
ايها الناس! انما المومنون اخوة، ولا يحل لامرى مسلم مال اخيه الا عن طيب نفس منه، الاهل بلغت؟ اللهم اشهد، فلا ترجعن بعدى كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض، فانى قد تركت فيكم ما ان اخذتم به لن تضلوا بعده كتاب الله.
الا هل بلغت؟ اللهم اشهد.
ايها الناس! ان ربكم واحد، وان اباكم واحد، كلكم لادم وادم من تراب، اكرمكم عند الله اتقاكم، ان الله عليم خبير، وليس لعربى على عجمى فضل الا بالتقوى.
الا هل بلغت؟ اللهم اشهد.
قالوا: نعم! قال: فليبلغ الشاهد الغائب.
ايها الناس: ان الله قسم لكل وارث نصيبه من الميراث، فلا تجوز لوارث وصية ولا تجوز وصية فى اكثر من الثلث و

الولد للفراش، وللعاهر الحجر، من ادعى الى غير ابيه او تولى غير مواليه فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين، لا يقبل منه صرف ولا عدل والسلام عليكم ورحمة الله و بركاته.)) (الروض الانف:۲/۳۵۱،البیان والتبیین:۲/۳۱،طبری:۲/ ۱۶۸،ابن الاثیر:۲/۱۴۶،اعجاز القرآن باقلانی:ص۱۱۱،العقد الفرید:۲/۱۳۰)

''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے مغفرت چاہتے ہیں اور اسی طرف رجوع کرتے ہیں، اپنے نفسوں کی برائیوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں، جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کرے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

اے اللہ کے بندو! میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور اس کی اطاعت کے لیے جوش دلاتا ہوں۔ میں اسی سے آغاز کرتا ہوں جو سراپا خیر ہے۔

امابعد، اے لوگو! میری باتیں سن لو جو میں تمھارے سامنے بیان کرتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ شاید اس سال کے بعد میں اس جگہ پر تم کو نہ مل سکوں۔ لوگو! تمھاری جان ومال تم پر حرام ہے حتیٰ کہ تم اپنے رب سے مرنے کے بعد ملو، بالکل اسی طرح جس طرح تمھارا یہ دن تمھارے اس مہینے میں تمھارے اس شہر میں۔

ہاں تو کیا میں نے اچھی طرح (اللہ کا پیغام پہنچا دیا، اے اللہ! گواہ رہنا۔

جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ اس شخص کو واپس کر دی جائے جس نے وہ امانت اس کے سپرد کی تھی۔ جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا اور سب سے پہلا سود جسے ختم کرنے کی میں ابتدا کرتا ہوں، میرے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ جاہلیت کے خون بھی ختم کیے جاتے ہیں اور ہم جس خون سے ابتداء کر رہے ہیں وہ عامر بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔ دور جاہلیت کی تمام

فضیلتیں بھی ختم کر دی گئی ہیں سوائے خدمت بیت اللہ اور حاجیوں کو پانی پلانے کی فضیلت کے۔ قتل عمد میں قصاص ہے۔ قتل عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے ہو۔ اس میں سو اونٹ ہیں۔ اس لیے کسی نے اگر اس پر اضافہ کیا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔

اے لوگو! شیطان اس بات سے یک قلم مایوس ہو گیا ہے کہ تمھاری اس سرزمین میں اس کی پرستش کی جائے مگر وہ اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس کے علاوہ تمھارے اعمال کی حقیر سی باتوں میں اس کی بات مانی جاتی رہے گی۔

اے لوگو! مہینوں کا پیچھے کر دینا کفر میں بڑھ جانا ہے۔ اس سے کافر لوگ گمراہ ہوتے ہیں، ایک سال تو اسے حلال قرار دے دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تا کہ ان مہینوں کی گنتی کے مطابق کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں اور یوں جسے اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر دیں؟ زمانے کا چکر تو اسی ہیئت کے مطابق ہو گیا ہے جو اس دن تھی جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہے، جو اللہ کے نوشتے میں اس وقت سے ہیں جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، تین تو متواتر ہیں اور ایک الگ ہے۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم کے علاوہ رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان آتا ہے۔

ہاں تو کیا میں نے (اپنی رسالت کا پیغام) اچھی طرح پہنچا دیا ہے؟ اے میرے اللہ گواہ رہنا!

اے لوگو! تمھاری عورتوں کا تم پر حق ہے اور ان پر تمھارا بھی حق ہے۔ ان پر تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمھارے بستروں پر تمھارے سوا کسی کو نہ آنے دیں اور کسی ایسے شخص کو تمھاری اجازت کے بغیر تمھارے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو، وہ صریح فحاشی کا ارتکاب نہ کریں اگر وہ ایسا کریں تو پھر تمھیں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ تم ان پر سختی کرو۔ بستروں میں ان سے الگ

رہو، انھیں مارو مگر شدید تکلیف والی چوٹ نہ مارو، اگر وہ باز آ جائیں اور تمھاری فرمانبردار بن جائیں تو پھر تم پر ان کے لباس اور خوراک کی معروف طریقے پر ذمہ داری ہوگی، عورتیں تو تمھارے اختیار میں ہیں وہ اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ انھیں تم نے اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور انھیں اللہ کے حکم سے اپنے لیے حلال کیا ہے، تو اس لیے عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، ان کی بھلائی کے لیے کوشاں رہنا۔

کیا میں نے بات اچھی طرح پہنچا دی؟ اے میرے اللہ گواہ رہنا۔ اے لوگو! مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی مسلمان آدمی کے لیے اپنے بھائی کا مال حلال نہیں ہوسکتا مگر یہ کہ وہ خوشی سے کچھ دے دے۔

کیا میں نے بات اچھی طرح پہنچا دی؟ اے میرے اللہ! گواہ رہنا! اور دیکھو میرے بعد دوبارہ کافر بن کر ایک دوسرے کی گردنیں مارنے میں نہ لگ جانا کیونکہ میں نے تمھارے پاس ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم نے اسے تھام لیا تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ ہے کتاب اللہ!

تو کیا میں نے اچھی طرح بات پہنچا دی؟ اے میرے اللہ! گواہ رہنا۔

اے لوگو! تمھارا رب ایک ہے، تمھارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے (بنے) تھے، اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑا متقی ہو، بلاشبہ اللہ علیم وخبیر ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے، کیا میں نے اچھی طرح بات پہنچا دی؟ اے میرے اللہ! گواہ رہنا۔ لوگوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے کہا تو حاضر اس کی اطلاع غائب کو پہنچا دے۔

اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے میراث میں ہر وارث کا حصہ مقرر کر دیا ہے، اس لیے اب وارث کے لیے وصیت جائز نہیں، ایک تہائی سے زیادہ وصیت جائز نہیں۔ بچہ شوہر کی اولاد متصور ہوگا اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔ جس نے خود کو اپنے باپ

کے علاوہ کسی اور سے منسوب کیا یا اپنے آزاد کرنے والے آقاؤں کے سوا کسی اور کا مولیٰ ہونے کا دعویٰ کیا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، اس سے کوئی بدلہ یا معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا، تم پر سلامتی ہو، اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں ہوں۔''

نبی اکرم ﷺ نے اپنے خطبہ میں اور بہت کچھ فرمایا تھا۔ ڈاکٹر نثار احمد خان رئیس کلیہ فنون وصدر شعبہ تاریخ اسلامی، جامعہ کراچی نے نہایت محنت سے مختلف کتابوں سے اس خطبہ حجۃ الوداع کے متن کو تلاش کیا ہے اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔

ہم نے ان کا اردو ترجمہ اپنی کتاب پیغمبر امن ﷺ کے صفحہ ۷۹۴ پر نقل کیا ہے۔ اہل علم وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

مرض الموت میں خطبہ:

حجۃ الوداع میں تکمیل دین کی جو بشارت دی گئی تھی اس کے بعد آپؑ کے جذبات و احساسات اور احوال وظروف بلکہ گفتار و کردار سے بھی یہی ظاہر ہونا شروع ہوگیا تھا کہ اب آپ ﷺ اس دنیا کے باسیوں کو الوداع کہنے والے ہیں۔ چنانچہ حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد آپ ﷺ نے سفر آخرت کی تیاری شروع کر دی اور رفیق اعلیٰ سے جلد از جلد ملنے کا جذبہ آپؑ میں شدت اختیار کرنے لگا۔ اوائل صفر ۱۱ ہجری میں ایک روز آپؑ دامن احد میں تشریف لے گئے۔ آٹھ سال کے بعد شہدائے اُحد پر نماز جنازہ پڑھی۔ پھر جنت البقیع تشریف لے گئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی اور دعا اس طرح فرمائی گویا زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور فرمایا:

''میں تمھارا امیر کارواں ہوں اور تم سے پہلے جا رہا ہوں۔ میرا تم سے حوض کوثر پر ملنے کا وعدہ ہے اور میں اس وقت حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں، اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں اور بخدا مجھے اپنے بعد اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ تم مجموعی طور پر سب کے سب شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ تم دنیا طلبی میں باہم مقابلہ کرو گے اور باہم تنافس میں مبتلا ہو جاؤ

گے اور آپس میں لڑ و گے اور ہلاک ہو گے۔'' (بخاری:۲/ ۸۹۵، زرقانی: ۸/ ۲۵۱)

ماہ صفر کے آخری عشرہ میں ایک روز آپ ﷺ نصف شب کو اٹھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ آپ اپنے ایک غلام ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر دولت کدہ سے باہر تشریف لائے۔ آپ گورستان بقیع میں تشریف لے گئے۔ قبرستان کے وسط میں کھڑے ہو کر اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے فرمایا:

''اے قبروں والو! تم پر سلامتی ہو، لوگ جس حال میں ہیں اس کے مقابل تمھیں وہ حال مبارک ہو جس میں تم ہو یعنی جو بھی تمھاری حالت ہے اس پر خوش رہنے سے جی نہ چراؤ۔ یہ سب کے سب یکساں ہیں۔ دیکھو، فتنے اس طرح ایک کے بعد ایک چلے آرہے ہیں جیسے اندھیری رات میں تاریکی کے پردے یعنی ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا جن میں سے ہر دوسرا پردہ اپنے سے پہلے والے سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ اس کے بعد اہل قبور کو خوش خبری دی کہ ہم بھی عنقریب تم سے ملنے والے ہیں۔''

ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ گورستان بقیع کے باسیوں کے لیے دعائے مغفرت فرمانے کے بعد حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کے خزانے اور زندگانی جاوید یا پھر اس کے مقابلہ میں جنت، ان دونوں میں سے کسی ایک بات کے پسند کرنے کا اختیار فرمایا، مگر میں نے اس دنیا کے خزانوں اور دائمی زندگی کے مقابلے میں اپنے رب کی ملاقات اور جنت کو اختیار کیا ہے۔'' (ابن ہشام:۲/ ۶۴۲، البدایہ والنہایہ: ۵/ ۲۲۴)

عربوں کے ہاں خطبات وصیت کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کے بعض خطبات وصیت کے زمرے میں بھی آتے ہیں، خصوصی طور پر آپ ﷺ نے مرض الموت کے درمیان جو خطبات ارشاد فرمائے جن میں سے چند ایک کا اوپر ترجمہ بھی آیا ہے، ان میں وصیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ بیماری کی حالت میں سرکار دو عالم ﷺ سر پر پٹی باندھ کر گھر

سے باہر تشریف لائے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے اصحاب احد کے لیے دعا کی۔ یہ دعا آپ ﷺ دیر تک فرماتے رہے، پھر فرمایا:

((ان عبدا من عباد الله خيره الله بين الدنيا وبين ما عنده ، فاختار ما عند الله ، قال: ففهمها ابوبكر وعرف ان نفسه يريد ، فبكى وقال: بل نحن نفديك بانفسنا وابناء نا ، فقال على رسلك يا ابابكر ، ثم قال: انظروا هذه الابواب الافظة فى المسجد فسدّوها الابيت ابى بكر ، فانى لا اعلم احدا كان افضل فى الصحبة عندى يداً منه .)) (سیرۃ ابن ہشام:۴/۲۵۷)

''لوگو! اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا اور آخرت اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرے، لیکن اللہ کے اس بندے نے اللہ کے ہاں کی نعمتوں کو اختیار کیا۔ یہ بات کہہ کر آپ ﷺ تو خاموش ہوگئے لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بات کہ تہہ تک پہنچ گئے کہ رسول اللہ ﷺ یہ سب کچھ اپنے ہی بارے میں فرما رہے ہیں، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہماری جانیں اور ہماری اولادیں آپ ﷺ پر قربان ہوں، آپؐ ہمیں یہ کیا سناؤنی سنا رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ! نرمی سے کام لو۔ پھر فرمایا یہ دروازے جو مسجد میں کھل رہے، ان سب کو بند کردو سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے جو اس کے گھر کی طرف سے مسجد میں کھلتا ہے کیونکہ میں کسی بھی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو دست و بازو بن کر صحبت نشین ہونے کے اعتبار سے ابوبکرؓ سے افضل ہو۔

مرض الموت کے دوران میں ایک اور خطبہ:

سیدنا فضل بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں باہر نکل کر آپ ﷺ کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کو سخت بخار تھا، سر درد کے باعث آپ ﷺ نے اپنے سر پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ مجھ سے فرمایا: ''فضلؓ میرا ہاتھ

پکڑو، میں نے آپ کا ہاتھ تھام لیا یہاں تک کہ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ پھر فرمایا لوگوں کو بلاؤ۔ جب لوگ اکٹھے ہوئے تو سرکارِ دوعالم ﷺ نے انھیں ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں فرمایا:

امـابعد! ايها الناس فانى احمد اليكم الله الذى لا اله الا هو، وانه قدد نامنى خفوق من بين اظهركم، فمن كنت جلدت له ظهـرا فهذا ظهرى فليستقد منه، ومن كنت شتمت له عرضا فهـذا عـرضـى فـليستـقدمنه، ومن اخذت له مالا فهذا مالى فـليـاخـذ منه، ولا يخش الشحناء من قبلي فانها ليست من شـانـى، الا وان احبكم الى من اخذ منى حقا ان كان له، او حـلـلنى فلقيت ربى وانا طيب النفس، وقد ارى ان هذا غير مغن عنى حتى اقوم فيكم مرارا.))

(طبری:۱/ ۱۹۱، ابن الاثیر:۲/۱۵۴، جمہرۃ خطب العرب:۱/۶۰)

''حمد وثنا کے بعد اے لوگو! میں تمھارے سامنے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تمھارے درمیان سے میری رحلت کا وقت آ گیا ہے، سو اگر میں نے تم میں سے کسی کی کمر پر مارا ہو تو میری کمر حاضر ہے، وہ اپنا بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر میں نے کسی کی بے عزتی کی ہو تو میری عزت حاضر ہے، وہ اپنا بدلہ لے سکتا ہے، اگر میں نے کسی کا ناجائز مال لیا ہے تو میرا مال حاضر ہے۔ اس میں سے اپنا حق لے لے۔ میری جانب سے کسی قسم کے بغض یا کینے کا اسے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ میری عادت ہی نہیں ہے۔

دیکھو، تم میں سے مجھے سب سے زیادہ وہ شخص پسند ہے جو مجھ سے اپنا حق لے لے، بشرطیکہ یہ اس کا حق ہو، یا پھر مجھے معاف کر دے تاکہ میں اپنے اللہ کے حضور اطمینان سے پیش ہو سکوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید (ایک بار بات کرنا) کافی نہ ہو اور مجھے تمھارے درمیان کئی دفعہ اس طرح کھڑا ہونا پڑے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ منبر سے اترے۔ نماز عصر ادا کی پھر دوبارہ منبر پر تشریف لائے اور پہلی بات کو دہرایا۔ ایک شخص نے تین درہم کا دعویٰ کیا تو آپ ﷺ نے اسی وقت وہ ادا کر دیئے۔ پھر فرمایا:

((ایھا الناس! من کان عندہ شئی فلیودہ، ولا یقل فضوح الدنیا الا وان فضح الدنیا اھون من فضوح الآخرۃ.))

''اے لوگو! جس کے پاس کسی کی کوئی شے ہو تو وہ اسے ادا کر دے اور یہ نہ کہے کہ دنیا کے سامنے رسوائی ہوگی کیونکہ آخرت کی رسوائی کے مقابلہ میں دنیا کی رسوائی آسان تر ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے شہدائے احد کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کی۔ پھر فرمایا:

((ان عبدا خیرہ اللہ بین الدنیا وبین عندہ، فاختار ماعندہ.))

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ دنیا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے ان میں سے ایک کو چن لے چنانچہ اس بندے نے اس چیز کو چن لیا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہ سن کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور فرمانے لگے کہ ہماری جانیں اور ہمارے بیٹے آپؐ پر فدا ہوں۔''

خطبات نکاح:

عرب لوگوں میں خطابت کا ایک اہم حصہ نکاح کے خطبات بھی تھے۔ نکاح کے موقع پر عام طور پر مرد کی جانب سے ایک شخص خطبہ دیتا ہے جس میں وہ اس کے اوصاف، خاندانی فضائل اور قبائلی امتیازات بیان کرتا ہے اور اس نکاح کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کے جواب میں عورت کی جانب سے ایک شخص خطاب کرتا ہے اور مرد کے فضائل کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کے ذاتی اوصاف، اس کے خاندان کے فضائل اور قبیلے کے فضائل ومناقب بیان کرتا ہے۔ مرد کی جانب سے دیا جانے والا خطبہ طویل جب کہ عورت کی جانب سے دیا جانے والا خطبہ مختصر ہوتا تھا۔ (البیان والتبیین: ۱/۱۱۴)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر خطبۂ نکاح ابو

طالب نے پڑھا اور اس کے جواب میں سیدہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد نے خطبہ نکاح پڑھا۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الروض الانف: ۱/۱۲۲، خاتم النبیین، استاذ ابوزہرہ: ۱/۱۶۲، زرقانی: ۱/۱۹۹، فتح الباری: ۷/۱۰۵، عیون الاثر: ۱/۱۱۷، سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۹۰)

سرکار دو عالم ﷺ نے نکاح کے خطبہ کو مسنون قرار دیا ہے، البتہ آپ ﷺ نے اس میں یہ اصلاح فرمائی کہ ذات وصفات، خاندانی فضائل اور قبائلی امتیازات کے بیان کے بجائے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور قرآن حکیم کی چند متعلقہ آیات کی تلاوت کو معمول بنایا ہے جن میں فریقین کے حقوق وفرائض یاد دلا کر ان کو ادائیگی کی تلقین وترغیب دی گئی ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ سے ایک خطبہ ان کی صاحب زادی سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر کتابوں میں منقول ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

((الحمد لله المحمود بنعمته المعبود بقدرته، المرهوب من عذابه، المرغوب فيما عنده، النافذ امره في سمائه وارضه، الذى خلق الخلق بقدرته وميزهم باحكامه واعزهم بدينه واكرمهم بنبيه محمد ﷺ ثم ان الله تعالى جعل المصاهرة نسبا لاحِقًا وامرا مفترضا ووشج به الارحام والزمه الانام، قال تبارك و اسمه وتعالى ذكره، وهو الذى خلق من الماء بشرا فجعله نسبا وصهرا وكان ربُّك قديرًا.

فامر الله يجرى الى قضائه ولكل قضاء قدر ولكل قدر اجل: يمحوا الله ما يشاء ويثبت وعنده ام الكتب، ثم ان ربى امرنى ان ازوج فاطمة من على بن ابى طالب، وقد زوجتها اياه على اربعمائة مثقال فضة، ان رضى بذلك عَلِيٌّ.))

(جمہرۃ خطب العرب: ۳/۳۶۰، زرقانی: ۲/۵)

”تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو اپنی نعمتوں کی وجہ سے قابل ستائش اور

اپنی قدرتوں کی وجہ سے قابل پرستش ہے۔ جس کے عذاب سے ڈرا جاتا ہے اور جس کی طاقت اور قوت کی وجہ سے اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اس کا حکم اس کے آسمان اور زمین میں نافذ ہے۔ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے مخلوق کو پیدا فرمایا اور ان کو اپنے احکام کی تمیز کرائی اور اپنے دین کے ذریعے ان کو عزت بخشی اور اپنے نبی محمد ﷺ کے طفیل ان کو بزرگی عطا کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ازدواجی رشتے کو قرابت کا ذریعہ بنایا اور اسے ایک فرض اور ضروری چیز قرار دیا جس سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور تمام لوگوں کو فطرتاً اس کی طرف راغب کیا چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''وہی ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور نسب اور دامادی کے رشتے مقرر فرمائے اور تیرا پروردگار بڑی قوت اور طاقت والا ہے۔ پس اللہ کے حکموں کا تعلق قضائے الٰہی سے ہے اور قضا کا سلسلہ تقدیر پر ختم ہوتا ہے، ہر قضا کی ایک قدر اور ہر قدر کی ایک اجل مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔ ام الکتاب (لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے پھر یہ کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کو علی رضی اللہ عنہ کے عقد میں دے دوں۔ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو چار سو مثقال چاندی حق مہر کے عوض علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دے دیا اگر علی رضی اللہ عنہ اس پر راضی ہوں۔''

ادعیہ ماثورہ:

انسان جب بھی کسی مشکل میں پڑتا ہے تو اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے رب کو پکارے اور اس سے اپنی مشکلات کا حل چاہے۔ کبھی تو حق تعالیٰ شانہٗ خود اس مشکل کے حل کی دعا تلقین فرما دیتے ہیں اور کبھی پیغمبر اپنے الفاظ میں اللہ کے حضور دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتے ہیں، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چند کلمات سکھائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (الاعراف ۷:۲۳)

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا، اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور خسارے میں ہو جائیں گے۔''

حدیث میں جو دعائیں آئی ہیں وہ سرکار دو عالم ﷺ کے الفاظ ہیں، لیکن ان پاکیزہ دعاؤں میں ایک خاص برکت ہے کہ اگر ان الفاظ کو ایک بندہ عاصی تضرع وابتہال سے پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو مستجاب فرماتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا ہے جو بخاری اور مسلم میں منقول ہے۔ الفاظ اگرچہ سرکار دو عالم ﷺ کے ہیں لیکن الفاظ میں ایک سلاست ہے۔ ایک طرف تو معانی کا بحر بے کراں ہے اور دوسری طرف ان کا پڑھنا اور یاد کرنا نہایت آسان ہے۔ چنانچہ دعا کے الفاظ ہیں:

اللهم اسلمت نفسی الیك ، وفوضت امری الیك ، ووجهت وجهی الیك ، والجأت ظهری الیك ، رغبة ورهبة الیك ، لا ملجا ولا منجا الا الیك ، آمنت بكتابك الذی انزلت وبنبیك الذی ارسلت .)) (بخاری: رقم: ۶۲۱۲، مسلم: رقم: ۲۷۱۰)

''اے اللہ! میں نے تابع کر دیا ہے اپنے نفس کو اور سونپ دیا اپنا معاملہ تجھے اور متوجہ کیا میں نے اپنا چہرہ تیری طرف اور جھکائی اپنی پشت تیری طرف (ثواب میں) رغبت کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے تیرے عذاب سے، نہیں ہے کوئی پناہ گاہ اور نہ جائے نجات مگر تیری ہی بارگاہ، میں ایمان لایا تیری اس کتاب پر جسے تو نے نازل کیا اور تیرے اس نبی پر جسے تو نے ہماری طرف بھیجا۔''

دعا کا مفہوم:

دعا کے معنی کیا ہیں؟ دعا کے معنی پکارنے کے ہیں اور شریعت میں دعا کے معنی ہیں ''سوال کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود خیر کے حصول میں اپنی رغبت اور خواہش کا اظہار کرنا اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے اللہ کے حضور میں تضرع وابتہال کرنا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی امیدوں کی بجا آوری کی توقع اور یقین رکھنا۔''

دعا کو حدیث میں عبادت کا مغز اور جوہر بتایا گیا ہے۔ (ترمذی: رقم ۳۳۸۲) اور ایک

مسلمان کی پوری زندگی جو وہ صبح سے شام تک گزارتا ہے، سراپا عبادت ہے، اس لیے سرکار دو عالم ﷺ نے زندگی کے تمام نشیب و فراز کے لیے اپنی امت کو دعائیں سکھائیں یہاں تک کہ بیت الخلاء میں جانے اور نکلنے کی دعائیں بھی حدیث میں آئی ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے دعا اور کھانے سے فراغت کے بعد دعا، سفر پر روانگی کی دعا اور واپس آنے کی دعا، مسجد میں داخل ہونے کی دعا اور مسجد سے باہر نکلنے کی دعا۔ غرضیکہ ہر موقع کے لیے رسول اللہ ﷺ نے امت کو دعائیں سکھائیں۔ کچھ دعائیں تو نہایت مختصر ہیں اور کچھ ذرا طویل ہیں لیکن ہر دعا فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے اور الفاظ کے مختصر ہونے کے باجوود معانی کا ایک بحر زخار ان میں موجزن ہے اور ساتھ ہی ہر دعا میں عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔ ہر دعا میں انسانی خواہشوں کو الفاظ کا آہنگ عطا کیا گیا ہے۔ لفظی محاسن کے ساتھ ساتھ صوتی اثرات بھی انسانی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض دعاؤں میں مقفّی اور مسجع عبارت بھی ہے جن کی وجہ سے ایک توازن اور آہنگ پیدا ہوتا ہے اور دعا کو یاد کرنے میں زیادہ دقت نہیں اٹھانی پڑتی اور یوں ایک بندۂ عاصی زیادہ دل جمعی اور قلبی توجہ کے ساتھ اپنے رب کے حضور دست دعا دراز کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ان دعاؤں میں فصاحت و بلاغت کی تمام صفات پائی جاتی ہیں اور یہ تمام دعائیں مختلف اقسام کے صنائع بدائع سے بھی مزین ہیں جیسے کہ ایک دعا میں صنعت لفظی اور صفت قلبی دونوں موجود ہیں:

((اللهم انك عفو كريم تحب العفو فاعف عني .))

(نسائی: رقم ۱۲-۷۷، ترمذی: رقم ۳۵۲۴)

"اے اللہ! تو سراپا معاف کرنے والا اور کرم کرنے والا ہے، معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، اس لیے مجھے معاف فرما دے۔"

مسنون دعائیں:

آئندہ صفحات میں سرکار دو عالم ﷺ کی جو دعائیں دی جا رہی ہیں ان میں عربی زبان کے نئے اسالیب، تراکیب و محاورات اور نئی تشبیہات و تعبیرات سب پائی جاتی ہیں۔ ان سے آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کی شان بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ان مسنون دعاؤں میں سے

چند ایک حسب ذیل ہیں:

- نماز وتر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک یہ دعا منقول ہے:

((اللهم اهدني فيمن هديت، وعافني فيمن عافيت، وتولني فيمن توليت، وبارك لي فيما اعطيت، وقني شرما قضيت، فانك تقضي ولا يقضى اليك، فانه لا يذل من واليت، ولا يعز من عاديت، تباركت ربنا وتعاليت، نستغفرك ونتوب اليك، وصلى الله على النبي.)) (ابوداؤد: رقم ۱۴۲۵۔۱۴۲۶، ترمذی: رقم ۴۶۴، نسائی: ۲/ ۲۴۸، دارمی: ۱/ ۳۷۳، المصنف ابن ابی شیبہ: ۲/ ۲۵، ۶/ ۸۸، المصنف عبدالرزاق: ۳/ ۱۱۸، ابن خزیمہ رقم: ۱۰۹۵، مسند ابی یعلی: رقم: ۶۷۶۵، سنن کبریٰ بیہقی: ۲/ ۲۰۹۔۴۹۸، حلیۃ الاولیاء: ۹/ ۳۲۱)

''یعنی اے اللہ! تو مجھے راہ دکھا ان لوگوں کی طرح جن کو تو نے راہ دکھائی، اور مجھ کو عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت دی ہے اور مجھے دوست بنا لے ان لوگوں کا جن کو تو نے دوست بنا لیا ہے اور برکت دے مجھے اس شئے میں جو تو نے مجھے عطا کی ہے اور مجھے اس برائی سے بچا لے جو تو نے مقدر کر رکھی ہے، کیونکہ تو ہی حکم کرتا ہے اور تیرے اوپر حکم نہیں کیا جا سکتا۔ تیرا دوست ذلیل نہیں ہوسکتا اور تیرا دشمن عزیز نہیں ہوسکتا۔ اے ہمارے رب تو برکت والا اور بلند تر ہے۔ تجھ سے بخشش مانگتے ہیں اور تیری طرف رجوع کرتے ہیں اور درود ہو نبی ﷺ کی ذات پر۔''

- نماز جنازہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا پڑھی جس کو سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کی وہ دعا اتنی جامع ہے کہ راوی حدیث سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کاش میں اس میت کی جگہ ہوتا اور حضور ﷺ مجھ پر یہ دعا پڑھتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اللهم اغفرله، وارحمه، وعافه، واعف عنه، واكرم نزله،

ووسع مدخله، واغسله بالماء والثلج والبرد، ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الابيض من الدنس، وابدله دارا خيرا من داره، اهلا خيرا من اهله، وزوجا خيرا من زوجه، وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار .))

''یعنی اے اللہ! تو اس کو بخش دے اور اس پر رحم فرما دے اور اس کو آرام سے رکھ اور اس سے درگزر فرما اور اس کو عزت سے مہمان بنا اور اس کی جگہ یعنی قبر کو وسیع بنا دے اور اس کو پانی، برف اور اولوں سے دھو دے اور اس کو گناہوں سے پاک کر دے جس طرح تو سفید کپڑے کو میل کچیل سے صاف کر دیتا ہے اور اس کو اس گھر سے بہتر گھر عطا فرما، اس اہل سے بہتر اہل عطا فرما اور اس بیوی سے بہتر بیوی عطا فرما اور اس کو جنت میں داخل فرما اور اس کو قبر کے عذاب سے محفوظ فرما اور اس کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔'' (مسلم: ۱/ ۳۱۱، نسائی: ۱/ ۲۸۱، ابن ماجہ: ص ۱۰۷، ابن حبان: ۷/ ۳۴۴، معجم کبیر طبرانی: ۱۸/ ۴۴، سنن کبری بیہقی: ۴/ ۴۰، المصنف لابن ابی شیبہ: ۱/ ۴۷۸، ۶/ ۹۷، شرح السنہ رقم: ۱۴۹۵)

- ((اللهم اغفرلي ما قدمت، وما اخرت، وما اسررت، وما اعلنت، وما اسرفت، وما انت اعلم به مني، انت المقدم، وانت المؤخر، لا اله الا انت .)) (مسلم: رقم ۷۷۱)

''اے اللہ! تو مجھے معاف کر دے جو کچھ میں نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا، جو کچھ میں نے چھپ کر کیا اور جو کچھ میں نے سرعام کیا، جو میں نے زیادتی کی اور جسے تو زیادہ جانتا ہے مجھ سے بھی، تو ہی آگے کرنے والا ہے۔ (طاعات میں) اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے ان سے، نہیں ہے کوئی معبود مگر تو۔''

- ((اللهم اعني على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك .))

''اے اللہ! تو میری مدد فرما اپنی یاد پر اور اپنے شکر پر اور اچھے طریقے سے اپنی عبادت بجا لانے پر۔'' (ابوداؤد: رقم ۱۵۲۲، نسائی: رقم ۱۳۰۴)

♦ ((اللهم انی اسئلك یا الله بانك الواحد الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد، ولم یکن له كفوا احدا، ان تغفرلی ذنوبی، انك انت الغفور الرحیم.))

”اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اے اللہ! اس لیے کہ تو واحد ہے، یکتا ہے، ایسا بے نیاز ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور نہ اس کا کوئی ہم پلہ ہے، (میں سوال کرتا ہوں) کہ تو بخش دے میرے گناہ، یقیناً تو بہت زیادہ بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔“ (نسائی: رقم ۱۳۰۲، مسند احمد: ۲۳۸)

♦ ((لا الــه الا الــلــه وحده لا شریك لـه، لـه الملك ولـه الحمد، وهو علی كل شئی قدیر، اللهم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت، ولا ینفع ذالجد منك الجد.))

”نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے وہ اکیلا ہے، نہیں ہے کوئی شریک اس کا، اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے لیے سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ اے اللہ! نہیں ہے کوئی روکنے والا اس چیز کو جو تو عطا کرے اور نہیں ہے کوئی دینے والا جس چیز کو تو روک لے اور نہیں فائدہ دے سکتی کسی صاحب حیثیت کو تیرے ہاں اس کی حیثیت۔“ (بخاری: رقم ۸۴۴، مسلم: رقم ۵۹۳)

♦ ((استودع الله دینك وامانتك وخواتیم عملك.))

”میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں تمھارا دین، تمھاری امانت اور تمھارے آخری اعمال۔“ (ابن ماجہ: رقم ۲۸۲۶)

♦ ((اللهم لا سهل الا ما جعلته سهلا، وانت تجعل الحزن اذا شئت سهلا.)) (الاذکار للنووی: ص ۱۲۳)

”اے اللہ کوئی آسانی نہیں مگر جس کو تو آسانی بنا دے اور جب تو چاہے تو مشکل کو آسان کر دے۔“

♦ ((اللهم بك اصبحنا وبك امسینا، وبك نحیا، وبك

نموت واليك المصير .))

''اے اللہ! تیری ہی حفاظت میں ہم نے صبح کی اور تیری ہی حفاظت میں شام کی اور تیرے ہی نام پر ہم زندہ ہوتے اور تیرے ہی نام پر ہم مرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔'' (ترمذی: رقم ۳۴۰۲، ابوداؤد: رقم: ۵۰۶۸)

♦ ((بسم الله الذی لا یضر مع اسمه شئی فی الارض ولا فی السماء وهو السمیع العلیم .))

(ابوداؤد: رقم ۵۰۸۸، ترمذی: رقم ۲۳۸۸، مسند احمد: ۱/۶۲، ابن ماجہ: ۲/۳۲۲)

''اس اللہ کے نام کے ساتھ جس کے نام کی برکت سے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، زمین کی ہو یا آسمانوں کی اور وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔''

♦ ((یا حی یا قیوم برحمتك استغیث ، اصلح لی شانی کله ، ولا تکلنی الی نفسی طرفة عین .))

''اے زندہ جاوید! اے کائنات کے نگران! میں تیری ہی رحمت کے ذریعے سے فریاد کرتا ہوں تو سنوار دے میرا ہر کام اور نہ سپرد کر مجھے میرے اپنے نفس کے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی۔'' (مستدرک حاکم: ۱/۵۴۵، ترغیب وترہیب: ۱/۲۷۲)

♦ ((اللهم انی اسئالك فعل الخیرات ، وترك المنکرات ، وحب المساکین وان تغفرلی ، وترحمنی واذا اردت فتنة قوم فتوفنی غیر مفتون ، واسئالك حبك وحب من یحبك وحب عمل یقربنی الی حبك .))

''یعنی اے اللہ! میں تجھ سے توفیق چاہتا ہوں نیکیوں کے کرنے کی اور برائیوں کے چھوڑنے کی اور غریبوں کی محبت کی اور یہ کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کرے اور جب تو کسی جماعت پر بلا نازل کرنے کا ارادہ کرے تو مجھے اٹھا لینا پہلے اس کے کہ میں اس بلا میں پڑوں اور میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی محبت بھی جو تجھ سے محبت رکھتا ہے اور اس عمل کی محبت بھی جو تیری محبت سے قریب کر

دے۔" (مسند امام احمد: ۵/۲۴۳، ترمذی: ۵/۳۶۹، مستدرک حاکم: ۱/۵۲۱)

♦ ((اللھم انی اعوذبك من جھد البلاء، ودرك الشقاء، وسوء القضاء، وشماتة الاعداء.))

"اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں بلا کی سختیوں سے اور بدقسمتی کے حصول سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے طعنہ سے۔" (بخاری: ۷/۱۵۵، مسلم: ۴/۲۰۸۰)

♦ ((اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرة.)) (مسند امام احمد: ۴/۱۸۱، مجمع الزوائد: ۱۰/۱۷۸)

"اے اللہ! ہمارا انجام تمام کاموں میں اچھا کر دے اور ہمیں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچا۔"

♦ ((رب اعنی ولا تعن علی، وانصرنی ولا تنصر علی، وامکر لی ولا تمکر علی، واھدنی ویسر الھدی الی، وانصرنی علی من بغی علی، رب اجعلنی لك شکارا، لك ذکارا، لك رھابا، لك مطواعا، الیك مخبتا اواھا منیبا، رب تقبل توبتی، واغسل حوبتی، واجب دعوتی، وثبت حجتی واھد قلبی، وسدد لسانی، وَاسْلُلْ سخیمة قلبی.))

"اے میرے رب! میری مدد فرما اور میری مخالفت میں کسی کی مدد مت فرما اور مجھے فتح دے اور کسی کو میرے اوپر غالب نہ کر اور میرے حق میں تدبیر کر اور میرے مقابلہ میں کسی کی تدبیر نہ چلا اور مجھے ہدایت کر اور میرے لیے ہدایت کو آسان کر دے اور مجھے مدد دے اس پر جو مجھ پر زیادتی کرے۔ اے میرے رب! مجھے ایسا کر دے کہ میں تجھے بہت یاد کروں، تیرا بہت شکر ادا کروں، تجھ سے بہت ڈرا کروں، تیری بہت فرمان برداری کروں، تیرا بہت مطیع رہوں، تجھی سے سکون پانے والا بنوں، تیری طرف متوجہ اور رجوع ہونے والا رہوں۔ اے میرے پروردگار! میری توبہ قبول کر اور میرے گناہ دھو دے اور میری دعا قبول کر

اور میری حجت قائم رکھ اور میری زبان درست رکھ اور میرے دل کو ہدایت پر رکھ اور میرے دل کی کدورت کو نکال دے۔''

(ابوداؤد:۲/۸۳، ترمذی:۵/۵۵۴، ابن ماجہ:۲/۱۲۵۹، مسند احمد:۱/۱۲۷)

♦ ((اللهم اقسم لنا من خشيتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك ومن طاعتك ما تبلغنا به جنتك ، ومن اليقين ما تهون به علينا ، مصائب الدنيا ، اللهم متعنا باسماعنا ، وابصارنا ، وقواتنا ما احييتنا ، واجعله الوارث منا ، واجعل ثارنا على من ظلمنا ، وانصرنا على من عادانا ولا تجعل مصيبتنا في ديننا ، ولا تجعل الدنيا اكبر همنا ، ولا مبلغ علمنا ، ولا تسلط علينا من لا يرحمنا .))

(ترمذی:۵/۵۲۸، مستدرک حاکم:۱/۲۵۸، ابن السنی: رقم ۴۴۶)

''اے اللہ! ہمیں اپنی خشیت سے اتنا حصہ دے کہ ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی اطاعت سے اتنا حصہ دے کہ تو ہمیں اس کے ذریعے سے اپنی جنت میں پہنچا دے اور یقین سے اتنا حصہ دے کہ اس سے تو ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان کر دے اور کام کرنے والی رکھ ہماری سماعتیں اور ہماری بینائیاں اور ہماری قوت کو جب تک تو ہمیں زندہ رکھے اور اس کی خیر کو ہمارے بعد باقی رکھنا اور ہمارا انتقام اس سے لے جو ہم پر ظلم کرے اور ہمیں اس پر غلبہ دے جو ہم سے دشمنی رکھے اور ہمارے دین میں ہمارے لیے مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا مقصود اعظم نہ بنا اور نہ ہماری معلومات کی انتہا اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود اور ہم پر ایسے حاکم کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے۔''

♦ ((اللّٰهم احفظني بالاسلام قائما ، واحفظني بالاسلام قاعدا ، واحفظني بالاسلام راقدا ، ولا تشمت بي عدوا ولا حاسدا ، اللّٰهم انى اسألك من كل خير خزائنه بيدك ،

واعوذبك من كل شر خزائينه بيدك .))

(مستدرک حاکم:۱/۵۲۵، وصححہ ووافقہ الذہبی)

''اے اللہ! مجھے اسلام کے ساتھ قائم رکھ، کھڑے ہوئے اور اسلام کے ساتھ قائم رکھ بیٹھے ہوئے، اور اسلام کے ساتھ قائم رکھ لیٹے ہوئے اور مجھ پر طعنہ کا موقع نہ دے نہ کسی دشمن کو اور نہ کسی حاسد کو۔ اے اللہ! میں تجھ سے سب بھلائیاں مانگتا ہوں جن کے خزانے تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں اور پناہ مانگتا ہوں اور ان تمام شرور سے جن کے خزانے تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔''

◆ ((اللهم اجعل اوسع رزقك على عند كبر سني ، وانقطاع عمري .)) (مستدرک حاکم:۱/۵۴۲)

''اے اللہ! میرا رزق خوب فراخ کر دینا میرے بڑھاپے میں اور میری عمر کے ختم ہونے کے وقت۔''

◆ ((اللهم زدنا ولا تنقصنا ، واكرمنا ولا تهنا ، واعطنا ولا تحرمنا ، واثرنا ولا توثر علينا ، وارضنا وارض عنا .))

(ترمذی:۵/۳۲۶، رقم ۳۱۷۳، حاکم:۱/ ۹۸، جامع الاصول:۱۱/۲۸۲، رقم:۸۸۴۷)

''اے اللہ! ہمیں بڑھا اور ہمیں مت گھٹا اور ہمیں عزت و آبرو دے اور ہمیں ذلیل وخوار نہ کر، ہمیں عطا کر اور ہمیں محروم نہ رکھ اور ہمیں بڑھائے رکھ اور دوسروں کو ہم پر نہ بڑھا اور ہمیں خوش رکھ اور ہم سے خوش رہ۔''

◆ ((اللهم انى عبدك ابن عبدك ، ابن امتك ، ناصيتي بيدك ، ماض في حكمك ، عدل في قضاؤك ، اسئالك بكل اسم هو لك سميت به نفسك ، او انزلته في كتابك ، او علمته احداً من خلقك ، او استاثرت به في علم الغيب عندك ، ان تجعل القرآن ربيع قلبي ، ونور صدري ، وجلاء حزني وذهاب همي .)) (مسند احمد:۱/۳۹۱، ۴۵۲، مستدرک حاکم:۱/۵۰۹، الکلم الطیب، ص:۷۳)

”اے اللہ یقیناً میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے ہی بندے اور تیری ہی کنیز کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، مجھ میں تیرا ہی حکم جاری وساری ہے اور میرے بارے میں تیرا ہی فیصلہ مبنی بر انصاف ہے۔ میں تیرے اس خاص نام کے وسیلے سے تجھ سے درخواست کرتا ہوں، جو تو نے خود رکھا ہے اس کے ساتھ اپنا، یا نازل فرمایا ہے اسے اپنی کتاب میں یا سکھایا ہے تو نے اسے کسی کو اپنی مخلوق میں سے یا خاص کیا ہے تو نے اس کو علم غیب میں اپنے پاس (رکھنے کو) میں درخواست کرتا ہوں کہ تو بنا دے قرآن حکیم کو بہار میرے دل کی اور نور میرے سینے کا اور علاج میرے غموں کا اور تریاق میری کثرت فقر کا۔“

♦ ((اللهم مصرف القلوب صرف قلوبنا على طاعتك))

”اے اللہ! دلوں کے پھیرنے والے، ہمارے دل اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔“ (مسلم:۳/ ۲۰۴۵)

♦ ((اللهم اغفرلي ذنبي ، ووسع لي في داري ، وبارك لي في رزقي .)) (مسند احمد:۴/ ۶۳، ۵/ ۳۷۵)

”اے اللہ! میرے گناہوں معاف فرما، میرے گھر میں وسعت فرما اور میرے رزق میں برکت فرما۔“

♦ ((اللهم اني اعوذبك من قلب لا يخشع ، ومن دعاء لا يسمع ، ومن نفس لا تشبع ، ومن علم لا ينفع ، اعوذبك من هولاء الاربع .))

”اے اللہ! میں ایسے دل سے پناہ مانگتا ہوں جو تجھ سے نہ ڈرے اور ایسی دعا سے جو نہ سنی جائے (یعنی مستجاب نہ ہو) اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسے علم سے جو نفع نہ دے۔ میں ان چاروں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

♦ ((اللهم انا نسئالك موجبات رحمتك ، وعزائم مغفرتك ، والسلامة من كل اثم ، والغنيمة من كل بر ،

والفوز بالجنة ، والنجاة من النار .))

''اے اللہ! ہم تجھ سے تیری رحمت کے موجبات اور تیری رحمت کے اسباب کا سوال کرتے ہیں اور ہر گناہ سے بچاؤ اور نیکی کی لوٹ اور جنت کی کامیابی اور جہنم سے نجات کے طلب گار ہیں۔'' (مستدرک حاکم:۱/ ۵۲۵، الاذکار: ص ۲۴۰)

♦ ((اللهم انی ظلمت نفسی ظلما كثيرا ولا يغفر الذنوب الا انت ، فاغفر لی مغفرة من عندك وارحمنی انك انت الغفور الرحيم .)) (بخاری:۱/۳۰۲، مسلم:۴/ ۲۰۷۸)

''اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا اور میرے گناہوں کو بخشنے والا تیرے سوا اور کوئی نہیں، اپنی مغفرت سے میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھ پر رحم فرما، بے شک تو گناہوں کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

یہ صرف چند مسنون دعائیں ہیں ورنہ ایسی دعاؤں سے حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں جن سے آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کا پتہ چلتا ہے:

رب صل وسلم دائما ابدا
علی حبيبك خير الخلق كلهم